زرد پتوں کا بھنور

سیما غزل

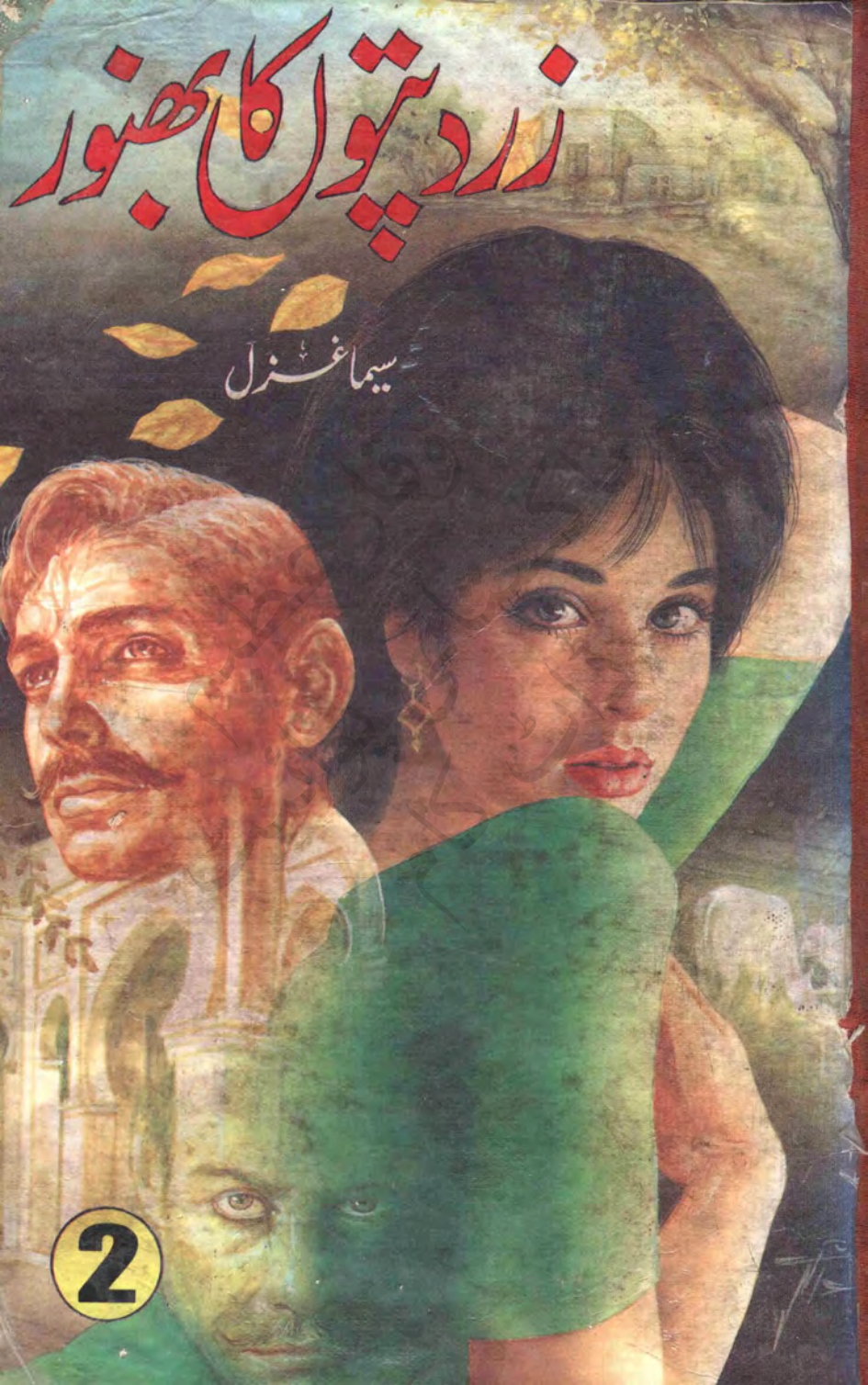

2

اس کے لہجے میں اتنا یقین تھا کہ میرا دل دھڑک اٹھا۔ مجھے اعتبار آگیا کہ بس ابھی کاوا آنے ہی والا ہے۔ یوں جیسے وہ کچھ دیر پہلے ہی کہہ کر گیا ہو کہ تُو تیار ہو میں آتا ہوں' میں شرما کر رہ گئی۔ مجھے وہ دن یاد آگیا جب وہ پہلی بار میرے لئے سوٹ لے کر آیا تھا اور جب میں نے وہ جوڑا پہنا تھا تو اس کی آنکھوں میں کیسی عجیب سی چمک اتر آئی تھی۔ اس نے کہا تھا زمانوں بعد میں نے اس گھر میں رنگ اترتے دیکھے ہیں ورنہ یہاں تو رنگ جیسے تھے ہی نہیں۔ یہ خیال آتے ہی کہ کاوا آنے والا ہے' میں شادو کے ہاتھ سے وہ گلابی ریشمی جوڑا لے کر غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ شادو کھانا بنانے لگی۔ اس نے کھانے پر بڑا اہتمام کیا ہوا تھا۔ وہ خود بازار جا کر لوکی' بھنڈی اور مرغی لائی تھی۔ اس نے مرغی اور لوکی کا سالن بنا لیا تھا۔ بھنڈی مسالہ بھر کر بھون لی تھی۔ اب وہ آٹا گوندھنے بیٹھ رہی تھی۔ میں نہا کر نکلی تو وہ آٹا گوندھ چکی تھی۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور جھٹ میری بلائیں لے لیں۔

"ٹھہرو ذرا نظر اتار دوں۔" وہ لپک کر مرچیں لے آئی۔ اس وقت مجھے بہت شرم آئی۔

"کیا کرتی ہے شادو۔ کچھ نہیں ہوتا اور ..... میں کون سی ایسی ہوں کہ نظر لگے گی۔"

"ارے تجھے کیا پتا .....! شیشے میں دیکھ ذرا' اور کاوے کی نظر بہت بری ہے۔" وہ ہنس کر بولی۔

اس نے میرے منع کرنے کے باوجود مرچیں اتاریں اور چولہے میں ڈال آئی پھر اس نے میرے لمبے بالوں کو تیل لگا کر کس کے چٹیا باندھ دی۔ بہت دنوں کے بعد کسی نے میرے سر میں تیل ڈال کر چٹیا باندھی تھی۔ میں نے بال کاڑھ کر شیشے میں دیکھا۔ اس نے

بڑی صفائی سے مانگ نکالی تھی۔ میں شیشہ دیکھ رہی تھی کہ وہ سرمہ دانی اٹھالائی۔ اس نے زبردستی سرمہ لگا دیا۔ اپنے آپ کو ایسا بنا سنورا دیکھ کر مجھے بہت شرم آ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہیں جا کر چھپ کے بیٹھ جاؤں۔

اب دن کی سفیدی سرمئی ہونے لگی تھی۔ سورج آسمان کے کنارے پہنچ گیا تھا۔ شادو نے بچوں کو تیار کر کے باہر بھیج دیا تھا۔ وہ انہیں تیار کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”ابھی ماما آئے گا' گڑ کے لڈو بھی لائے گا' اگر تم لوگ مجھے تنگ کرو گے تو میں کسی کو بھی نہیں دو گی؟“

”اماں! میں تو تنگ نہیں کرتی ناں۔“ سب سے چھوٹی بیٹی نے کہا تو میں نے اسے گود میں اٹھالیا۔

”ہاں میری گڈو تو بہت اچھی ہے۔ کسی کو بھی تنگ نہیں کرتی۔“ میں نے اسے پیار کر کے کہا۔

”اور تم تو تنگ کرتی ہو ماما کو۔“ وہ پلٹ کر بولی تو یوں لگا جیسے کسی نے دل میں پھانس چبھو دی ہو۔

”ہاں اسے تو میں لڈو نہیں دوں گی۔“ شادو نے ہنس کر کہا۔

میں بھی ہنس پڑی مگر دل میں چبھی پھانس جیسے اور اندر تک چلی گئی تھی۔ ایک ٹیس سی اٹھی اور میں گڈو کو اتار کر کمرے میں چلی آئی۔ وہاں اندھیرا تھا۔ آنکھ میں آئے آنسو صاف کر کے میں نے لالٹین اٹھالی۔ اس کی چمنی کالی ہو رہی تھی۔ میں باہر آ کر کپڑے کے ٹکڑے سے چمنی صاف کرنے لگی۔ میں چاہتی تھی کہ جب کادا آئے تو گھر میں بہت روشنی ہو' اتنی کہ میں اسے خوب دیکھ سکوں۔ اس کی آنکھوں میں تیرتا پیار بھی مجھے صاف نظر آ جائے اور ..... اسے میری آنکھوں میں سب دکھائی دے۔ سارے جذبے' سرمہ' کپڑوں کا گلابی رنگ' ماتھے سے نکلی ہوئی' دور تک چمکتی مانگ' تیل سے چمکتے ہوئے بال' سب کچھ' کوئی تشنگی نہ رہے۔ کوئی بے قراری نہ بچے۔ میں لالٹین کی چمنی رگڑتی رہی اور وہ چمکتی رہی۔

”بس کر زینو! اب تو یہ ٹوٹ جائے گی۔“ شادو جانے کب میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”لا مجھے دے۔ میں بتی بال دوں۔“ میں نے

لالٹین اس کی طرف بڑھا دی اور اپنے ہاتھ دھونے لگی جو جگہ جگہ سے کالے ہو چکے تھے۔

اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ شادو نے بتی جلا کر چھپر تلے لوہے کے کنڈے میں اٹکا دی۔ لالٹین کے بالکل نیچے کا فرش سیاہ ہو گیا۔ اس کا سایہ گہرا سیاہ تھا مگر پورے آنگن میں روشنی بکھر گئی۔ بچے باہر جا چکے تھے۔ شادو کھانا تیار کر چکی تھی۔ وہ خود بھی تیار ہو گئی تھی۔ اس نے بال کاڑھے اور سفید براق دوپٹا اوڑھ لیا۔

”دیکھ میں اس میں کیسی لگتی ہوں؟“ اس نے نیلے رنگ کے پھولوں والا سوٹ پہنا ہوا تھا۔

نہ معلوم کیوں وہ سفید دوپٹا مجھے اچھا نہیں لگا۔ ”نیلا رنگ اچھا ہے شادو۔ یہ سفید رنگ نہ پہن۔“

”لو ..... مجھے تو یہ بہت اچھا لگتا ہے۔“ اس نے دوپٹے پر بنی بیل پر ہاتھ پھیرا۔ ”یہ بیل میں نے خود کاڑھی تھی۔“

”اچھی ہے پر تجھے تو سفید نہیں پہننا چاہئے۔“

لمحہ بھر کو اس کی آنکھوں میں گہرا خوف اتر گیا۔ اس نے آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک اٹھا۔ ایک انجانا سا خوف مجھے بھی اپنے اندر اترتا محسوس ہوا' مگر صرف لمحہ بھر کو۔ دوسرے لمحے وہ بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ”ٹھیک کہتی ہے تو ..... کادے کی ماں کو تو سفید رنگ بہت برا لگتا تھا۔ رنگ تو یہ اچھا ہے پر برادری والے پہننے نہیں دیتے۔ میری ساس دیکھ لیتی تو کھڑے کھڑے آگ لگا دیتی۔“ وہ دوپٹا اتار کر تہہ کرتے ہوئے بولی۔ اس نے نیلے رنگ کی سادی چادر اوڑھ لی۔

وقت کافی گزر چکا تھا۔ اس کا احساس میرے علاوہ شادید شادو کو بھی تھا مگر ہم آپس میں وقت گزرنے کی بات کرنے سے کترا رہے تھے۔ باقی دنیا جہاں کی باتیں کر رہے تھے۔ فضول سی بے بنیاد باتیں' بے سروپا باتیں یوں جیسے ایک دوسرے کو بہلا رہے ہوں' پھر اچانک ہم دونوں خاموش ہو گئے' ہمارے پاس کرنے کو کوئی بات ہی نہ رہی۔ میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ میں شادو سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اسے اس وقت کادے اور بابا کے آ جانے کا یقین کیوں تھا۔ اس نے جس اعتماد سے مجھے گلابی جوڑا پہنایا تھا سر میں تیل ڈال کر

میری چٹیا بنائی تھی' اس سے لگتا تھا کہ واقعی کادا اور بابا آنے والے ہیں مگر کملا اور پھوپا سویرے کے نکلے ہوئے تھے شام ڈھل چکی تھی۔ شادو کے بچے باہر کھیل کھیل کر تھک چکے تھے۔ ان کی آنکھیں بوجھل ہو چکی تھیں۔ ان سب کو بھوک لگی ہوئی تھی اور اب تک گلی سنسان تھی' کسی کے آنے کی آہٹ یا قدموں کی چاپ نہ تھی۔ بچوں نے یہاں وہاں پڑنا شروع کیا تو شادو نے سب کو اٹھا کر کھانا دیا۔ چھوٹی کو تو وہ جھنجوڑ جھنجوڑ کر نوالے دے رہی تھی ورنہ وہ منہ میں نوالہ رکھتی اور گردن ایک طرف کو ڈال کر سونے لگتی تھی میں آنگن میں پڑی چارپائی پر بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ بچے ایک ایک کر کے سوتے گئے۔ گھر میں بھی گہرا سناٹا اتر آیا۔ شادو بچوں کو اندر لٹا کر' لٹی لٹی سی' خالی ہاتھ اور خالی آنکھیں لئے میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"شادو!" میری آواز جیسے پورے آنگن میں گونج گئی۔

"ہوں.....!" وہ چونک اٹھی۔

"اتنی رات ہو گئی۔"

"ہاں!" اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔

"تم نے کہا تھا کہ....."

"وہ آئیں گے زینو! انہیں آنا پڑے گا۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "فضلو لاری میں گیا ہے۔ جلدی پہنچا ہو گا۔ شاید وہ لوگ سعید پور چلے گئے ہوں۔"

"ہاں شاید....." میں نے گہرا سانس لیا اور نڈھال سی منجھی پر لیٹ گئی۔

مجھے صرف ایک فکر تھی کہ کہیں کادا اور بابا چوہدری نیاز کے آدمیوں کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔ وہ لوگ جب ماجے کو پکڑ سکتے تھے' دینو کو تلاش کر سکتے تھے' اسے اٹھا کر لے جا سکتے تھے تو کیا انہوں نے کادے کا پیچھا نہیں کیا ہو گا! کیا ماجے نے انہیں کادے کے بارے میں نہیں بتایا ہو گا۔ جب وہ لوگ جان سکتے ہیں کہ میں فرار ہو گئی اور مجھے فرار کرانے والا ماجا تھا تو کیا انہیں پتا نہ چلا ہو گا کہ میں کادے اور بابا کے ساتھ تھی۔ یہ سوالات تھے جو کسی سانپ کی طرح میرے دماغ میں سرسرا رہے تھے اور میں ان کی خیریت کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

شادو بھی گہری سوچ میں ایک طرف بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس

کے چہرے پر اس کی چادر کا سایہ تھا اس لئے میں جان نہ سکی کہ اس کے چہرے پر کیا ہے' خوف ناامیدی یا امید۔ سناٹا بہت گہرا ہو چکا تھا۔ لالٹین کی روشنی میری وحشت بڑھا رہی تھی اور جب ہوا کا تیز جھونکا آتا اور لالٹین کو ہلا جاتا تو آنگن کے فرش پر جیسے بھوت اتر آتے تھے۔ لالٹین کا سایہ یوں چکراتا' روشنی یوں ہلتی جیسے پورا گھر ہل رہا ہو یا جیسے آندھی آ گئی ہو۔ طوفان آ گیا ہو' میرا دل ہولنے لگتا' میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ابھی تک شادو نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ دروازے میں پڑا ٹاٹ کا پردہ ہوا سے ہل رہا تھا۔ اچانک' بالکل اچانک پوری گلی میں روشنی پھیل گئی۔ میں اور شادو دونوں چونک اٹھے۔ گلی کے ساتھ ہی پردہ بھی روشن ہو گیا تھا پھر دوسرے ہی لمحے گاڑی کے انجن کی آواز نے سناٹے کو چیر کر رکھ دیا۔ میں اور شادو دونوں باہر کی طرف لپکے۔ پردہ ہٹاتے ہی میری نگاہ دروازے سے کچھ دور کھڑی جیپ پر پڑی' اسی وقت ایک شخص جیپ میں سے کودا اور بھاری قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب آ گیا۔ میں حیرت سے چیخ اٹھی۔

وہ چوہدری فیاض تھا۔ میں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اسے یہاں کا کیسے پتا چلا۔ شادو کبھی اسے اور کبھی مجھے دیکھ رہی تھی۔

"اے.....کون ہے توں؟" اس نے چوہدری فیاض کے چہرے کے سامنے انگلی نچائی۔ گھر کے اندر کی روشنی اس کے شفیق چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر نرم سی مسکراہٹ تھی۔

"یہ.....یہ.....شادو.....یہ چوہدری فیاض ہیں۔ چوہدری نیاز کے وڈے بھا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"ادھر.....باہر والی منجی پر بیٹھ جاؤ۔" شادو نے نرم پڑتے ہوئے کہا پھر چونک کر مجھے دیکھا۔ "یہ چوہدری نیاز کا بھا ہے؟ اس چوہدری نیاز کا جس نے تجھے کلا کر دیا۔ جس نے تیری ماں کو..... اور اس کا بھا تو میرے کادے کے پیچھے بھی پڑا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ چوہدری فیاض کی طرف پلٹی۔ وہ سخت غصے میں تھی۔ "کیوں آیا ہے رے تُو! تیرا کیا کام ہے ہم گریبوں سے؟ اور یاد رکھ.....اگر میرے کادے کو کچھ ہو گیا نا تو تیری نوں کی کوکھ جلا دوں گی۔ سارے گاؤں کو جلا کر راکھ کر دوں گی۔ سمجھا تُو؟" وہ غصے سے بولے جا رہی تھی۔ میں اسے چپ کرانے کی کوشش میں ہاتھ آگے بڑھاتی یا کچھ بولنے کی کوشش

کرتی تو وہ مجھے جھڑک دیتی تھی۔ ”ایسا ہی مرد کا بچہ ہے تو گھر میں مرد آنے دے‘ ہم زنانیوں کو دھمکانے آیا ہے کیا؟“

”شادو.....چپ کر جا۔“ میں ایک دم چیخ اٹھی۔ چوہدری فیاض اب بھی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ضرور تھی پر اس کی آنکھوں میں دکھ صاف نظر آرہا تھا۔

”تُو چپ کر زینو! میں ان چوہدریوں سے ڈرنے والی نہیں .....“ وہ آستین چڑھاتے ہوئے بولی۔

”اوشادو.....تجھے رب دا واسطہ! میری بات تو سن - یہ چنگے آدمی ہیں۔ یہ چوہدری نیاز جیسے نہیں ہیں۔ یہ تو..... یہ تو میری مدد کرنا چاہتے ہیں۔“

”ہیں.....؟“ وہ ہونقوں کی طرف دیکھنے لگی۔ ”یہ تو چوہدری نیاز کے وڈے بھا ہیں نا؟“

”ہاں ہیں پر..... یہ ویسے نہیں ہیں۔“ میں جھنجلا گئی۔

”اچھا.....پر زینو پُتر! پھوپا نہیں ہے وہ.....“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم باہر گاڑی میں ان کا انتظار کریں گے۔ میں تو یہ دیکھنے آیا تھا کہ.....زینو ٹھیک تو ہے.....“ اتنا کہہ کر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ”زینو! میں تمہارے لیے پریشان ہو گیا تھا۔ وہ.....کون تھا جس نے.....“

”کیا آپ اسے نہیں جانتے؟“ میں نے ان کی بات کاٹ دی۔

”کیا مطلب؟ کیا میں اسے جانتا ہوں؟“ وہ حیرت زدہ ہو کر بولے۔

”وہ.....عبدالقادر تھا۔“

”کیا؟“ وہ چونک اٹھے۔ ”عبدالقادر؟“

”جی!“ میں نے دھیرے سے کہا۔ میں جانتی تھی کہ یہ سن کر انھیں حیرت ہو گی کیونکہ عبدالقادر وہ شخص تھا جو بچپن سے انھی کی حویلی میں پلا بڑھا تھا۔ اس کا باپ بڑے زمیندار کا خاص ملازم تھا اور بے حد نیک دل شخص تھا۔ عبدالقادر کو بڑے زمیندار نے اپنے بچوں کی طرح پالا تھا۔ وہ بچپن میں چوہدری‘ نیاز اور چوہدری فیاض کے ساتھ کھیل کود کر بڑا ہوا تھا۔ یہ سب باتیں مجھے بابا سے پتا چلی تھیں۔ بابا جان گئے تھے کہ چوہدری نیاز

عبدالقادر سے غیر قانونی کام کراتا ہے۔ چوہدری فیاض تو شہر آگئے تھے مگر عبدالقادر چوہدری نیاز کے پاس ہی رہ گیا تھا۔ وہ کبھی کبھی چوہدری فیاض کے پاس آجاتا تھا۔ مگر مجھے یقین تھا کہ چوہدری فیاض اس کے اس گھناؤنے روپ سے ناواقف ہو گا۔

”آپ منجھی پر بیٹھ جاؤ جی!“ شادو اب سمجھ چکی تھی کہ چوہدری فیاض سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔

وہ باہر پڑی منجھی پر بیٹھ گیا۔ میں وہیں دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی پھر میں نے اسے عبدالقادر کی حرکتوں کے بارے میں بتایا۔ اسے یہ بھی بتایا کہ بڑے زمیندار کا قاتل میرا بابا نہیں تھا۔ اسے چوہدری نیاز نے پھنسوایا تھا اور وہ بھاگتے میں نہیں مارا گیا تھا بلکہ اس پر اتنا ظلم توڑا گیا تھا کہ وہ مر گیا۔ میں نے اپنے اور اماں کے بارے میں بھی اسے سب کچھ بتا دیا اور جب میں نے اسے بتایا کہ اس نے مجھے اور اماں کو قید کر دیا تھا۔ اماں بیمار تھی اور سونیا نے اسے دوا نہ منگا کر دی۔ وہ ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر مر گئی تو اسے بہت افسوس ہوا۔ لالٹین کی ہلکی سی روشنی میں بھی اس کا چہرہ سرخ ہوتا محسوس ہوا۔

”ماں جی کے انتقال پر جب میں وہاں گیا تو تم وہاں نہیں تھیں۔“

اس کی یہ بات سن کر میں چونک اٹھی۔ اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ مجھے اپنی اماں کا قاتل سمجھ رہا ہے تب میں نے اسے اس رات کا قصہ بھی بتا دیا جب میں نے وہ حویلی چھوڑی تھی۔ ”چوہدری جی! بڑی زمیندارنی کا دیا ہوا زیور میرے پاس امانت ہے۔ وہ اس وقت میرے پاس نہیں‘ کادے اور بابا کے پاس ہے پر میں جانتی ہوں کہ انھوں نے اسے بہت سنبھال کر رکھا ہو گا۔ اگر وہ میرے پاس ہوتا تو میں ابھی آپ کو واپس کر دیتی۔ میں.....میں اپنی آنکھوں کے سامنے بڑی زمیندارنی کو قتل ہوتے دیکھ چکی تھی بس یہ میرا جرم ہے۔ چوہدری نیاز سمجھتا تھا کہ میں بھی اماں کی طرح بڑے زمیندار کے قاتل کو جانتی ہوں۔ پر جی اماں نے تو مجھے کچھ بتایا ہی نہیں تھا بس ایک روز اس نے تھانے میں کہا تھا کہ وہ اصل قاتل کو جانتی ہے اور یہ سن کر ہی چوہدری نیاز اور سونیا آکر ہمیں حویلی میں لے گئے تھے۔ ہماری زندگی تو بس دو وقت کی روٹی ہوتی ہے چوہدری جی کہ زندہ ہوں تو یہ پیٹ تنگ کرتا ہے‘ ہم بھلا بڑے زمیندار یا بڑی زمیندارنی کو کیوں مارتے؟ وہ تو ہمارے ماں اور باپ تھے.....ہمارا سہارا تھے جی۔“ میں رو رہی

تھی اور ..... اور وہ بھی رو رہا تھا۔ وہ یہ سن کر کھڑا ہو گیا تھا کہ بڑی زمینداری کو مارنے والی سونیا ہے۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ وہ بہت غصے میں ہے۔

"بس کر زینو..... میں نے بہت برداشت کر لیا۔ اب میں نیاز اور اس کی بیوی کو نہیں چھوڑوں گا۔ میں گاؤں کے لوگوں کو اس کے ظلم سے نجات دلا دوں گا۔ جیل میں سڑا دوں گا۔" وہ غصے سے بولا۔

"چوہدری جی! اس نے ماجے اور دینو کو بھی قید کر رکھا ہے۔ پتا نہیں بے چارے زندہ بھی ہیں کہ نہیں۔"

"تو فکر نہ کر..... بس جتنا دکھ تجھے دیکھنا تھا' تو نے دیکھ لیا۔ اب میں سب ٹھیک کر لوں گا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تمہارا پھوپا کب آئے گا؟" اس نے پوچھا۔

تب مجھے احساس ہوا کہ وقت بہت زیادہ گزر چکا ہے۔ میں اور زیادہ پریشان ہو گئی۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ کادے اور بابا کو تلاش کرنے گئے تھے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ چوہدری نیاز کے ہتھے نہ چڑھ گئے ہوں۔ یہ سن کر وہ کھڑا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے زینو! میں اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔ تم فکر نہ کرنا۔ اگر اس نے یا اس کے آدمیوں نے انھیں پکڑا بھی ہو گا تو..... میں انھیں چھڑا لوں گا۔ تم یہاں سے کہیں مت جانا۔"

"پر جی..... ایک بات تو بتائیں۔" میں نے کھڑے ہوئے پوچھا۔ "آپ کو کیسے پتا چلا کہ ہم یہاں ہیں"

"میں تمہارے گھر گیا تھا۔ میرا مطلب ہے جہاں تم کام کرتی تھیں۔ وہاں مالی سے پتا چلا کہ تم کمالے کے ساتھ نکلی ہو۔ مالی نے بتایا تھا کہ کمالا پہلے اپنی ماں سے ملنے جائے گا۔ میں اسی وقت وہاں سے روانہ ہو گیا۔ کمالے کی ماں کے گاؤں پہنچا تو پتا چلا کہ تم لوگ وہاں سے نکل چکے ہو۔ میں نے لاری اڈے سے پتا کیا تو ایک آدمی نے بتایا کہ تم لوگ یہاں اترے ہو بس یہاں پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر کمالے کا پتا کرنا مشکل نہیں تھا۔ وہ اس گاؤں میں شاید پہلی بار آیا ہے۔ دو چار لوگوں سے پتا کیا تو معلوم ہوا کہ فضل دین کے گھر

مہمان آئے ہیں۔ مجھے یقین تو نہیں تھا کہ میں ٹھیک جگہ پہنچ جاؤں گا مگر یہاں تم دروازے پر ہی نظر آ گئیں۔"

"لو جی چاء پی لو۔" اس وقت شادو ہاتھ میں پیالا تھامے آ گئی۔ "اور جی یہ تمھارا جو بھاہے ناں! اس کو پٹا ڈال کے رکھو۔ گریب کی آہ لگ جائے تو کچھ بھی نہیں بچتا۔"

"بس کر شادو۔" میں نے اسے کہنی ماری۔

"نہ تو کیوں بس کروں؟ تجھے کیا پتا! وہ میرا کادا جو یہ بڑا' اونچا اور گبھرو جوان ہو گیا تھا اب کیسا ہو گیا ہے..... گھر بار چھوڑ کر گاؤں گاؤں چھپتا پھر رہا ہے اور وہ اس کا بوڑھا ابا ہے ناں۔ اسے دیکھ لے گی تو پاگل ہو جائے گی۔ ہائے کتنا کہا تھا کہ رہ جا..... مگر وہ تو....." شادو رونے لگی۔

"میں شرمندہ ہوں جی! اب آپ فکر نہ کریں۔" چوہدری فیاض نگاہیں جھکائے جھکائے بولا۔

"شادو یہ بولتے ہیں کہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے انھیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب کادے اور بابا کو کوئی پریشان نہیں کرے گا۔ اب نہ رو۔" میں نے شادو کو تسلی دی۔

"ہائے سچ!" وہ خوش ہو گئی۔ "اب بھاجی آئے گا تو میں اسے کہیں نہیں جانے دوں گی۔ یہیں رکھوں گی' اور زینو..... تیری شادی بھی یہیں کروں گی۔"

"اچھا بس کر....." میں شرما گئی۔

چوہدری فیاض چائے پی کر اٹھ گیا۔ "میں جاتا ہوں زینو! تم اب فکر نہ کرنا' ٹھیک ہے؟"

"اللہ کرے خیر ہو۔" میں نے دعا کی۔ شادو تو جھولی پھیلا کر اسے دعائیں دینے لگی۔ وہ جیسے ہی جیپ میں بیٹھا' جیپ اسٹارٹ ہو گئی۔ شاید اس کے ساتھ ڈرائیور بھی تھا۔ گلی میں پھیلی روشنی آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئی۔ جیپ کے مڑتے ہی دور تک گہرا اندھیرا چھا گیا۔

میں چند لمحے وہیں ساکت کھڑی رہ گئی۔ گہرا اندھیرا اور گہرا سناٹا مجھے اپنے اندر اترتا ہوا محسوس ہوا۔ اب تو بہت دیر ہو گئی تھی۔ میں آہستگی سے پلٹی۔ جی نہیں چاہا کہ

دروازے کی کنڈی لگا دوں' میں دروازے کو کھلا چھوڑ کر اندر آگئی۔ شادو چھپر کے نیچے لکڑی کی بلی سے ٹکی بیٹھی تھی۔ میں آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچی تو اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کی دھار دیکھ کر کلیجہ کٹتا ہوا محسوس ہوا۔

"شادو..... میں بہت بدقسمت ہوں۔ جہاں جاتی ہوں وہاں دکھ پہنچ جاتے ہیں۔ اس لیے..... اس لیے تو میں کادے اور بابا کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اسی لیے تو چھوڑا تھا میں نے۔" یہ کہتے کہتے میں رو پڑی۔

"نہ زینو..... تُو نہ رو۔ قسمت کسی کی خراب نہیں ہوتی۔ میں تو کادے کو یاد کر کے رو رہی تھی۔ کیسا ہنستا کھیلتا رہتا تھا پر تیرے بعد..... تیرے بعد تو اسے چپ لگ گئی تھی۔ لگتا تھا کہ ایک دم بوڑھا ہو گیا ہے۔ پر زینو.....!" وہ ایک دم آنسو پونچھ کر بولی۔ "اب وہ آئے گا نا تو تجھے دیکھ کر خوش ہو جائے گا۔ تُو..... تُو وہاں چھپ جانا۔ میں بولوں گی کہ تُو نہیں آئی۔ پر تیرے پھوپا نے اسے بتا دیا ہو گا کہ تُو آگئی ہے۔ چل کوئی بات نہیں۔ خوش تو ہو ہی گیا ہو گا ناں؟" وہ رونا بھول گئی تھی اور میں دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ خدا اس کی یہ مراد پوری کر دے۔

میری آنکھوں میں آنسو آتے تو میں بڑی مشکل سے انھیں بہنے سے روکتی کہ کہیں شادو پھر پریشان نہ ہو جائے۔ "شادو تُو لیٹ جا۔ یوں تھک جائے گی۔"

"نہیں..... زینو..... اتنی رات ہو گئی..... سعید پور اتنی دور تو نہیں ہے..... اور..... اور وہ نور پور بھی..... بس شاید اب آنے ہی والے ہوں گے۔" ابھی اس نے اپنا جملہ پورا کیا ہی تھا کہ ایک بار پھر گلی میں روشنی پھیل گئی۔ میں اور شادو دونوں اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگے۔ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی ہماری آنکھوں کو چندھیا رہی تھیں۔ گاڑی سے اترنے والوں کے بارے میں پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ کون ہیں۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اترنے والوں کی تعداد تین تھی' دو آگے آئے اور ایک گاڑی ہی کے پاس رہ گیا۔

"زینو!" ایک سرگوشی گونجی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ کادے کی آواز تھی۔ میں بے ساختہ آنے والوں کی طرف لپکی۔

"کادے..... کادے....." میں چیخ اٹھی۔ وہ کادا ہی تھا۔ کادا اور کمالا۔ پھوپا

گاڑی کے پاس تھا' پھر میں نے دیکھا کہ پھوپا بابا کو اتار رہا ہے۔ میں بھاگ کر بابا کے پاس چلی گئی۔ میں بری طرح رو رہی تھی۔ میں بابا سے لپٹ گئی۔ بابا کا بدن بھی جھٹکے لے رہا تھا' شاید وہ بھی رو رہا تھا۔ اس کے لرزتے ہوئے ہاتھ میری پشت کو تھپک رہے تھے۔ میں روئے جا رہی تھی۔ اتنی دیر میں شادو بھی روتی ہوئی بابا سے لپٹ گئی۔

"اندر چلو..... کیوں گلی میں تماشہ بنا رہی ہو" پھوپا نے شادو کو پکڑ کر کہا۔ ہم سب گلی کے اندھیرے میں کھڑے تھے اور میں کادے اور بابا کو دیکھنا چاہتی تھی۔ ہم سب اندر آگئے اور تبھی میں کادے اور بابا کو دیکھ کر دکھ سے چیخ اٹھی۔ وہ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ اگر وہ دونوں مجھے کہیں اور نظر بھی آتے تو میں پہچان نہ پاتی۔ میں پھر بابا سے لپٹ کر رونے لگی۔ کادے کی آنکھوں میں دور تک ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ مجھے تکے جا رہا تھا۔ اور شادو بھی روئے جا رہی تھی۔

"دیکھا زینو تُو نے.....! میرا گبھرو سا کادا کیسا ہو گیا..... دیکھا تُو نے.....!" وہ چیخ رہی تھی۔

"بس کر پُتر! بس کر..... جو بھی ہو گیا' اسے بھول جا..... اب تو ہم سب مل گئے ہیں نا..... زینو تُو کہاں چلی گئی تھی پُتر؟ تیرے بعد بڑی سختی اٹھائی ہے ہم نے..... بڑا دکھ سہا ہے۔"

بابا برداشت نہ کر پایا اور اس کی بوڑھی' اندر کو دھنسی آنکھیں بھیگ گئیں۔

کادا اب بھی چپ تھا۔ اس کے ہونٹ سختی سے آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں اور بے رونق سی آنکھیں اب بھی میرے چہرے پر گڑی تھیں۔ میرا جی چاہا کہ اس سے لپٹ کر' اسے جھنجھوڑ کر روؤں' چیخوں اس سے معافی مانگوں' اس سے کہوں کہ وہ کچھ بولے۔ مجھے برا بھلا کہے یوں چپ نہ رہے مگر کمالے اور پھوپا کی موجودگی میں میری ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے بابا کو منجھی پر لٹا دیا۔ وہ بہت لاغر ہو چکا تھا۔ میں اس کے گھٹنے پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی۔

"شادو روٹی نکال..... ہم سب بھوکے ہیں۔" پھوپا نے روتی ہوئی شادو سے کہا اور وہ جلدی سے اٹھ گئی۔ اس نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں اور ناک رگڑی اور دوپٹے کو سر پر جماتی ہوئی ٹنکی کے پاس جا بیٹھی اور منہ ہاتھ دھونے لگی۔ پھوپا کمالے کو لے کر

باہر منجھی پر جا بیٹھا۔ میں نے دھیرے سے سر اٹھا کر کادے کو دیکھا۔ وہ بت بنا بیٹھا تھا۔ مجھے خوف آنے لگا۔ میں جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب چلی گئی۔ میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے اور بے ساختہ پھر رو پڑی۔ "کادے.....! کادے مجھے معاف کر دے ..... مجھے معاف کر دے....."

اور پھر اچانک کادا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے قبل کہ میں اس سے کچھ کہتی اس کا دایاں ہاتھ گھوما اور میرے رخسار پر اس روز کا پڑا کہ میں چکرا کر دور جا گری۔ شادو اور بابا چیخ اٹھے شادو چیختی ہوئی میری طرف لپکی۔ کادا خونخوار نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں حیرت زدہ رہ گئی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کادا مجھے مارے گا۔

"تُو ..... تُو کیوں گئی تھی..... کیوں گئی تھی ہمیں چھوڑ کر؟" وہ بری طرح دھاڑا..... ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں پہلی بار کادے کو روتا دیکھ رہی تھی۔ "مجھے تو مار دیا تُو نے' اس بوڑھے کو بھی مار دیا۔ جانا تھا تو ٹھہری کیوں تھی۔ اتنا پیار کیوں دیا تھا ہمیں.....؟" وہ اب بھی چیخ رہا تھا اور میں کادے کے پیار کا یہ عجیب و غریب انداز دیکھ کر حیرت زدہ تھی۔ میں اس کے تھپڑ کی تکلیف بھول گئی تھی۔ مجھے اس کا مارنا اور یوں چیخ چیخ کر برا بھلا کہنا اچھا لگا۔ میں نے پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے' میں پھر اس کے قریب چلی گئی۔

"مار کادے ..... اور مار مجھے..... اور مار' جان سے مار دے مجھے' میں نے..... میں نے تجھے اور بابا کو بہت تنگ کیا ہے' خود بھی پل پل مرتی رہی ہوں کادے۔" میں روئی تو اس نے کسی کا لحاظ کیے بغیر مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ اب وہ مجھے سینے سے لپٹائے بری طرح رو رہا تھا۔ میں بھی رو رہی تھی' بابا اور شادو بھی رو رہے تھے۔ پھوپا کمالے کے ساتھ باہر ہی رہ گیا تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ اندر کا طوفان ہمیں بے قابو کر دے گا۔ وہ اسی لیے باہر رک گیا تھا۔ اتنے عرصے جدائی سہنے کا غم طوفان کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

پتا نہیں کتنے لمحے بیت گئے یا کتنی صدیاں بیت گئیں۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے میں بپھرے ہوئے خوفناک سمندر سے نکل کر اچانک ساحل پر پہنچ گئی ہوں یا کسی تپتے صحرا میں اچانک بادل گھر کر آگئے ہوں' اور میرے پیروں تلے جلتی ہوئی ریت اچانک ہی

ٹھنڈی ہو کر میرے بدن کی تپش کو نگل گئی ہو۔ کادے کے سینے میں موجیں مارتا پیار کا سمندر مجھے خود میں سمو رہا تھا۔ میرے بہتے ہوئے آنسوؤں نے اس کا کرتا گیلا کر دیا تھا اور اس کے آنسو میرے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

تب شاید اچانک ہی اسے بابا اور شادو کا خیال آگیا۔ طوفان تھما تو اسے شرمندگی سی ہوئی۔ اس نے گھبرا کر مجھے اپنی بانہوں کے حصار سے باہر دھکیل دیا۔ میں خود بھی جھینپ گئی۔ ہم دونوں کو چپ سی لگ گئی۔ نگاہیں زمین پر گڑ کر رہ گئیں۔ سارا شور جیسے تھم کر رہ گیا' پھر میں نے ڈرتے ڈرتے نگاہیں اٹھا کر بابا اور شادو کی طرف دیکھا۔ دونوں کے چہروں پر روشنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ آنکھیں چمک رہی تھیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ مجھے اپنی جانب دیکھتے پا کر بابا نے اپنی بانہیں پھیلا دیں اور میں بھاگ کر اس کے سینے سے لگ گئی۔

"زینو پُتر! اپنوں سے یوں بھاگتے ہیں کیا؟" اس نے پیار سے میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

تب میں نے اسے بتایا کہ میں ان سے کیوں جدا ہوئی تھی۔

"پر تُو بیل گاڑی سے کب اتری تھی؟" کادے نے قریب آکر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"بابا سو رہا تھا اور تُو..... تُو گاڑی چلا رہا تھا۔ سعید پور سے پہلے جب ریل کی پٹڑی آئی تھی ناں تب چپکے سے اتر گئی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کادے کہ چوہدری نیاز میری وجہ سے تیرے اور بابا کے پیچھے پڑ جائے۔"

"جھلّی ہے تُو پُتر! میں نے تجھے کہا تھا ناں کہ مصیبت کسی کی وجہ سے نہیں آتی..... قسمت میں ہوتی ہے تو بس آجاتی ہے اور چوہدری نیاز بھلا کب کسی کو نقصان پہنچا سکتا ہے اگر رب نہ چاہے تو..... تو دیکھ لے' میں اور کادا دونوں ٹھیک ہیں..... ہاں بس تجھے تلاش کرتے کرتے بہت تھک گئے تھے۔ میرا تو کلیجہ کٹ جاتا تھا یہ سوچ کر کہ تو اکیلی کہاں کہاں پھرتی ہو گی! پتا نہیں تجھے چوہدری نیاز نے نہ پکڑ لیا ہو۔ کادا تو اس کی حویلی میں آگ لگانے جا رہا تھا۔ میں نے نہ ہوتا تو پتا نہیں یہ کیا کر بیٹھتا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ تجھے نقصان نہیں پہنچا سکا ہو گا۔ بس' پتا نہیں کیوں یقین تھا۔ رب نے دل میں ایک اطمینان سا ڈالا تھا۔"

"اونہہ..... یہ تُو میں نہیں چاہتی تھی۔"

کادا سر جھٹک کر بڑبڑایا۔ "تیرے چاہنے نہ چاہنے پر ہی تو دنیا چل رہی ہے ناں..... اور وہ چوہدری نیاز.....! اب دیکھنا میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں' اور تُو ..... کان کھول کر سن لے' اگر تُو نے میری اجازت کے بغیر ایک قدم بھی باہر نکالا تو سوچ لینا' اتنا ماروں گا کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے سمجھی! بڑی ٹارزن بنتی ہے' اکیلی کیا کر لیتی تُو.....ہیں.....! بول کیا کر لیتی؟" اسے پھر غصہ آگیا تھا۔ اس نے میری چٹیا پکڑ لی۔

میرے منہ سے سسکاری نکل گئی۔

"ابے او کھوتے۔" بابا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "چھوڑ اسے..... ہوش میں رہ۔ یہ تیری نوں نہیں ہے' بڑا آیا اپنا حق جتانے والا۔" بابا نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دے کر میرے بال چھڑا لیے۔

"پوچھ اس سے' یہ اتنا عرصہ کہاں تھی اور وہ..... جو باہر بیٹھا ہے' وہ کون ہے؟"

میں چونک اٹھی۔ اس کا لہجہ شک میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے غصہ تو آیا مگر یہ خیال آتے ہی ٹھنڈی ہو گئی کہ آخر وہ مرد ہے اور میں عورت' اور عورت بھی وہ جس سے کادا ٹوٹ کر پیار کرتا ہے۔ اسے یہ جاننے کا حق تھا کہ میں اتنا عرصہ کہاں اور کیسے رہی۔ بابا نے اس کی بات سن کر اسے گھورا تھا مگر میں ایک دم بول اٹھی۔

"میں سب بتا دوں گی کادے! پر تُو روٹی کھالے۔"

"ہاں کادے! تجھے نہیں پتا' زینو نے بھی کب سے روٹی نہیں کھائی ہے۔ ہم کب سے بھوکے تیرے انتظار میں بیٹھے تھے۔" شادو نے کہا۔ وہ کھانا گرم کر چکی تھی۔ اس نے روٹی کی چھابی اور سالن کا کٹورا کادے کو دیا تاکہ وہ باہر دے آئے۔ کادا کھانا باہر لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی پھوپا اندر آگیا۔ کملا کھانا باہر کھا رہا تھا اور ہم سب ایک ساتھ بیٹھ گئے۔

کھانا کھاتے میں گہری خاموشی طاری رہی۔ کبھی کبھی کادا جلتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھتا اور میں اس کی نگاہوں کی تپش سے سلگ اٹھتی۔ مجھے اتنے عرصے بعد کادے کو دیکھنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں رب کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اس نے انھیں خیر سے ملا دیا۔ کھانا کھا کر پھوپا اور شادو نے کادے اور بابا سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب وہ لوگ یہاں سے

کہیں نہیں جائیں گے' انھیں اب یہیں رہنا ہو گا۔

"اور بھاء جی..... یہ زینو بھی اب نہیں جائے گی کہیں۔ اب تو تم اسے کھونٹے سے ہی باندھ دو تاکہ....."

اور بے اختیار میرے ہونٹوں پر ہنسی مچل گئی۔ بابا بھی ہنسنے لگا مگر آج کادے نے کھونٹا کہنے کا برا نہیں مانا۔ اس کے چہرے پر ویسے ہی سنجیدگی چھائی رہی۔ میں جلدی سے پلٹ گئی کہ کہیں وہ میری مسکراہٹ دیکھ کر چڑ ہی نہ جائے۔ اسے سنجیدہ دیکھ کر بابا بھی چپ ہو گیا۔

"کیوں کادے تُو نے سنا نہیں کہ شادو نے کیا کہا ہے؟"

"سن لیا ہے۔" اس نے اکھڑے انداز میں جواب دیا۔ "پر میں سوچ چکا ہوں بلکہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ اب جب تک چوہدری نیاز کو ٹھکانے نہیں لگاؤں گا کچھ بھی نہیں کروں گا' چین سے بھی نہیں بیٹھوں گا۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔

"جھلّا ہوا ہے تُو..... وہ سب بعد میں بھی ہو سکتا ہے اسے تو ٹھکانے لگا دے۔" بابا نے میری طرف اشارہ کیا۔

"بس بابا..... میں نے کہہ دیا ناں کہ....."

"بھاء جی چپ کر جا..... اس کا تو متھا ہی خراب ہے۔ پر کان کھول کر سن لے کادے۔ میں جان دے دوں گی اگر تُو یہاں سے کہیں گیا تو..... اور ہاں زینو اسے بتا کہ چوہدری فیاض کیا کہہ رہا تھا۔" اس نے آخری جملہ میری طرف منہ کر کے کہا۔

"چوہدری فیاض؟" وہ چونک اٹھا۔ "یہ کون ہے؟"

"چوہدری نیاز کا بڑا بھائی ہے وہ..... وہ یہاں آیا تھا۔ اس نے کراچی سے ہمارا پیچھا کیا تھا۔"

"تُو.....تُو کراچی میں تھی؟ اکیلی.....؟" کادے نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔

"کادے تُو نے پوچھا ہی نہیں کہ میں سعید پور میں اتر کر کہاں گئی تھی؟ میرے ساتھ اتنا عرصہ کیا ہوا' میں تو تجھے چھوڑتے ہی تجھے تلاش کرنے لگی تھی۔ جب تُو کہیں بھی نہ ملا تو..... تو میں کراچی چلی گئی پر تُو سُن تو سہی کہ میں وہاں کیوں گئی!" یہ کہتے کہتے میں رو

پڑی۔ مجھے کادے کے بغیر گزارا ہوا لمحہ لمحہ یاد آگیا' وہ چپ چاپ مجھے دیکھ رہا تھا۔ تب میں نے آنسو پونچھ لیے اور اسے شروع سے لے کر آخر تک کا بیتا ہوا لمحہ لمحہ' پل پل بتا دیا' بس میں نے اسے چوہدری کے بارے میں نہیں بتایا کہ اسے میں نے قتل کر دیا تھا۔ یہ بات میں نے صرف شادو کی وجہ سے چھپائی تھی ورنہ میں کادے اور بابا کو بتانا چاہتی تھی کہ میرے ساتھ کیا کیا ہوا ہے۔ میں نے یہ بتایا تھا کہ اسے دینو نے پیچھے سے آکر چھری مار دی اور یوں میں اس کے ظلم سے بچ گئی' پھر میں نے کادے کو یہ بھی بتایا کہ ماجا دینو کا دوست تھا اور وہ اس وقت وہیں تھا۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ چوہدری نیاز ماجے اور دینو کو اٹھا کر لے گیا ہے' کملا اسی لیے میرے ساتھ آیا تھا تاکہ مجھے میری منزل تک پہنچا کر اور تیرے ساتھ مل کر چوہدری نیاز کی قید سے دینو اور ماجے کو آزاد کرا سکے۔ ماجے کے باپ کی موت کے بارے میں سن کر بابا رو پڑا تھا اور کادا کسی ببر شیر کی طرح دھاڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی چیخ سن کر پھوپا اور کملا گھبرا کر اندر آگئے تھے۔ ان دونوں نے کادے کو سنبھال لیا ورنہ وہ نہ جانے کیا کر بیٹھتا۔ کادا احسان فراموش نہیں تھا' اسے یاد تھا کہ ہمیں وہاں سے فرار کرانے اور چوہدری نیاز سے بچانے والا ماجا ہی تھا' پھر وہ بالی کی منگ تھا اور بالی کو پتا بھی نہ تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا' بالی اور نذیر کے ہم پر بے پناہ احسانات تھے۔ انھوں نے واقعی دوستی نبھائی تھی۔ برے وقت میں ہمارا ساتھ دیا تھا پھر بھلا کادا وہ سب کچھ کیسے برداشت کرتا۔

بڑی مشکل سے کادا قابو میں آیا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ میں ریشماں کے کہنے پر کراچی چلی گئی۔ دینو نے مجھے چوہدری فیاض کا پیغام اور کارڈ دیا تھا۔ کراچی جا کر میں نے اس سے رابطہ کیا مگر جس روز میں اسے ملنے گئی اس روز عبدالقادر نے مجھے کار سے کچلنے کی کوشش کی۔ میں اگلے روز کملے کے ساتھ گاؤں روانہ ہو گئی اور تبھی چوہدری فیاض میرے پیچھے پیچھے یہاں تک پہنچ گیا' پھر جو کچھ چوہدری فیاض نے کہا اسے سن کر کادے کی آنکھوں میں چمک اتر آئی۔ کملا بھی یہ سن کر بہت خوش ہو گیا کہ چوہدری فیاض' چوہدری نیاز کے پاس گاؤں گیا ہے۔

"ہمیں سویرے ہی نکل جانا چاہیے کادے..... ہمیں چوہدری فیاض کی موجودگی میں چوہدری نیاز کو پکڑ لینا چاہیے۔" کملا پُرجوش انداز میں بولا۔

"میں..... میں بھی چلوں گی کادے!" میں گھبرا گئی۔

"راستے میں کہیں چپکے سے مجھے چھوڑ جانے کے لیے؟" اس نے بھنا کر مجھے دیکھا۔

"معاف کر دے مجھے۔" کادے میں چیخ اٹھی۔ "یا پھر..... یا پھر گلا دبا دے میرا' مگر سن کادے' میں اپنے بابا اور اماں کی لاش سے وعدہ کر چکی ہوں کہ چوہدری نیاز کو میں اپنے ہاتھوں سے سزا دوں گی۔ سن لیا تو نے.....؟" میرا لہجہ دیکھ کر وہاں لمحہ بھر کے لیے گہرا سناٹا چھا گیا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کادے سے اس لہجے میں بات کی تھی۔ وہ بھی حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ "ہاں..... میں جاؤں گی..... جاؤں گی وہاں..... میں اپنے گھر جاؤں گی کادے..... وہ در و دیوار دیکھوں گی جہاں میں نے بھی خوشیاں پائی تھیں۔ خالہ فاطمہ سے ملوں گی۔ میں ضرور جاؤں گی کادے اور..... اور اگر تو مجھے نہیں لے کر گیا تو بھی جاؤں گی..... تو بھی....." میں دونوں ہاتھوں کو چہرے پر رکھ کر رو پڑی۔

"ٹھیک ہے پُتر!" بابا کی ٹھہری ہوئی آواز گونج اٹھی..... "تو بھی چل..... میں لے کر جاؤں گا تجھے۔"

"بھاء جی! تو..... بھی جائے گا؟" شادو پھٹی پھٹی آواز میں بولی۔ "تم سب چلے جاؤ گے' مجھے پھر سولی پر لٹکا دو گے۔"

"شادو.....! پُتر ہم یہاں کیسے رہ سکتے ہیں؟ ہمیں تو جانا ہی ہے ناں!"

"نہیں بھاء جی..... مجھے مرتے چھوڑ کر اب تمہیں کہیں نہیں جانا۔ نہیں جانا کسی نے کہیں۔" وہ پھر رو پڑی۔

"شادو ہم واپس آئیں گے۔" میں نے جلدی سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا' پھر میں کادے کی طرف پلٹی۔ "واپس آئیں گے ناں کادے؟"

"ہاں..... ہاں ہم واپس آئیں گے شادو۔ زینو کو اس کھونٹے سے تو ہی باندھے گی شادو..... بس تم روؤ نہیں۔ میں لاؤں گا بابا کو..... ہاں میں لاؤں گا۔" وہ بھی شادو کے قریب آ بیٹھا۔

"رات بہت بیت گئی ہے۔ اب سو جاؤ سب۔" شادو کے خاوند نے دری اور چادر اٹھا کر اپنے کاندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں اب سو جاؤ۔ سویرے نکلنا ہے تو کچھ آرام کرنا ضروری ہے۔" بابا نے شادو کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "تُو بھی سو جا شادو' چل میں وعدہ کرتا ہوں کہ لوٹ کر آؤں گا۔ اب تو ٹھیک ہے ناں؟"

اور معصوم سی شادو اسی پر خوش ہو گئی۔ میں تو گاؤں جانے کا سن کر سبھی کچھ بھول گئی تھی۔ میں جلدی سے جا کر اپنی منجھی پر لیٹ گئی۔ شادو' کادے اور بابا کی منجھی پہلے ہی ڈال چکی تھی۔ کملا اور پھوپا باہر چلے گئے۔ میں لیٹ گئی تھی پر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں نے اس تھیلے میں سے گھر کی چابی نکال لی جس میں میرے کپڑے تھے۔ چابی مٹھی میں آتے ہی لگا جیسے میں نے کوئی خزانہ پا لیا ہو۔ میں نے اماں کی میت پر قسم کھائی تھی کہ میں لوٹ کر آؤں گی' چوہدری نیاز سے بدلہ لوں گی اور اپنے گھر کو آباد بھی کروں گی۔ میں نے سوچ لیا کہ چوہدری نیاز سے بدلہ لینے کے بعد میں واپس یہاں آتے ہوئے ماما کے گاؤں ضرور جاؤں گی اور اس سے کہوں گی کہ ماما! تُو تو میرا خون تھا پر میری کوئی مدد نہ کر سکا اور انھیں دیکھ' جو میرے کوئی بھی نہیں تھے۔ مگر ان لوگوں نے مجھے قدم قدم پر سہارا دیا۔ میری وجہ سے اپنا گھر بار چھوڑ دیا' اپنی جان جوکھوں میں ڈال لی پر میرا ساتھ نہیں چھوڑا اور ایک تُو تھا کہ تُو نے میری بات تک نہ سنی' یہ تک نہ سوچا کہ میں تیری بہن کی آخری نشانی ہوں۔ میں بھٹکتی پھروں گی تو میری ماں کی روح کیسا تڑپے گی میں نے سوچ لیا تھا کہ اس روز میں کاکے اور مامی سے مل کر انھیں آخری بار پیار کر کے ماما سے سارے رشتے توڑ آؤں گی' اسے بتا دوں گی کہ تجھے اپنے خون پر اعتبار نہ تھا۔ تُو نے ایک بار بھی نہ سوچا کہ میں چوری نہیں کر سکتی۔ بڑی زمینداری کو نہیں مار سکتی اور آج میں تجھ پر اعتبار نہیں کرتی کہ تُو نے مجھے بیچ منجدھار میں پہلے ہی چھوڑ دیا اور کبھی بھی چھوڑ سکتا ہے۔ میں اسے یہ بھی بتاؤں گی کہ میں اس کی اسی پیاری سی آپا کی آخری نشانی ہوں جسے وہ ماں کی طرح چاہتا تھا اور اسی ماں نے مجھے حویلی سے بھاگ کر اس کے پاس چلے جانے کو کہا تھا۔ یہ اس کی آخری خواہش تھی پر تُو نے اس کا اور میرا مان توڑ دیا۔ وہ قیامت کے روز تیرا گریبان ضرور پکڑے گی۔

میں یہ باتیں سوچتے سوچتے رو پڑی تبھی میں نے آنگن میں ہلکی سی آہٹ سنی۔ میں نے جلدی سے آنسو صاف کیے اور دبے پاؤں اٹھ کر باہر جھانکا۔ وہ کاذا تھا جو بڑی بے

چینی سے آنگن میں ٹہل رہا تھا۔ میں اس کی بے چینی کا سبب جانتی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بھری چنگاریاں دیکھی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ انتقام کی دہکتی ہوئی آگ اسے سونے نہیں دے رہی۔ جی چاہا کہ جا کر اسے تسلی دوں پھر سب کا خیال کر کے باہر نکلنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں پھر منجھی پر جا لیٹی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ بس میں پلکیں جھپکوں اور سویرا ہو جائے پھر جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

مجھے سویرے شادو نے اٹھایا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ یوں لگا جیسے کافی دن چڑھ گیا ہو' میں ڈر گئی کہ کہیں کادا اور بابا مجھے چھوڑ کر چلے نہ گئے ہوں۔ میں بھاگ کر باہر نکلی' بابا سر پر پگڑی لپیٹ رہا تھا۔ ٹین کا وہی بکسا اس کے پاس رکھا تھا جس میں میرے کپڑے اور بڑی زمینداری کا دیا ہوا زیور تھا اور جو میں سعید پور میں ریل کی پٹڑی پر اترتے وقت گاڑی میں چھوڑ آئی تھی۔ مجھے دیکھ کر کادے کی آنکھوں میں ہلکی مسکراہٹ سمٹ آئی۔ میں نے کل سے اب تک اسے پہلی بار مسکراتے دیکھا تھا۔ میرا تو من ہی ناچ اٹھا ورنہ کل تو اس نے مجھے بہت رلایا تھا۔ میں جلدی سے منہ ہاتھ دھونے بیٹھ گئی۔ شادو مجھے اٹھا کر خود چائے بنانے بیٹھ گئی تھی۔ اس کے بچے اٹھ چکے تھے اور کادے اور بابا کو دیکھ کر سب خوش ہو رہے تھے۔ میں نے منہ دھو کر جلدی سے چائے پیالے میں نکالی اور بابا کو دے دی۔ میں بھولی نہیں تھی کہ بابا سویرے سویرے گرم گرم چائے پیتا تھا پر کادا چائے کے ساتھ روغنی روٹی کھاتا تھا۔ بابا کو چائے دینے کے بعد میں نے کادے کو روٹی اور چائے دی' پھر خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔

"بابا! تُو نے بیل گاڑی وہاں کیوں چھوڑ دی تھی؟" میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

"وہاں ..... کہاں؟" کادا چونک اٹھا۔ "تجھے کیسے پتا کہ ....."

"مجھے فیضو نے بتایا تھا۔ میں نے اسے تیری تلاش میں بھیجا تھا ناں ..... جب تم دونوں ٹیشن پر مجھے پوچھ کر چلے گئے تھے ناں تو تھوڑی دیر بعد چوہدری نیاز کے آدمی بھی پہنچ گئے تھے۔ جب فیضو کو پتا چلا تو وہ تمہیں دیکھنے گیا پر واپس آ کر اس نے بتایا کہ نہر کے پاس بیل گاڑی کھڑی تھی۔ تم دونوں بھی نہیں تھے اور سامان بھی نہیں تھا۔"

"اچھا ..... تو وہ فیضو تھا' وہی ٹیشن والا؟" کادا گہری سانس لے کر بولا۔

"ہاں ..... تم نے دیکھا تھا اسے؟"

"ہاں دیکھا تھا اور ہم اسے چوہدری نیاز کا آدمی سمجھے تھے۔ ہم وہاں کچھ دیر آرام کرنے کو رکے تھے۔ جھاڑیوں کے پیچھے لیٹے تھے تبھی ہم نے اسے دیکھا۔ میں اور بابا چھپ گئے' جب وہ چلا گیا تب نکلے تھے۔"

"اگر تم اسے مل جاتے تو ....." میں نے آہ بھری۔

"چل چل ..... اب جو کچھ ہو گیا اس کا رونا مت رو۔" بابا نے ٹین کا بکسا کھولتے ہوئے کہا پھر اس بکسے سے زیور کی پوٹلی نکال کر میری طرف بڑھائی۔ "پُتر زینو! یہ لے' تیری امانت۔"

"ہاں بابا ..... یہ ساتھ لے لے۔ میں اسے چوہدری نیاز کے منہ پر ماروں گی اور اسے بتاؤں گی کہ یہ میں نے چوری نہیں کئے تھے بلکہ بڑی زمینداری نے دیئے تھے۔"

"ہاں ٹھیک ہے' دے دینا اسے۔" کادے نے نتھنے پھلا کر کہا۔

اتنی دیر میں کمالا ناشتا کر کے تیار ہو چکا تھا۔ میں نے بابا سے پوچھا کہ ہم سب جائیں گے کیسے تب اس نے بتایا کہ ہمیں لاری سے جانا ہو گا کیونکہ وہ اپنی بیل گاڑی تو سعید پور میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ پھوپا ہمیں اس سوزوکی میں لاری اڈے تک لے جانے کے لئے تیار تھا پھر اسے گاڑی واپس کرنا تھی اور اپنے دھندے پر جانا تھا۔ شادو بہت اداس اور گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ بار بار دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑ رہی تھی۔ بچے بھی سب کو یوں جاتا دیکھ کر منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ شادو کے بڑے بیٹے نے بابا سے پوچھا کہ وہ کیوں جا رہا ہے تو بابا نے اسے گود میں اٹھا کر کہا۔ "تیرا گڑ بھول آیا تھا میں ..... اور تل والے لڈو بھی گھر پر رہ گئے۔ میں بس یوں گیا اور یوں آیا۔"

"ماما جی لوٹ کے آؤ گے ناں؟" اس نے اتنی معصومیت سے کہا کہ میرا دل بھر آیا۔

"بول دے بابا آئیں گے۔"

بابا نے میری طرف دیکھا۔ شادو بھی اسے امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے تب بابا نے سر ہلا دیا۔ "ہاں ..... ہاں پُتر آئیں گے' پر اپنی ماں سے کہہ دے اگر یہ پھر روئی تو میں کبھی نہیں آؤں گا۔"

اور شادو نے جھٹ اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ میں نے آگے بڑھ کر شادو کے رخسار

پر پیار کیا۔ "شادو! دعا کرنا رب خیر کرے۔" پھر بچوں کو پیار کیا اور بابا کے ساتھ باہر آ گئی۔ کادا گاڑی میں سامان رکھ چکا تھا۔ کمالا اور پھوپا گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ کادے نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گاڑی کے پچھلے حصے میں چڑھا دیا۔ بابا بھی بیٹھ گیا اور کادا بھی۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ شادو اب بھی بچوں کو خود سے لپٹائے دروازے پر کھڑی تھی اور ہمیں دیکھ رہی تھی۔

ہمیں لاری اڈے پر اتار کر پھوپا چلا گیا۔ بابا نے اسے فوراً ہی بھیج دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شادو بری طرح رو رہی ہو گی۔ اس کے جانے کے بعد کادے نے ہم سب کو لاری میں چڑھا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد لاری میرے گاؤں کی طرف جا رہی تھی اور میں اندر ہی اندر رو رہی تھی۔ مجھے وہ دن یاد آ رہا تھا جب میں پہلی بار اپنے گاؤں سے نکلی تھی۔ آدھی رات کے سناٹے میں' میں دبے پاؤں پتلی پتلی گلیوں سے ہوتی ہوئی پکی سڑک پر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس وقت مجھے گمان بھی نہ تھا کہ میں اب' اس طرح واپس اپنے گاؤں لوٹوں گی۔

لاری سویرے چلی تھی' اسے رات کے سناٹے میں ہمارے گاؤں پہنچنا تھا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ کمالا کادے سے باتیں کر رہا تھا۔ اچانک کادے نے بڑی زور سے چونک کر مجھے دیکھا' اس کی آنکھوں میں بلا کی حیرت تھی۔

"کیا ہوا .....؟ ایسے کیوں دیکھ رہا ہے؟" میں نے آگے کی طرف جھک کر پوچھا۔ وہ مجھ سے آگے والی سیٹ پر بیٹھا تھا جب کہ بابا میرے برابر میں بیٹھا اونگ رہا تھا۔

"زینو .....! تُو نے ..... اس چوہدری کو ....."

اور میں دھک سے رہ گئی۔ شاید کمالے نے اسے بتا دیا تھا کہ میں نے ہی اس چوہدری کو قتل کیا تھا۔ وہ کچھ دیر مجھے حیرت سے دیکھتا رہا پھر کمالے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے ان کی باتوں پر کان لگایا تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ کمالا اسے بالے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ میرا ساتھ اسی لئے دے رہا ہے کہ میں نے اس کے بھائی کے قاتل کو اس کے انجام تک پہنچا دیا اور اب وہ دینو کو بچانا چاہتا ہے' جو اس کے بھائی کا سالا ہے۔ اس نے کادے کو بتایا کہ چوہدری فیاض اگر وہاں پہنچ چکا ہے تو سمجھو چوہدری نیاز کا انجام قریب آ چکا ہے۔ میں نے پلٹ کر بابا کی طرف دیکھا۔ شکر ہے وہ اونگھ رہا تھا ورنہ

اگر وہ سن لیتا کہ میں نے چوہدری کا قتل کیا ہے تو کیا ہوتا؟

لاری اونچے نیچے راستوں پر دوڑ رہی تھی اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں ماضی کی طرف سفر کر رہی ہوں۔ وہی جانا پہچانا راستہ تھا جو آگے جا کر دوسری طرف مڑ گیا جب کہ لاری سیدھی جا رہی تھی۔ ہمارا یہ سفر خوف کا سفر تھا۔ میں ان لوگوں میں جا رہی تھی جو میرے ماں باپ کے قاتل تھے۔ جنہوں نے مجھ پر قتل کا جھوٹا الزام لگایا تھا۔ جو اتنے برس گزرنے پر بھی سائے کی طرح میرے آگے پیچھے تھے۔ میں اگر اس سائے سے بچی تھی تو محض حالات کی تیز دھوپ کی وجہ سے مگر آج میں خود چل کر ان کے بچھائے ہوئے جال میں جا رہی تھی اور حیرت کی بات تو یہ تھی کہ میں خوف زدہ نہیں تھی۔ نہ معلوم کیوں ایک گہرا اطمینان سا تھا جو میرے پورے وجود میں ٹھنڈک بن کر پھیلا ہوا تھا۔ آج نہ مجھے چوہدری نیاز کا خوف تھا نہ سونیا کا' نہ پولیس والوں سے ڈر لگ رہا تھا۔ نہ عبدالقادر اور دوسرے پالتو کتوں سے جن کی آہٹ ہی اب سے پہلے میری جان نکال دیا کرتی تھی۔

شاید یہ کادے کی وجہ سے تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ چوہدری فیاض بھی تھا جو چوہدری نیاز کا بھائی ہوتے ہوئے بھی اس کے مظالم سے واقف تھا اور اب تو وہ جان چکا تھا کہ اس کی ماں کو سونیا نے قتل کیا ہے۔ اس کے باپ کو مروانے والے بھی یہی لوگ ہو سکتے ہیں۔ یہ خیال مجھے آیا تھا تو بھلا چوہدری فیاض کو نہ آیا ہو گا! وہ یقیناً جان گیا ہو گا کہ بڑے زمیندار اور بڑے زمینداری کو موت کے گھاٹ اتارنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ چوہدری نیاز کو سزا ضرور دلوائے گا۔

میں ایسی ہی ہزار باتیں سوچتے سوچتے اونگھ گئی۔ مجھے تو جانے کتنے برسوں کی نیند تھی۔ میں تو جانے کب سے سوئی ہی نہیں تھی۔ چلتی لاری میں اونچے نیچے راستوں پر جھٹکے لگنے کے باوجود مجھے بڑی اچھی نیند آئی۔ آنکھ اس وقت کھلی جب لاری ایک جھٹکے سے رک گئی۔ میں نے چونک کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ یہاں ایک جھونپڑی نما چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ ساتھ ہی ایک پیٹرول پمپ بھی تھا اور درخت کے سائے میں چند چھابڑی والے بیٹھے مختلف چیزیں بیچ رہے تھے۔ لاری یہاں کچھ دیر کو رکتی تھی۔ اندر بیٹھے ہوئے لوگ ٹانگیں سیدھی کرنے کے لئے فوراً ہی لاری سے اتر گئے۔ کچھ لوگ ہوٹل کے باہر پڑی منجھیوں پر بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ بابا اور کادا بھی اتر گیا۔ کمالے کو کادے نے خود ہی

بیٹھا رہنے کو کہا تھا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ میں اکیلی ہوئی تو پھر کہیں چپکے سے نہ اتر جاؤں۔ کچھ ہی دیر بعد وہ چھابڑی والے سے کیلے لے کر واپس آ گیا۔ اب اس نے کمالے کو باہر جانے کی اجازت دے دی۔ میں نے دیکھا' بابا ہوٹل کے باہر منجھی پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ کادا میرے برابر والی سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس نے کیلا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لے کھا لے ..... بھوک تو لگی ہو گی ناں؟" وہ ٹھیک کہہ رہا تھا مجھے بھوک لگ رہی تھی' گھر سے چلے ہوئے بھی تو تین چار گھنٹے ہو چکے تھے۔

میں نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا' اس کی نگاہیں نیچی تھیں۔ "کادے!" میں نے دھیرے سے اسے پکارا۔

"ہوں ..... لے یہ کیلا لے۔" اس نے اکھڑے ہوئے انداز میں کہا مگر نگاہ اٹھا کر مجھے نہیں دیکھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا تو میرے دل میں ہوک سی اٹھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ چہرے پر جہاں گلابی چمک تھی وہاں سفیدی پھیلی ہوئی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔

"کادے! تُو ناراض ہے مجھ سے؟"

"نہیں بڑا خوش ہوں۔ تُو نے میری زندگی بنا دی ہے ناں ..... میرے آنگن میں خوشیوں کے پھول کھلا دیئے ہیں۔ ستارے توڑ کر میرے اندھیرے گھر کو روشن کر دیا ہے اور وہ ..... وہ کیا ہوتی ہے' جو بارش کے بعد آسمان پر نظر آتی ہے ..... رنگین سی۔"

"دھنک؟"

"ہاں وہ بھی میرے گھر میں لا کر سجا دی ہے جس سے میری زندگی' پوری کی پوری زندگی رنگین ہو گئی ہے۔" وہ بہت جلا ہوا تھا۔

میں زور سے ہنس پڑی۔ "کیا تُو نے اسکول میں داخلہ لے لیا ہے؟" میں نے شوخی سے پوچھا۔

"کیوں ..... میں کیا تجھے پاگل نظر آ رہا ہوں؟"

"میں نے کب تمہیں پاگل کہا ہے؟"

"اتنی بڑی عمر میں اسکول میں داخل ہونے والے پاگل ہوتے ہیں ..... تجھے کیا!

کھانا ہے یا نہیں' لے پکڑ۔" وہ جھنجلا گیا۔

میں اس کا غصہ کم کرنا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ مجھے دیکھے ..... میری آنکھوں میں دیکھے۔ میں جانتی تھی کہ میری آنکھوں میں بھرا پیار اسے پگھلا دے گا اور یہ بات شاید وہ خود بھی جانتا تھا۔ جبھی تو میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

"ایسے غصے سے کیلا دے گا تو نہیں کھاؤں گی۔" میں نے منہ پھلا کر کہا۔

"نخرے نہ کر' اب میں تیرے نخرے نہیں اٹھاؤں گا۔ اب تو تُو دنیا گھوم چکی ہے' وہ پہلے والی معصوم سی زینو نہیں ہے جو ....."

"کادے؟" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کیا تُو ..... مجھ پر شک کر رہا ہے؟ میری طرف دیکھ کر بات کر ورنہ ..... ورنہ میں بس سے کود کر جان دے دوں گی۔"

اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ "نہیں ....." نہیں بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"تو پھر ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے؟" میں روہانسی ہو گئی۔

"تُو ..... تو کیوں گئی تھی۔ کیوں چھوڑ گئی تھی ہمیں؟" اس کی آواز بھی بھرا گئی۔

"تجھے پتا ہے میں کتنی بار مر مر کر جیا ہوں۔ اگر تیرے ملنے کی آس نہ ہوتی تو ..... تو خدا کی قسم جان دے چکا ہوتا۔"

"بس کر کادے ..... میں تجھے بتا چکی ہوں کہ میں کیوں گئی تھی' پر تجھ سے جدا ہو کر جان گئی کہ تیرے ساتھ جینا جتنا خوب صورت تھا' تیرے ساتھ مرنا بھی اتنا ہی حسین ہو گا' پھر کیوں ماری ماری پھروں' اور پھر کادے' میں تو تجھ سے بچھڑتے ہی تجھے تلاش کرنے میں لگ گئی تھی۔"

"اچھا زینو ..... قسم کھا کہ اب تُو نہیں جائے گی ناں؟"

"نہیں کادے ..... کبھی بھی نہیں ..... اب تیرے ساتھ ہی مروں گی۔"

مجھے لگا جیسے کادے کا دل پھر آئینے کی طرف صاف ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئی۔ اسی وقت لاری کا ڈرائیور آ کر لاری میں بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر سارے مسافر اپنی اپنی سیٹوں پر آ بیٹھے۔ کچھ دیر بعد لاری نے جھٹکا لیا اور رینگتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ پکی سڑک پر آتے ہی لاری کی رفتار تیز ہو گئی۔ کادا بابا کے آتے ہی اپنی سیٹ پر چلا

گیا تھا۔ کملا اور کادا دونوں پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ مجھے پھر نیند آنے لگی۔ میں نے سر کھڑکی کے بند شیشے سے ٹیک دیا اور اونگھنے لگی۔

لاری ایک جگہ اور رکی مگر یہاں کوئی بھی لاری سے نیچے نہیں اترا۔ یہاں لاری زیادہ دیر نہیں رکی۔ اب شام گہری ہو گئی تھی۔ لاری کے سبھی مسافر اونگھ رہے تھے۔ وقت دھیرے دھیرے آگے سرک رہا تھا۔ میری بے چینی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ نہ معلوم کیوں دل گھبرانے لگا تھا۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ بہت دیر تک سوچتی رہی کہ وہ کیا بات ہے جو مجھے بے چین کر رہی ہے مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کملا اور کادا دونوں ہی اونگھ رہے تھے۔ بابا تو سیٹ کی پشت سے ٹکا سو رہا تھا۔ میں کسمسا کر رہ گئی۔ لاری اب میرے گاؤں سے کافی قریب ہو گئی تھی۔ میرا دل دھڑکنے لگا تھا۔ اب اندھیرا پھیل چکا تھا۔ دور سے بتیاں نظر آ رہی تھیں۔ بتیاں دیکھتے ہی میری آنکھوں سے نیند غائب ہو گئی۔ میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے کادے کو کندھا چھو کر اسے جگا دیا۔

"کیا ..... کیا ہوا؟" وہ گھبرا کر بولا۔

"کادے .....! میرا گاؤں آ رہا ہے۔" میں نے کھڑکی سے اسے بتیاں دکھائیں۔ اب وہ بھی سیدھا ہو گیا۔ کملا بھی اٹھ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد لاری میرے گاؤں میں داخل ہو گئی۔ یہ وہی گلیاں تھیں جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ یہاں کی مٹی کی خوشبو میرے وجود میں بس رہی تھی۔ اپنے گاؤں کو دوبارہ دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بڑی سڑک پر جہاں لاری کا اڈا تھا وہاں بڑی رونق تھی۔ دکانوں میں رش تھا' ہوٹلوں کے باہر تھکے ہارے لوگ بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ تانگے' اور بیل گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ لاری کے اڈے پر رکتے ہی بابا بھی اٹھ گیا۔ میں نے اپنا تھیلا اور کادے نے ٹین کا بکسا اٹھا لیا۔ ہم لاری سے باہر آ کر تانگے کے اڈے کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے خود کو چادر میں اچھی طرح چھپا لیا تھا۔ میں کادے سے کہہ چکی تھی کہ وہ تانگے والے کو میرا پتا نہ بتائے بلکہ گھر سے کافی دور ہی اتر جائیں گے تاکہ ہماری واپسی کی خبر نہ پھیلے' مجھے ڈر تھا کہ اگر کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو وہ چوہدری نیاز کو ہمارے پہنچنے کی اطلاع کر دے گا۔ کادا میری بات سمجھ چکا تھا۔ ہم تانگے کے اڈے پر پہنچے تو میں نے کادے کو ایک تانگے کی طرف متوجہ کیا۔ وہ تانگے والا نیا تھا' یا کم از کم میں اسے نہیں جانتی تھی۔ کادے نے آگے بڑھ کر

اس سے بات کی اور ہم سامان لے کر تانگے میں سوار ہو گئے۔

تانگا جوں جوں میرے گھر سے قریب ہو رہا تھا۔ ویسے ویسے میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا چکی تھی۔ مجھے یہاں کی گلیوں میں بابا کے قدموں کی چاپ گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں تانگا اس گلی کے پاس رک گیا جہاں میں نے کادے کو روکنے کا اشارہ کیا تھا۔ کادے نے تانگے والے کو پیسے دیئے اور ہم وہاں اتر گئے۔ یہاں سے چوتھی گلی میں میرا گھر تھا۔ اس گلی کی طرف بڑھتے ہوئے میرے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ دن آنکھوں میں گھوم رہا تھا جب میں نے اور اماں نے پہلی بار اس گھر کو چھوڑا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ اس گلی سے حویلی کی طرف جاتے ہوئے اماں کتنی حسرت سے پلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی شاید اسے یقین تھا کہ اب وہ کبھی ان گلیوں میں واپس نہ آ سکے گی۔ میں آگے آگے تھی۔ کادا کملا اور بابا میرے پیچھے تھے۔ میں آگے بڑھتے ہوئے بہت محتاط تھی۔ چاروں طرف دیکھ کر اطمینان بھی کرتی جا رہی تھی کہ کہیں کوئی ہمیں دیکھ تو نہیں رہا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ پہلے میں خالہ فاطمہ کے گھر جاؤں گی۔ اپنے گھر جانے میں یہ خطرہ بھی تھا کہ محلے کے لوگوں کو فوراً ہی میری واپسی کی اطلاع مل جائے گی اور میں نہیں جانتی تھی کہ اس کا ردِ عمل کیا ہو گا؟ کون میرا ساتھ دے گا اور کون دوڑ کر چوہدری نیاز کو اطلاع کر دے گا۔ میں خالہ فاطمہ سے حالات جاننا چاہتی تھی۔ گلی میں داخل ہوتے ہی میری نگاہ اپنے گھر کے دروازے پر پڑی۔

کھمبے پر لگے بلب کی زرد اور بیمار سی روشنی یہاں تک پہنچنے میں ناکام رہی تھی۔ جس کی وجہ سے یہاں اندھیرا گہرا تھا اور اندر باہر گہرے سناٹے کو محسوس کر کے میرا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے مگر میں نے خود کو سنبھال لیا اور جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ خالہ فاطمہ کا گھر میرے گھر سے چھوٹا تھا' وہاں دروازے میں پڑا پرانا ٹاٹ کا پردہ اندر کی روشنی کی وجہ سے صاف نظر آ رہا تھا۔ دروازے کے پٹ بھی کھلے ہوئے تھے۔ میں اس دروازے پر جا کر رک گئی۔ کادا' بابا اور کملا' مجھ سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گئے۔ میں لرزتے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دینا چاہ رہی تھی مگر ٹھٹک کر رک گئی۔ اندر سے کسی لڑکے کے رونے کی آواز آ رہی تھی' پھر خالہ فاطمہ کی اداس آواز نے میری سماعتوں کو چیر کر رکھ دیا۔ وہ بچے کو ڈانٹ رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "کھوتے دے

پُتر! تُو کسی چوہدری کے گھر پیدا نہیں ہوا کہ تجھے دنیا بھر کی چیزیں لا کر دے دوں۔ دو وقت کی روٹی مل جاتی ہے' بس یہی کافی ہے' رب کا شکر کر کہ ابھی فاقہ نہیں پڑا۔ بڑا آیا۔"

تو بابا کیوں نہیں لیتا اپنا پیسا! اتی فصل پر یہ حصہ کم بنتا ہے۔" لڑکا چیخا۔

"آہستہ بول فیکے ..... آہستہ بول' اونچی آوازیں دور تک پہنچ جاتی ہیں۔ دیکھتا نہیں ان اونچی آوازوں نے کتنے گھر اجاڑ دیئے ہیں۔ چاچا حمید کا انجام نہیں دیکھا تُو نے؟" خالہ فاطمہ کی آواز میں بے پناہ خوف تھا۔ "اور ..... اور وہ گلام حسین!" اس کے ہونٹوں سے سسکی نکلی اور میں اندر داخل ہوتے ہوتے رک گئی۔ اس نے بابا کا نام لیا تھا۔ میرے قدم دروازے کے باہر ہی گڑ کر رہ گئے تھے۔ اس لمحے میں یہ بھی بھول چکی تھی کہ مجھ سے کچھ فاصلے پر کادا' بابا اور کملا میرے منتظر کھڑے ہیں' وہ اتنا لمبا سفر کر کے بہت تھک چکے ہوں گے۔

"اماں! ماجے کا پتا نہیں چلا؟" لڑکے نے سرگوشی کی۔

"نہیں تو چُپ کر فیکے ..... کچھ بھی نہ بولا کر' یہاں چپ رہنے والے اگلا سورج دیکھتے ہیں پُتر' بولنے والے نہیں۔" اور پھر اندر گہرا سناٹا چھا گیا۔

"خالہ!" میں نے چپکے سے ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر اسے پکارا۔

وہ دونوں میری جانب پشت کئے بیٹھے تھے۔ خالہ فاطمہ میری آواز پر چھل پڑی۔

"کون ..... کون ہے؟" اندر جلنے والی لالٹین کی روشنی کم تھی۔ اس نے آنکھیں چندھیا کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"خالہ ..... میں ....." اتنا کہہ کر میں چند قدم آگے بڑھ آئی۔

"توں ..... توں ....." پُتر زینو ..... توں۔" وہ مجھے دیکھ کر حیرت سے چیخ اٹھی۔ اس نے دونوں بازو پھیلا دیئے اور میری طرف لپکی۔

"آہستہ خالہ' اونچی آوازیں دور تک پہنچ جاتی ہیں۔" میں آگے بڑھتے ہوئے بولی اور بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ مجھے سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ خالہ کا پُتر رفیق بھی آنکھیں پھاڑے' منہ کھولے مجھے دیکھ رہا تھا۔ خالہ بہت دیر مجھے سینے سے بھینچے کھڑی روتی رہی پھر اس نے مجھے خود سے جدا کرتے ہوئے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"توں تو ..... بہت بڑی ہو گئی زینو! شکر ہے کہ توں زندہ ہے ورنہ میں سمجھی تھی

کہ....."

"مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے خالہ۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"پر تُو..... تُو آئی کیسے.....؟ کیوں آ گئی زینو' یہاں تو..... یہاں تو ہوا بھی تجھے تلاش کر رہی ہے۔ چوہدری کو پتا چل گیا تو....." وہ ایک دم دہشت زدہ ہو گئی۔

"انہوں نے ماجے کو پکڑ لیا ہے۔ تھانے میں ہے زینو! اس کا باپ....."

"مجھے پتا ہے کہ اس کا باپ اب دنیا میں نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

تجھے پتا ہے..... تجھے یہ بھی پتا ہے کہ ماجے کو انہوں نے کس جرم میں پکڑا ہے؟"

"ہاں..... اس نے میری جان بچائی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"اس نے صرف تیری جان ہی نہیں بچائی تھی بلکہ اس نے گولیاں چلا دیں تھیں۔ جب پولیس تجھے گرفتار کرنے پہنچی تو اس کے ساتھ چوہدری نیاز اور اس کا وڈا بھاء چوہدری فیاض بھی تھا۔ ماجے اور اس کے ساتھی دینو نے ان پر گولیاں برسا دیں تاکہ وہ پولیس کو روک سکیں اور توں پیچھے سے فرار ہو سکے۔ توں فرار ہو گئی اور..... ماجے کی گولی سے چوہدری فیاض بہت زخمی ہو گیا۔"

"کیا؟" میں چیخ اٹھی۔ "کون خالہ.....؟ کون زخمی ہو گیا؟"

"چوہدری نیاز کا وڈا بھاء چوہدری فیاض..... ہائے زینو! وہ تو بہت اچھا تھا۔"

میری آواز باہر پہنچ چکی تھی۔ کادا دروازے پر چلا آیا تھا۔ وہ مجھے آوازیں دے رہا تھا۔ مجھ سے پہلے ہی خالہ فاطمہ دروازے پر پہنچ گئی۔ "کون ہے توں؟" اس کی آواز دہشت سے پھٹ گئی تھی۔ شاید وہ اسے چوہدری کا ہی کوئی آدمی سمجھ رہی تھی۔

تب میں نے اسے بتایا کہ یہ لوگ میرے ساتھ ہیں پھر میں نے جلدی جلدی کمالے اور کادے کو چوہدری کے بارے میں بتایا۔ یہ خبر ان کے لئے بھی صدمے کا باعث تھی۔ وہ لوگ بھونچکے رہ گئے۔ خالہ یہ سن کر پریشان ہو گئی کہ یہ تینوں میرے ساتھ ہیں۔

"خالہ! تم پریشان نہ ہو۔ میں آج اپنا گھر کھولوں گی۔ آج میں یہاں چراغ جلاؤں گی خالہ! یہاں کے سارے اندھیرے ہمیشہ کے لئے مٹا دوں گی۔"

"نہیں۔" وہ بے چین ہو گئی۔ "یہاں روشنی نہ کرنا زینو..... چوہدری نیاز پورے گاؤں کو آگ لگا دے گا۔"

"کچھ نہیں ہو گا۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"زینو تُو کچھ بھی نہیں جانتی۔ تُو ایسا کر' ان لوگوں کو کرم داد کے گھر چھوڑ آ' معلوم ہے نا تجھے اس کا گھر؟"

"کون کرم داد خالہ؟" میں بھول گئی۔

"ارے وہ ماسٹر ہے' ہاں تُو تو تھی ہی نہیں' یہاں اسکول بنا تھا نا' کرم داد اس کا ماسٹر تھا' پر چوہدری نیاز نے اسکول پر تالا ڈال دیا اور اسے بھی بلا کر کہہ دیا کہ یہاں رہنا ہے تو خاموشی سے رہو۔ وہ فیکے کو چھپ کر پڑھاتا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ فیکے کی طرف پلٹی۔ فیکا اس کا بڑا بیٹا تھا' چھوٹا بیٹا تو چار برس کا تھا مگر یہ تو اونچے قد کا ہو گیا تھا۔ وہ فیکے سے بولی۔ "فیکے' ان لوگوں کو وہاں چھوڑ اور انہیں بتا دینا کہ میں آؤں گی تو سب بتاؤں گی' میں ان کے روٹی پانی کا بندوبست کر کے زینو کے ساتھ آ جاؤں گی۔" یہ سن کر فیکا کھڑا ہو گیا۔

میں نے کادے سے کہہ دیا کہ وہ لوگ وہاں جا کر آرام کریں۔ رات کو ہم دیکھیں گے کہ کیا کرنا چاہئے۔ بابا کھڑے کھڑے تھک چکا تھا۔ فیکا انہیں لے کر چلا گیا۔ میں خالہ فاطمہ کے پاس رہ گئی۔ ہم دونوں نے مل کر کادے وغیرہ کے لئے بھاجی اور روٹی تیار کی۔ روٹی تیار ہونے سے پہلے ہی فیکا لوٹ آیا۔ میں اس کے ساتھ اس ماسٹر کے گھر چل پڑی۔ میں نے روٹی بھاجی ساتھ لے لی تھی۔ میں چوہدری فیاض کے بارے میں سن کر بہت پریشان تھی۔ یہ تو میں جان گئی تھی کہ یہ بھی بس چوہدری نیاز کی کوئی چال ہے۔ اس نے خود یا کسی اور سے اس کو گولی کا نشانہ بنایا ہو گا تاکہ جو کچھ وہ جان گیا تھا اس کے ساتھ دفن ہو جائے اور کوئی بھی اس کے اصل چہرے کو نہ پہچان سکے مگر شاید وہ مرا نہیں تھا' بچ گیا تھا۔ اس کی موت میرے لئے ایک نیا عذاب ہوتی۔ میں اس کی زندگی کی دعائیں مانگنے لگی۔ ہم تیز رفتاری سے چلتے ہوئے اس ماسٹر کے گھر پہنچ گئے۔ وہ تیس پینتیس برس کا ایک سنجیدہ سا نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی سختی تھی جو عموماً اس عمر کے لوگوں کے چہروں پر نہیں ہوتی۔ وہ ہم سے بہت اچھی طرح ملا۔ وہ کادے اور بابا وغیرہ سے بھی کافی بے تکلف ہو چکا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ بھی چوہدری نیاز کے خلاف ہے۔ وہ چوہدری

نیاز سے نفرت کا کھل کر اظہار کر رہا تھا۔ میں کافی مطمئن ہو گئی۔ چوہدری فیاض کے زخمی ہو جانے کی اطلاع نے کادے، کمالے اور بابا کو بھی پریشان کر دیا تھا۔

"وہ کس اسپتال میں ہے یہ میں پتا کر لوں گا۔" اس ماسٹر نے ساری بات سن کر بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ لوگ کھانا کھائیں، میں حالات کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔

"ہم یہاں چوہدری فیاض کے کاندھے پر بندوق رکھ کر چلانے نہیں آئے ہیں۔ ہمیں جو کچھ بھی کرنا ہے، اپنے بل بوتے پر کرنا ہے۔" کمالے نے نوالا لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں! لیکن چوہدری فیاض، چوہدری نیاز کا سگا بھائی ہے، اس کی گواہی زینو کے بچاؤ کے لئے بہت اہم ہے۔" بابا نے جواب دیا۔

اس بات کو میں بھی سمجھ رہی تھی۔ میں جانتی تھی کہ چوہدری فیاض کو اگر کچھ ہو گیا تو چوہدری نیاز مجھے مجرم ثابت کر دے گا۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ جب فیاض نے اسے بتایا ہو گا کہ وہ اس کی تمام حرکتوں سے واقف ہو چکا ہے تو وہ خوف اور غصے سے پاگل ہو گیا ہو گا۔ تبھی اس نے اس پر گولی چلائی ہو گی یا اسے قتل کرانے کی کوشش کی ہو گی۔ چوہدری فیاض زندہ رہے یا مر جائے، وہ اب میری تلاش میں کوتاہی نہیں کرے گا۔ وہ کسی بھی حال میں مجھے قابو میں کرنا چاہے گا اور جگہ جگہ اپنے پالتو کتوں کو دوڑا دے گا، اور میں، میں تو اس کے اتنے قریب آ گئی تھی کہ اسے کہیں جانے کی ضرورت نہ ہی پڑتی۔

"زینو! تیرے لئے خطرہ بڑھ گیا ہے۔" اچانک کادا چونک اٹھا۔ "اسے اگر بھنک بھی مل گئی کہ تُو یہاں ہے تو اگر اسے سارے گاؤں والوں کی لاشیں گرانا پڑیں تو وہ گرا دے گا۔"

اس کے الفاظ نے میرا دم ہی نکال دیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں چپ چاپ ایک طرف بیٹھی سوچتی رہی کہ اب حالات کون سا رخ اختیار کریں گے۔ مجھے آخر کیا کرنا ہے، بابا، کادا اور کمالا بھی یہی کچھ سوچ رہے تھے اور ایک دوسرے سے مشورے لے رہے تھے۔ مجھے دینو اور ماجے کی بھی بڑی فکر تھی۔ جانے وہ لوگ کہاں ہوں گے اور کس حال میں ہوں گے۔ ابھی کادے وغیرہ نے روٹی ختم ہی کی تھی کہ وہ ماسٹر آ گیا۔ اس کے چہرے

پر اطمینان تھا۔

"اس کا بیٹا اسے شہر لے گیا مگر شاید وہ بچ نہ سکے، وہ ابھی تک بے ہوش ہے، گولی اس کے سینے میں لگی ہے، مگر دل کی طرف نہیں پھر بھی خطرہ بہت ہے۔" میرا دل دھڑک اٹھا۔ "چوہدری نیاز کافی خوش ہے لیکن خود کو بے حد پریشان ظاہر کر رہا ہے کہ اس کا بھائی زخمی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی شہر روانہ ہو جائے گا۔"

"ماسٹر جی! دینو اور ماجا بے قصور ہیں۔ چوہدری نیاز تو انہیں دس بارہ روز پہلے اغوا کر چکا ہے۔" میں نے کہا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے چپ کرا دیا۔

"میں جانتا ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ چوہدری فیاض یہاں آنے سے پہلے کادے کی پھوپی کے گھر آپ سے ملنے گیا تھا۔" اس نے گھمبیر لہجے میں کہا تو ہم سب ہی چونک اٹھے۔

"تم..... تم کیسے جانتے ہو؟" کادے نے چونک کر اسے دیکھا۔

لمحہ بھر کو مجھے لگا جیسے وہ چوہدری نیاز کا آدمی ہو۔ میں دھیرے سے پیچھے کی طرف سرک گئی۔ اسی لمحے اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

"آپ غلط مت سمجھیں۔" اس نے یوں کہا جیسے میرے ذہن میں جھانک لیا ہو۔ اب بابا، کمالا اور کادا بھی چوکنے ہو گئے تھے۔ فیکا جو میرے ساتھ آیا تھا اور فاطمہ خالہ نے اس سے کہا تھا کہ وہ مجھے لے کر ہی آئے، وہ بھی ایک طرف بیٹھا حیرت سے اس ماسٹر کو دیکھ رہا تھا۔

"میں آپ کا دوست ہوں۔ آپ گھبرائیں نہیں۔" اس نے باری باری ہم سب پر نگاہ ڈال کر کہا۔ "میں ہر حال میں آپ کی مدد کروں گا۔"

"پر تم ہو کون؟" میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"میں .....! میں نے کہا نا کہ میں آپ سب کا دوست ہوں۔ آپ لوگ میرے بارے میں سوچنے کی بجائے یہ سوچیں کہ اب کیا کرنا ہے؟ جب تک آپ یہاں ہیں، یہ میرا وعدہ ہے کہ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں جانتا ہوں کہ زینو بے قصور ہے۔ چوہدری فیاض مجھے سب کچھ بتا چکے ہیں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ میں آپ کی مدد کروں گا۔"

میں حیرت سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جو میرا کوئی بھی نہیں تھا اور میری مدد کرنے کو کہہ رہا تھا۔ نہ معلوم اس کی شخصیت اور لہجے میں کیا بات تھی کہ میرا دل اطمینان سے بھر گیا۔

"اب آپ جایئے۔" اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ میں نے کادے اور بابا کی طرف دیکھا۔ کادے نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "چل میں تجھے پہنچا دوں۔" پھر میں فیکا' اور کادا وہاں سے نکل آئے۔ میں نے خود کو چادر میں اچھی طرح لپیٹ لیا تھا۔ کادے نے باہر نکلتے ہی رفتار تیز کر دی۔ میں کادے سے بہت باتیں کرنا چاہتی تھی مگر راستے میں اس سے بات کرنا خطرناک بھی ہو سکتا تھا اس لئے میں خاموشی سے چلتی رہی۔ کادا بڑے چوکنے انداز میں چل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آگے پیچھے دائیں بائیں نظر رکھے ہوئے تھیں۔ باہر اندھیرا گہرا تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ اتنی ویرانی ہوتی بلکہ اس وقت تو اکثر لوگ گھروں کے باہر منجھیاں ڈالے گپیں لڑایا کرتے تھے مگر شاید چوہدری فیاض کے زخمی ہونے' ماجے اور دینو کے پکڑے جانے کی خبر پھیل چکی تھی جبھی پورے گاؤں پر ایک خوف سا طاری تھا۔ لوگ سرِ شام ہی گھروں میں دبک گئے تھے۔

ہم کچھ ہی دیر بعد خالہ فاطمہ کے گھر پہنچ گئے۔ خالہ فاطمہ بڑی بے چینی سے میری منتظر تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے جلدی سے مجھے کھینچ لیا اور کادے سے بولی۔ "جا' توں جلدی چلا جا۔" یہ کہتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔ میں ساکت کھڑی رہ گئی۔ خالہ فاطمہ بہت خوفزدہ لگ رہی تھی۔ وہ مجھے ہاتھ پکڑ کر کوٹھڑی میں لے گئی۔

"کیا بات ہے خالہ؟" میں نے اس کے چہرے کو ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

"زینو! میں ..... مجھے ڈر لگ رہا ہے' اگر چوہدری فیاض مر گیا تو ..... وہ تجھے زندہ نہیں چھوڑے گا اور تُو تو خود چل کر موت کے منہ میں آ گئی ہے۔"

"بس خالہ! اتنی سی بات ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "خالہ دیکھو! جو بھی آدمی کے مقدر میں ہوتا ہے ناں وہی ہوتا ہے۔ اگر میری موت آنی ہے تو وہ ضرور آئے گی۔ ممکن ہے خدا مجھے یہاں اسی لئے لایا ہو کہ مجھے یہاں ہی مرنا ہے اور چوہدری نیاز کے ہاتھوں ہی مرنا ہے لیکن اگر میری موت ابھی نہیں لکھی تو میں نہیں مروں گی۔ یہ

بھی تو ہو سکتا ہے کہ خدا چوہدری نیاز کی رسّی کھینچ رہا ہو۔"

"ٹھیک ہے پر تجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔" وہ اب بھی خوفزدہ تھی۔

"خالہ اگر تُو اس لئے خوف زدہ ہے کہ وہ تجھے بھی ....."

"نہیں ....." اس نے میری بات کاٹ دی۔ "میں اس لئے نہیں بلکہ اس لئے خوفزدہ ہوں کہ تجھے کچھ نہ ہو جائے۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوتا خالہ' مجھے اپنے خدا پر بھروسہ ہے۔ میں بے قصور ہوں' یہ بات میرا خدا جانتا ہے۔" میں نے منجھی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ خالہ فاطمہ اس بات پر کچھ نہ بولی اور اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے خود کو منجھی پر گرا لیا۔ کچھ دیر بعد وہ لوٹی تو اس کے ہاتھ میں روٹی اور بھاجی تھی۔ ہم نے کھانا کھایا۔ کھانا کھا کر ہم وہیں ایک ہی منجھی پر لیٹ گئے۔ خالہ فاطمہ اپنے چھوٹے بیٹے کو سلا چکی تھی۔ فیکا باہر جا کر لیٹ گیا تب خالہ فاطمہ میری ماں کی باتیں کرنے لگیں۔ میں نے اسے اس روز سے' جب ہمیں چوہدری اور سونیا آ کر لے گئے تھے اور آخر جب میں وہاں سے بھاگی تھی' ایک ایک بات بتا دی۔ وہ سنتی جا رہی تھی اور روتی جا رہی تھی وہ میری ماں سے بے پناہ پیار کرتی تھی' اس کا مجھے خوب اندازہ تھا۔

اسی داستان میں جانے کتنا وقت بیت گیا۔ باہر جھینگروں کے بولنے کی آواز تیز ہو گئی تھی۔ فیکا غالباً سو چکا تھا۔ سارا گاؤں ہی گہرے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا مگر میری اور خالہ فاطمہ کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ مجھے تو یہ محسوس کر کے کہ میرے گھر اور اس گھر کے بیچ صرف چند قدم کا فاصلہ ہے' کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

جی چاہ رہا تھا کہ اٹھوں اور جا کر اپنے گھر کے وہ دروازے جو اماں نے بند کئے تھے' کھول دوں' گھر میں دیئے روشن کر دوں اور چیخ چیخ کر لوگوں کو جگا دوں کہ دیکھو میں واپس آ گئی ہوں۔ میں نے اس گھر کو آباد دیا ہے۔ یہاں کے وہ چراغ جو چوہدری نیاز نے گل کر دیئے تھے روشن کر دیئے ہیں مگر ابھی میں ایسا کرنے سے قاصر تھی پھر بھی میرا جی چاہا کہ میں اپنے گھر جاؤں۔ میں نے خالہ فاطمہ سے اپنی خواہش بیان کی تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"جانے کو چلی جا زینو! پر مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"اب تو اتنی رات ہو گئی ہے۔ سب سو چکے ہوں گے خالہ! میں جب تک اپنے گھر میں قدم نہیں رکھوں گی' جب تک دیواروں کو نہیں چھوؤں مجھے نیند نہیں آئے گی۔"

میں نے بھیگی ہوئی آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"چابی ہے تیرے پاس؟"

"ہاں..... یہ رہی۔" میں نے دوپٹے کے پلو میں بندھی چابی کو اس کے سا جھلایا۔

"چل ..... میں بھی چلتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پر یہاں کاکا اور فیکا اکیلا ہے۔"

"باہر سے کنڈی مار دیں گے۔ چل تُو لالٹین لے لے۔"

میں اور خالہ دونوں کھڑے ہو گئے۔ میں نے لالٹین کی بتی نیچی کر لی اور دروازہ کی طرف بڑھی۔

"زینو!" خالہ نے لپک کر مجھے پکڑ لیا۔ "اسے گل کر دے۔ باہر اگر کسی نے دیکھ تو.....؟"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ روشنی ساتھ ہونے کی وجہ سے ہم کسی کی نگاہوں میں سکتے تھے۔ میں نے بتی گل کر دی۔ خالہ فاطمہ نے ماچس کی ڈبی ساتھ لے لی تاکہ وہاں جا بتی جلائی جا سکے۔ ہم وہاں سے دبے پاؤں باہر آ گئے۔ باہر سخت حبس تھا' برسات کا مو شروع ہو چکا تھا مگر ابھی برسات نہیں ہوئی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ گ سنسان پڑی تھی۔ میں باہر آ گئی تو خالہ نے پلٹ کر در بند کئے اور اوپر کی کنڈی چڑھا دی ہم دبے پاؤں' چاروں طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھے' میں تو دیوار سے لگی ہوئی آگے بڑ رہی تھی۔ میرے گھر کے بالکل سامنے چاچا عبدل کا گھر تھا۔ اس کے گھر کی ایک چھوٹی کھڑکی سے ہلکی روشنی باہر آ رہی تھی ورنہ پوری گلی ہی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی وہاں روشنی دیکھ کر میں اور خالہ دونوں ہی دبک گئے تھے پھر ہم بلی کی طرح پاؤں اٹھا ہوئے آگے بڑھے۔ اب میرے گھر کا دروازہ صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں دوپٹے کے پلو میں بندھی چابی ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ خالہ میرے پیچھے تھیں' میں دروازے کو ہاتھ لگایا۔ اس میں اب بھی وہی تالا پڑا تھا جو اماں اپنے ہاتھوں سے ڈال کر گئ تھی۔ اسے چھوتے ہی میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں نے اندھیرے ہی میں اس کا سوراخ ٹٹول کر چابی لگا دی۔ ایک ہلکے کھٹکے کی آواز آئی مگر تالا نہ کھلا شاید اس میں زنگ

لگ گیا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسے اپنی جانب گھسیٹا پھر بھی وہ نہ کھلا۔ خالہ فاطمہ جلدی کر رہی تھی' میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئی تھیں اور تالا کھل ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے پھر چابی سوراخ میں ڈال کر گھمائی۔ اس بار تالا ایک کھٹکے سے کھل گیا۔ اس کی آواز دور تک گونجتی محسوس ہوئی۔ میں اور خالہ دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ چند لمحے یونہی کھڑے رہنے کے بعد میں نے آہستہ آہستہ کنڈی کھولی۔ یہ چند لمحے ایک صدی بن کر گزرے' یہ خوف مجھے خالہ فاطمہ نے دلایا تھا کہ یہاں حالات ایسے ہو چکے ہیں کو چوہدری نیاز کے آدمی گاؤں میں گشت کر رہے ہیں ورنہ میں کبھی اتنا خوف محسوس نہیں کرتی۔

بہرحال دروازہ کھلتے ہی میں جلدی سے اندر داخل ہو گئی۔ خالہ فاطمہ نے بھی اندر داخل ہو کر جلدی سے دروازہ بھیڑ دیا۔ میں نے کہا کہ کنڈی لگا لیں مگر کنڈی ٹوٹی ہوئی تھی اس لئے دروازے کو اندر سے بند کرنا ممکن نہ تھا۔ میں نے دروازے کے دونوں پٹ بھیڑ دیئے۔ اتنی دیر میں خالہ بتی روشن کر چکی تھی۔ میں پلٹی تو آنگن میں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ گھر ویسا ہی تھا جیسا ہم چھوڑ کر گئے تھے۔ جس منجھی پر بابا کی میت رکھی گئی تھی' وہ اب بھی بیچ آنگن میں پڑی تھی۔ جہاں بابا کو غسل دیا تھا وہاں بالٹی' مگا اور ایک لکڑی کا لمبا تختہ بھی پڑا تھا۔ چولہے کے پاس ہانڈی گری ہوئی تھی۔ میں ایک ایک چیز کو حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ بے پناہ برداشت کرنے کے باوجود میرے آنسو بہہ کر رخساروں تک آ گئے۔ میں منہ کو ہاتھوں سے دبائے ہلکے قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی۔ خالہ فاطمہ بھی رو رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے اماں ابھی ابھی کوٹھڑی میں گئی ہے اور ابھی نکل آئے گی' پھر کہے گی۔ "زینو! تُو ابھی تک یونہی کھڑی ہے۔ جلدی کر' چولہا جلا کر ہانڈی چڑھا دے۔ تیرا بابا آنے والا ہو گا۔" اور میرا جی چاہا کہ ان دیواروں سے اپنا سر پھوڑ لوں۔ وہاں بابا اور اماں کا سایہ تک نہ تھا۔ میں نے کوٹھڑی کے بند دروازے کو دھکا دیا تو وہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ اندر بھی سب کچھ ویسا ہی تھا۔ میری آنکھوں میں وہ آخری رات گھوم گئی۔ یہاں ایک طرف بچھی دری پر میں اماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹی ہوئی تھی اور ہم سے کچھ فاصلے پر خالہ فاطمہ اپنے بیٹے کو گود میں لئے بیٹھی اماں کو تک رہی تھی۔ مجھے یاد تھا کہ اس روز اماں کتنی ڈری ہوئی تھی۔ اسے خوف تھا کہ چوہدری

نیاز بابا کی طرح مجھے بھی اس سے چھین لے گا۔ وہ میرے ہاتھوں کو سختی سے پکڑے ہوئے تھی' پھر جب سونیا اندر آئی تھی تو اس کا رنگ سفید ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے خود سے بھینچ لیا تھا۔

میں دھیرے سے اس دری پر' اسی جگہ بیٹھ گئی جہاں اماں بیٹھی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ خالہ فاطمہ بھی مسلسل رو رہی تھی۔ میں چند لمحے یونہی بیٹھی رہی پھر آنکھیں بند کر کے اس دری پر لیٹ گئی یوں جیسے اماں کو گود میں سر رکھے لیٹی ہوں۔ بند آنکھوں میں اماں کا چہرہ میرے قریب آتا محسوس ہوا پھر مجھے یوں لگا جیسے اماں نے اپنے ہونٹ میری پیشانی پر رکھ دیئے ہوں۔ میں بے اختیار سسک اٹھی۔

"زینو!" مجھے سرگوشی سنائی دی۔ لگا جیسے اماں نے مجھے آواز دی ہو۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ خالہ فاطمہ میرے چہرے پر جھکی مجھے پکار رہی تھی۔

"چل زینو! یہاں تو بس دکھ ہی دکھ ہے۔ لگتا ہے میراں اور گلام حسین ابھی تک رو رہے ہیں۔ میرا ..... میرا تو کلیجہ پھٹ جائے گا۔ زینو..... میں ایک دفعہ آئی تھی یہاں کہ ..... کہ گھر کی صفائی کر دوں پر گھبرا کر واپس چلی گئی تھی۔ ان دونوں کی روحیں بھٹکتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں مجھے۔"

وہ رو رہی تھی اور میں اسے تکے جا رہی تھی۔ "خالہ .....!" میں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر کہا۔ "کتنی ویرانی ہے یہاں پر میں ..... میں یہ ویرانی اس روز ختم دوں گی جب چوہدری نیاز کو موت کے گھاٹ اتار دوں گی۔ ہاں خالہ میں ..... میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ نہیں چھوڑوں گی اسے ....." میں جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

"جھلی نہ بن زینو! چپ چاپ یہاں سے چلی جا۔ تیرا یہاں رہنا کھترناک ہے زینو!"

"میرا تو کہیں بھی رہنا خطرناک ہو گیا ہے خالہ' ایسی زندگی سے کیا فائدہ جو آدمی چھپ چھپ کر زندہ رہے' ہر وقت خوفزدہ رہے۔ میں ایسے زندگی نہیں گزار سکتی۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا خالہ' یہی نا کہ مجھے پولیس پکڑ لے گی یا چوہدری نیاز کے کتے پکڑ لیں گے! سوچ خالہ تب مجھے جو بھی سزا ملے گی وہ ان گناہوں کی ہو گی جو میں نے نہیں کئے اور اگر میں چوہدری نیاز کو مار دوں گی تو ..... میں ہر سزا خوشی سے جھیلوں گی خالہ ..... مجھے چین آ جائے گا۔"

"زینو! چل اٹھ ..... چل گھر چل' یہاں بیٹھی رہے گی تو ایسی ہی باتیں کرتی رہے گی۔"

اس نے میرے بازو میں اپنا ہاتھ ڈالا۔ عین اسی لمحے دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی۔ میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ باہر کے دروازے پر کوئی تھا۔ کوئی اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خالہ فاطمہ نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر بتی بجھا دی اور میں کوٹھڑی کے دروازے کی آڑ میں ہو گئی۔ میرا دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر خالہ فاطمہ کو دیکھا۔ وہ مجھے سائے کی طرح دیوار سے چمٹی نظر آئی۔ کوٹھڑی میں کافی اندھیرا ہو گیا تھا۔ کہیں سے روشنی کی ایک کرن بھی اندر نہیں آ رہی تھی۔ میں بھی دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور میں نے ٹٹول کر خالہ فاطمہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ دبا کر اسے پُرسکون رہنے کو کہا مگر میں خود بھی بہت بے چین تھی۔ کوئی دروازے کو بہت ہلکے ہلکے جھٹکے دے رہا تھا۔ میں اور خالہ فاطمہ دیوار کے ساتھ لگے لگے نیچے بیٹھ گئے۔ یہاں سے میں دروازے نظر رکھ سکتی تھی' باہر آسمان پر چھائے بادلوں کے باوجود ہلکی سی روشنی تھی' شاید گلی کے باہر لگے بلب کی روشنی نے اپنے چاروں طرف کے اندھیرے کو ہلکا کر دیا تھا یا شاید ہماری ہی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ میں حیرت زدہ سی سوچ رہی تھی کہ آنے والا کون ہے؟ پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ شاید ہوا چل پڑی ہے جس نے دروازے کو ہلا دیا ہے مگر مسلسل اور کبھی ہلکے اور کبھی زور سے لگنے والے جھٹکے بتا رہے تھے کہ کوئی دروازے کو کھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اچانک دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ دروازے کی چوکھٹ میں ایک لمبا چوڑا سایہ کھڑا تھا۔ اس نے سر پر پگڑی باندھی ہوئی تھی مگر اس کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون ہے؟ آنے والے نے جلدی سے اندر آ کر دروازہ بھیڑ دیا۔ وہ کچھ خوفزدہ سا لگ رہا تھا۔ میں اور خالہ فاطمہ دم بخود بیٹھے اسے دبے پاؤں آنگن میں گھومتا دیکھ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں شاید ٹارچ تھی اس لئے کہ اب اس کے آگے آگے روشنی کا گول دائرہ کوٹھڑی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ خالہ فاطمہ اب بری طرح کانپنے لگی تھی۔ میں نے سر گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ یہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہ تھی اور آنے والا بس کوٹھڑی میں داخل ہونے ہی والا تھا۔ تبھی اچانک مجھے بستروں اور تکیوں کے اس ڈھیر کا خیال آ گیا جو

اسی کوٹھری میں بالکل کونے میں پڑا تھا۔ میں نے خالہ فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کر اسی طرف گھسیٹا۔ ہم بیٹھے بیٹھے اس کونے کی طرف بڑھنے لگے۔ ابھی ہم ڈھیر کے قریب پہنچے ہی تھے کہ اچانک روشنی کا وہ دائرہ رینگتا ہوا کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ میں اور خالہ فاطمہ بیچ کوٹھڑی میں' فرش پر بیٹھے تھے اور وہ سایہ دروازے میں کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر بے اختیار میرے اور خالہ فاطمہ کے منہ سے ہلکی چیخ نکل گئی اور اس کے ساتھ ہی روشنی کا دائرہ ہمارے چہروں پر آ کر رک گیا۔

☆=========☆=========☆

"زے ..... زینو ..... تُو .....؟"

ایک مانوس سی آواز سنائی دی' میں دم بخود وہیں فرش پر بیٹھی تھی۔ اچانک اس کی آواز سن کر خالہ فاطمہ نے مجھے دونوں بازوؤں میں بھر لیا۔ میں آواز نہیں پہچانی تھی مگر یوں لگتا تھا جیسے میں یہ آواز اب سے پہلے بھی سن چکی ہوں۔ دماغ میں جیسے گھنٹیاں سی بجنے لگی تھیں۔ میں پیچھے سرکنے لگی' روشنی کا دائرہ آگے بڑھ رہا تھا' پھر مجھے لگا جیسے وہ شخص رو رہا ہے۔ اس کی سسکیاں آہستہ آہستہ تیز ہو رہی تھیں۔

"کک ..... کون ہے تُو .....؟ اسے ہاتھ نہ لگانا۔" خالہ فاطمہ اب میرے سامنے بپھر کر کھڑی ہو چکی تھی۔ اس کی آواز کانپ ضرور تھی مگر اس میں ایک عجیب سی بے خوفی بھی تھی جیسے وہ اچانک ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئی ہو۔ "یہ..... یہ میراں کی دھی ہے ..... اور میراں کی دھی کو ہاتھ لگانے سے پہلے سوچ لینا کہ ابھی اس کی خالہ فاطمہ زندہ ہے۔" وہ پھر گرجی۔

اسی لمحے ٹارچ کی روشنی کا دائرہ جھک گیا۔ باہر سے آتی روشنی میں' میں نے اس شخص کو گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھتے اور پھر زمین کی طرف جھکتے دیکھا۔ ٹارچ اب بھی روشن تھی مگر اب وہ فرش پر پڑی تھی۔ میں اب بھی خوفزدہ نگاہوں سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جو دروازے کے قریب زمین پر جھکا ہوا تھا پھر اچانک ہی وہ رونے لگا۔ اس کی آواز آہستہ آہستہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں اور خالہ فاطمہ ایک دوسرے کو مضبوطی سے پکڑے حیرت سے اسے تک رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون ہے جو یوں اندھیرے میں چوروں کی طرح گھر میں داخل ہوا اور اب یہاں بیٹھا رو رہا ہے۔ اسی وقت خالہ فاطمہ نے میرا بازو چھوڑ دیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ میں بھی اس کے پیچھے سرکنے لگی۔ خالہ فاطمہ نے آہستہ سے ہاتھ ٹارچ کی طرف بڑھایا۔ اسی لمحے اس

شخص کے ہیولے میں حرکت ہوئی اور پھر ایک چیخ میرا اور سناٹے کا سینہ چیرتی چلی گئی۔

"آپاں....." وہ کربناک انداز میں چیخا تھا۔ میں اور خالہ فاطمہ اچھل پڑے۔

"ماما..... ماما.....؟" میں تڑپ کر آگے بڑھی۔ اب مجھے یاد آگیا کہ یہ آواز مانوس سی کیوں لگی تھی۔ وہ ماما تھا۔ میں تڑپ کر اس سے لپٹ گئی۔ اس نے مجھے سینے سے بھینچ لیا۔ میرے اندر کا سارا طوفان جیسے آنکھوں میں سمٹ آیا۔ "ماما....." میں اس کا چہرہ تھام کر رو پڑی۔

خالہ فاطمہ بھاگ کر لالٹین اٹھا لائی۔ ماچس اسی کے پاس تھی۔ اس نے جلدی سے لالٹین جلائی۔ میں اور ماما ایک دوسرے سے لپٹے بری طرح رو رہے تھے۔ اس وقت میرے دل میں کوئی خوف نہ تھا کہ اتنی رات گئے لوگ ہمارے رونے کی آواز سن کر چوہدری نیاز کو اطلاع دے سکتے ہیں۔ خالہ فاطمہ نے جلدی سے لالٹین رکھ دی اور لپک کر ہم دونوں کے پاس چلی آئی۔

"چپ کر جا..... چپ کر' زینو تُو چپ کر جا..... چوہدری نیاز کے آدمی پورے گاؤں میں بکھرے ہیں۔ چپ کر جا....." اس نے دانت کچکچا کر میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں سسکیاں بھرتی رہی اور ماما کی ہچکی بندھ گئی۔

"زینو..... پُتر مجھے معاف کر دے..... معاف کر دے مجھے ورنہ آپاں قیامت کے روز میرا گریبان پکڑے گی۔ میں اندھا ہو گیا تھا پُتر.....! تُو..... تُو کیا کرتی رہی ہو گی زینو..... کیسا ظلم کیا ہے میں نے تجھ پر.....! رب مجھے معاف کر دے۔" وہ ایک بار پھر تڑپ کر رو دیا۔

اب خالہ فاطمہ بھاگ کر باہر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو خاصی بوکھلائی ہوئی تھی۔

"اٹھو تم لوگ..... جلدی کرو..... یہاں کھترا ہے۔" اس نے میری بغل میں ہاتھ ڈال کر مجھے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"چپ کر جا ماما..... جو قسمت میں تھا وہ ہو گیا..... اب رونے سے اماں واپس تو نہیں آئے گی نا!" میں نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھ کر کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانے لگی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ میں ٹارچ اٹھا چکی تھی۔ خالہ فاطمہ

ہم سے آگے نکل کر دروازے تک پہنچ گئی۔ اس نے دروازے سے باہر جھانکا پھر ہمیں باہر آنے کا اشارہ کر کے خود باہر چلی گئی۔ میں ماما کو سہارا دیے ہوئے تھی۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ وہ جو مضبوط بدن کا لمبا چوڑا آدمی تھا اس وقت مجھے بہت کمزور لگا۔ اس روز جب میں نے اسے کاکے کے ساتھ ہوٹل کی بینچوں پر بیٹھا دیکھا تھا تو بھی وہ کسی پہلوان سے کم نہیں لگا تھا مگر اس وقت جو آدمی میرے ساتھ تھا وہ لمبا' پتلا' نحیف اور لاغر تھا۔ میں ماما کو سہارا دیے خالہ فاطمہ کے گھر لے آئی۔ خالہ نے جلدی سے منجھی پر دری بچھائی اور میں نے ماما کو وہیں بٹھا دیا۔ یہاں روشنی میں ماما کی صورت دیکھ کر میں دل تھام کر رہ گئی۔ وہ برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی' آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے' سانس پھولی ہوئی تھی اور اندر دھنسی آنکھوں میں غضب کی وحشت بھری تھی۔ وہ اب بھی مجھے دیوانوں کی طرح دیکھ رہا تھا اور بار بار میرے ہاتھوں کو پکڑ کر چوم رہا تھا۔ میں اس کی حالت دیکھ کر برداشت نہیں کر پائی اور رو دی۔

"نہ..... نہ پُتر! اب نہ رو..... اب میں تجھے نہیں رونے دوں گا۔ میں آگیا ہوں ناں..... اب نہ رونا۔" وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

"پرا! تُو نے زینو کو کم دکھ نہیں دیا۔ اب یہ یتیم بچی تو تیرے سے پناہ مانگنے گئی تھی ناں۔ تُو نے چوہدری نیاز کی باتوں کا اعتبار کر لیا اور بچی سے پوچھا بھی نہیں کہ اس پر کیا بیتی ہے۔"

خالہ فاطمہ نے دل کے پھپھولے پھوڑ ہی لئے حالانکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس وقت ماما سے کوئی ایسی بات کی جائے جو اس کا دل دکھا دے۔ اس کی حالت دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے اپنے کیے پر بڑا پچھتاوا ہے۔ میں جانتی تھی کہ اسے میری ماں سے کتنا پیار تھا۔ جانے چوہدری نیاز اور اس کے آدمیوں نے اس سے ایسی کیا بات کی تھی کہ وہ اس وقت میرے خلاف ہو گیا تھا۔ خالہ فاطمہ کی بات سن کر اس نے جن نگاہوں سے اسے دیکھا وہ دل چیرنے کو کافی تھا۔

"نہیں خالہ! ایسی بات نہ کر..... جانے چوہدری نے اسے کیا بتایا تھا پر میں جانتی تھی کہ ماما کو ایک روز ضرور احساس ہو جائے گا کہ وہ غلطی پر تھا۔ وہ جان جائے گا کہ اس سے جھوٹ بولا گیا ہے۔"

میں نے جلدی سے اس کے دونوں ہاتھوں کو تھامتے ہوئے کہا اور اس کی نگاہیں تشکر سے بھر گئیں۔

"میں..... میں اندھا ہو گیا تھا پُتر..... انھوں نے باتیں ہی ایسی کی تھیں۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا وہ پاگل ہو جاتا۔ اس نے کہا تھا کہ بھائی غلام حسین تیری ماں سے دھندا کروانا چاہتا تھا' جب وہ اس سے بھاگ کر حویلی میں جا چھپی اور اس نے زمیندار سے شکایت کر دی اور بڑے زمیندار نے غلام حسین کو سخت سست کہا اور گاؤں سے نکالنے کی دھمکی دی تو اس نے اسے قتل کر دیا' پھر اس نے تجھ سے وہی گھناؤنا کاروبار کرانا شروع کر دیا جس پر بڑی زمیندارنی تجھے زبردستی اپنے گھر لے گئی۔ اس وقت پولیس کو پتا چل چکا تھا کہ بڑے زمیندار کو اس نے قتل کیا ہے۔ اسے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ تو اس بات پر بھی غصے میں تھی پر چھوٹی تھی اس لیے کچھ نہ کر سکی مگر پھر بھی چوہدری نیاز اور اس کی بیوی نے تجھ سے اپنے بچوں جیسا سلوک کیا تیرا ہر طرح سے خیال رکھا مگر تجھے حرام کھانے کی عادت پڑ گئی تھی۔ تو چوریاں کرنے لگی تھی۔ تو نے چوہدری نیاز پر ڈورے ڈالے اور اسے دعوتِ گناہ دی جس پر اس کی بیوی نے تجھے بڑی زمیندارنی کے پاس لا چھوڑا اور تیرے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی۔ تو نے آپا کا جینا حرام کر دیا تھا' وہ تجھے مرنے کی بددعا دیتی رہی اور رفتہ رفتہ بیمار ہو گئی۔ پھر ایک روز موقع پا کر تو بڑی زمیندارنی کو قتل کر کے اس کا زیور چرا کر بھاگ نکلی۔ آپاں سے یہ صدمہ برداشت نہ ہو سکا اور وہ تجھے کوستے کوستے مر گئی۔"

ماما جو کچھ بتا رہا تھا وہ گرم گرم سیسے کی طرح میرے کانوں میں اترتا جا رہا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ چوہدری نیاز اتنا بھی گر سکتا ہے۔ واقعی یہ باتیں ایسی تھیں کہ کوئی بھی شریف آدمی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اگر مجھے مارنے کے لیے پھر رہا تھا' تو یہ غلط نہیں تھا غلط تو صرف اتنا ہوا تھا کہ اس نے مجھ سے مل کر ان باتوں کی تصدیق نہیں کی تھی۔ اس کا خون گرم تھا' یہ میں جانتی تھی' وہ تو اتنی بات سن کر ہی غصے سے پاگل ہو گیا ہو گا۔ یہ ہوش ہی نہ رہا ہو گا کہ وہ ان باتوں کی تصدیق بھی کرتا۔ اسے یوں بلک بلک کر روتا دیکھ کر میں بھی اس کے ساتھ رو رہی تھی۔ اس کی بے بسی میرا دل چیرے دے رہی تھی۔

"پھر اب کیسے پتا لگا؟" خالہ فاطمہ نے کہا۔ "کیا تو میرے پاس نہیں آسکتا تھا۔ میں زینو کو بچپن سے جانتی تھی۔ میراں تو میری بہن بنی ہوئی تھی' دن رات ہم ساتھ رہتے تھے۔ مجھ سے تو نے آکر پوچھا تو ہوتا۔" وہ اب بھی غصے میں تھی۔ اسے ماما کی حالت پر ذرا بھی ترس نہیں آرہا تھا۔

"عقل پر پتھر پڑ گئے تھے میری۔ اندھا ہو گیا تھا یہ سن کر کہ میری آپاں مجھ سے ملے بغیر چلی گئی۔ میں اس کی صورت بھی نہ دیکھ سکا..... ان دنوں فیصل آباد کی مل میں نوکری مل گئی تھی مجھے..... وہاں سے چھٹی ہی نہ ملتی تھی' ایک دو روز کی چھٹی ملتی تھی تو بیوی بچے دیکھ آتا تھا۔ یہاں آنے کا سوچتا ہی رہ گیا..... پھر' جب آپاں کا مجھے پتا لگا تو..... تو میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ رب نے مجھے بچا لیا آپاں جی ورنہ..... ورنہ میں تو زینو کو بے گناہ ہی مار دیتا..... مجھے معاف کر دینا زینو!..... مجھے پتا لگا تھا کہ تو آئی تھی۔ مجھے تیری مامی نے بتایا تھا..... جب اس نے بتایا کہ وہ تجھ سے ملی ہے تو..... تو میں نے اسے بہت مارا تھا' پھر کچھ روز بعد ہی مجھے فیاض چوہدری مل گیا۔ وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا آیا تھا۔ اس سے حقیقت کا پتا لگا..... وہ تو چلا گیا اور میں..... میں تو جیسے انگاروں پر جلتا رہا۔ میں نے تجھے تلاش کرنے کی بڑی کوشش کی پر..... کچھ پتا ہی نہ لگا۔ کل تیری مامی نے کہا کہ میں گاؤں جا کر دیکھوں' یہاں آیا تو پتا لگا کہ چوہدری فیاض مارا گیا۔ میں نے چوہدری نیاز کو ظاہر نہ کیا کہ میں حقیقت جان چکا ہوں میں جان گیا تھا کہ اس نے چوہدری فیاض کو کیوں مروا دیا۔ وہ بہت غصے میں تھا۔ وہ چوہدری نیاز کو اس کے کئے کی سزا دینا چاہتا تھا۔ وہ تجھے بھی تلاش کر رہا تھا تاکہ تیری مدد کرے۔ میں تو تیرے گھر اس لیے آیا تھا کہ آپاں کی روح سے معافی مانگ سکوں۔ اس کی روح کتنی دکھی ہو گی تیری وجہ سے۔ تو یہاں نہ ملتی تو..... تو میں پاگل ہو جاتا زینو..... میں نے تجھے ہر جگہ تلاش کیا تھا۔ مجھے چوہدری نیاز سے پتا لگ چکا تھا کہ گاؤں سے بھاگ چکی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ تو واپس گاؤں نہیں آئی ہو گی اسی لیے یہاں نہ آیا پر میں نے اِدھر اُدھر کے سارے گاؤں دیکھ ڈالے تھے۔ تو کہیں بھی نہیں ملی۔ تیری مامی نے بتایا تھا کہ تو کسی امام دین کے ساتھ ہے اور اسی کے بیٹے کی تجھ سے سگائی ہو گئی ہے۔ میں اس کے گاؤں گیا تو پتا چلا کہ وہ لوگ بھی تیرے ہی ساتھ گاؤں سے نکلے ہوئے ہیں۔ تو نہیں جانتی زینو کہ میری کیا

حالت ہو گئی تھی..... بس تُو مجھے معاف کر دے۔" وہ پھر میرے ہاتھ پکڑ کر رو پڑا۔

"بس کر ماما..... بس کر' اپنی حالت تو دیکھ..... یوں تو تُو جان دے دے گا۔" میں تڑپ کر اس سے لپٹ گئی۔

"میں تو اُسی روز مر گیا تھا پُتر جب آپاں کی موت کی خبر سنی تھی..... اور جب..... جب یہ پتا لگا کہ میں آپاں کی روح کو دکھ دے رہا تھا تو..... تو....."

"بس کر ماما..... میں تو جانتی تھی کہ تجھے غلط بتایا گیا ہے ورنہ تُو کبھی بھی ایسا نہیں کرتا۔ اب تُو روئے گا تو اماں کی روح کتنی بے چین ہو جائے گی۔ وہ تجھے اپنے بچوں کی طرح چاہتی تھی بس کر....." میں نے اس کے آنسو اپنے پلو سے پونچھ کر کہا۔

"میں..... میں چوہدری نیاز کو چھوڑوں گا نہیں۔ مجھے تو پتا ہی نہیں پڑا کہ آپاں کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ تیری مامی نے کچھ بتایا تو تھا پر....." وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر چپ ہو گیا۔

تب میں نے شروع سے آخر تک ساری کہانی سنا دی۔ میرے بتاتے بتاتے ہی یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی بھر گئی ہوں۔ ابا کی موت اور اماں پر ہونے والے ظلم کے متعلق سن کر تو وہ پاگل ہو اٹھا۔ وہ غصے سے کانپنے لگا تھا۔ خالہ فاطمہ اس دوران میں روٹی نکال لائی مگر اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ میرے ضد کرنے پر اس نے چند نوالے کھائے مگر صاف لگ رہا تھا کہ وہ زبردستی کھا رہا ہے پھر خالہ نے اسے چائے دی۔

رات کافی ہو چکی تھی۔ میں نے ماما کو لیٹ جانے کو کہا اور بڑی دیر تک اس کے پیر دباتی رہی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں اماں کے پاؤں دبا رہی ہوں۔ اس کے پاس سے اماں کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس کے آنے سے میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ میرے سارے اپنے پاس تھے' کادا اور بابا بھی تھے۔ میں نے ماما کو بابا کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انھی لوگوں نے مجھے سہارا دیا تھا۔ میرے زخموں پر مرہم رکھا تھا۔ مامی اسے یہ بھی بتا چکی تھی کہ میری اور کادے کی شادی ہو چکی ہے پر میں نے اسے بتایا کہ یہ شادی اُس روز ہو جاتی مگر چوہدری نیاز نے تو میری زندگی کا ہر سکھ چھین لیا ہے۔ تب ماما نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"زینو! تُو اب لاوارثوں کی طرح وداع نہیں ہو گی' اب تیرا ماما تجھے ڈولی چڑھائے

گا۔"

یہ سن کر مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ جو کچھ میں سن رہی ہوں وہ حقیقت ہے۔ کیسی حسرت لے کر میں ماما کے گاؤں گئی تھی اور کیسی ٹوٹ پھوٹ لے کر واپس آئی تھی۔ پر خدا میرے ساتھ تھا' شاید اسے یہی منظور تھا جبھی تو اس روز میرا نکاح نہیں ہو پایا اور پھر میں اتنے روز دربدر پھرتی رہی۔ یہ ایسی خوشی تھی جس نے میرے اندیشے دور کر دیے۔ ایک تنہا اور بے آسرا لڑکی کے لیے یہ کم خوشی کی بات نہ تھی کہ اس کو جان سے مارنے کے لیے پھرنے والا ماما اسے اپنے ہاتھوں سے رخصت کرنے کا وعدہ کر رہا تھا۔ یہ خیال' یہ آس تو حسرت بن چکی تھی۔ مجھے مامی یاد آ گئی۔ جس نے روتے ہوئے کہا تھا کہ کاش زینو میں تجھے اپنے گھر سے اپنی دعاؤں میں رخصت کر سکتی۔ یہ سب سن کر میرا جی چاہا کہ اُڑ کر جاؤں اور بابا اور کادے کو یہ خبر سناؤں پر رات بہت بیت چکی تھی۔ دن بھر کے لمبے سفر نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا۔ ماسٹر کا گھر دور تھا اور بابا کادا وغیرہ بھی سفر کی تھکان کی وجہ سے سو چکے ہوں گے بس یہی سوچ کر چپ ہو گئی۔ نیند البتہ میری آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ مجھے صبح کا انتظار تھا۔ ماما آسمان کو تکتے تکتے جانے کب سو گیا تو خالہ فاطمہ نے مجھے بھی سو جانے کو کہا۔ میں سوتی تو خیر کیا' ہاں اپنی منجھی پر آ کر لیٹ گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد خالہ فاطمہ کو بھی نیند آ گئی۔ میں بڑی دیر تک جاگتی رہی۔ ہزاروں سوچوں نے میرے ذہن میں جال سا بُن رکھا تھا پھر جانے کیا کیا سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

سویرے اذانوں کے وقت ہی میری آنکھ کھل گئی۔ خالہ فاطمہ ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔ میرے بدن میں شدید درد تھا اس لیے اٹھ جانے کو میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں کروٹ بدل کر پھر سونے کی کوشش کرنے لگی تبھی اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی آہٹ ہوئی ہو۔ میں نے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا' وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ خیال آیا کہ شاید بلی آئی ہو۔ اسی پل میری نگاہ ماما کے بستر پر پڑی۔ میں اچھل کر اٹھ بیٹھی۔ وہ اپنے بستر پر نہ تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر مجھے خیال آیا وہ رفع حاجت کے لیے اٹھا ہو گا۔ میں نے اس ٹاٹ کے پردے کی طرف دیکھا جو غسل خانے کے در پر پڑا ہوا تھا۔ وہ ساکت تھا یوں لگا جیسے غسل خانہ خالی ہو۔ آہٹ تو لمحہ پہلے ہوئی تھی اگر وہ غسل خانے گیا ہوتا تو پردے کو یوں ایک دم تو ساکت نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ہوا بند تھی' سخت حبس تھا شاید اس لیے

بھی پردا ساکت تھا۔ میں نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر آواز دی۔ "ماما!" مگر جواباً مجھے کسی قسم کی آواز یا آہٹ محسوس نہیں ہوئی مگر میں مجبور تھی۔ مجھے کچھ دیر انتظار کرنا تھا۔ سو میں دھڑکتے دل کے ساتھ منجھی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی میں نے خالہ فاطمہ کو اٹھانا بھی مناسب نہ سمجھا۔ کیا پتا کہ میں بوکھلا کر انہیں اٹھا دیتی اٹھایا اور ماما غسل خانے میں ہوتا' خالہ فاطمہ کی نیند خوامخواہ ہی خراب ہوتی۔ میں انتظار کرنے لگی۔ مجھے خیال آیا کہ میں چائے بنالوں۔ کیا پتا ماما اٹھتے ہی چائے پینے کا عادی ہو جیسے اماں عادی تھی اور اٹھتے ہی گرم گرم چائے پیالہ بھر کر پی جاتی تھی۔ جب اماں کو کسی بات پر غصہ آتا تو ابا مذاق میں کہتا تھا۔ "تو سویرے سویرے گرم چائے سے اپنا کلیجہ جلا لیتی ہے۔ پھر سارا دن سلگتی رہتی ہے..... دہی کھایا کر دہی۔ سارا دن میٹھی میٹھی باتیں کرے گی۔" تب اماں چڑ جاتی اور کہتی۔

"ہاں بس کر' تو جو دہی کا کونڈا کھاجاتا ہے وہی کافی ہے۔ پر تو تو سارا دن میں ایک بات بھی میٹھی نہیں کرتا۔"

"اری تجھی وہ تو کھٹی دہی تھی۔ اب کھٹی دہی کھا کر کون میٹھی باتیں کرے گا۔"

میں اور بابا ہنستے جاتے اور اماں بڑبڑاتی رہتی..... میں سوچتی ہوئی اٹھی اور چولھے میں لکڑیاں ڈالنے لگی۔ آہٹ پر فاطمہ خالہ نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا پھر آسمان پر چھائی سرمائی کو دیکھ کر وہ بھی اٹھ بیٹھی۔ اسی وقت اس کی نگاہ بھی شاید ماما کی منجھی پر پڑی۔

"تیرا ماما کہاں گیا؟" اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"پتا نہیں خالہ..... شاید غسل خانے میں ہو۔" میرے لہجے کی تشویش نے اسے چونکا دیا۔

"تجھے نہیں پتا؟"

"نہیں..... میں اٹھی تو وہ منجھی پر نہیں تھا۔ اب میں انتظار کر رہی ہوں کہ شاید وہ....."

خالہ اتنا سنتے ہی غسل خانے کے دروازے پر پڑے ہوئے پردے کے قریب چلی گئی اور ماما کو آوازیں دینے لگی۔ میں بھی اب پریشان ہو چکی تھی۔ مجھے اٹھے اب کافی دیر ہو

چکی تھی۔ وہ غسل خانے میں ہوتا تو اب تک آچکا ہوتا۔ خالہ فاطمہ کے چہرے پر گہری تشویش تھی۔ اس نے اچانک آگے بڑھ کر پردہ اٹھایا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

"ہائے میں مرگئی۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"زینو..... یہ..... یہ چوہدری نیاز کی حویلی نہ پہنچ جائے۔" خالہ فاطمہ نے جیسے ہی یہ بات کی میرا دم لبوں پر آگیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ مجھ سے ساری داستان سن کر وہ کسی طوفان کی طرح بپھر گیا تھا۔ وہ ایسا ہی جھلا تھا۔ اس نے کبھی اپنی جان کی پروا کی ہی نہیں۔ جو حالت میں دیکھ چکی تھی اس سے بھی لگتا تھا کہ وہ منہ اندھیرے ہی گھر سے نکل کر حویلی پہنچ گیا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ میں رونے لگی۔ خالہ فاطمہ نے جلدی سے اپنے بیٹے کو اٹھایا اور ماسٹر کے گھر کی طرف دوڑا دیا تاکہ وہ بابا اور کادے وغیرہ کو لے آئے۔ خالہ فاطمہ نے مجھے دن کی روشنی میں گھر سے نکلنے کو منع کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو میری موجودگی کا علم ہو۔ خالہ کا بیٹا یہ سنتے ہی دوڑ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ لوٹا تو کمالا اور کادا اس کے ساتھ تھے۔ خالہ فاطمہ نے بابا کو ساری بات بتائی۔ وہ بھی پریشان ہو گیا۔ کادا اور بابا فوراً کھڑے ہو گئے کہ وہ جا کر دیکھتے ہیں اسی وقت خالہ کا بیٹا جو باہر گیا تھا۔ دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"اماں..... چوہدری کی حویلی میں آگ لگ گئی۔" یہ خبر نہیں ہمارے لیے دھماکا تھا۔ جانے کیوں مجھے ایک دم یقین آگیا کہ آگ لگانے والا ماما ہے۔ جو آگ اس کے کلیجے میں لگی ہوئی تھی اس نے وہی آگ اب حویلی میں لگا دی تھی۔

بابا اور کادا ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہ گئے۔

"جا..... تو جا کر پتا کر..... اور سن! دیکھنا اگر زینو کا ماما وہاں ہو تو....." پھر اچانک وہ چپ ہو گئی۔ اسے شاید احساس ہو گیا تھا کہ وہ کیا کہنے جا رہی تھی۔ "اچھا تو جا..... پتا کر کہ کیا ہوا؟"

اس نے بیٹے کی کمر پر ہاتھ رکھ کر دروازے کی طرف دھکیلا۔ وہ بجلی کی تیزی کے ساتھ نکل گیا۔

جہاں یہ خبر سن کر میرے من میں ٹھنڈک پھیل گئی تھی وہاں ماما کی طرف سے پریشان ہو گئی تھی۔ اسے کچھ ہو جاتا تو میں تو پاگل ہی ہو جاتی' مجھے اس کی شکل میں اماں کا پیار

اور ابا کی شفت ملی تھی۔ میں اس کا نقصان برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہی تو دنیا میں میرا واحد رشتے دار تھا۔ شاید بابا کو بھی یقین تھا کہ یہ آگ اس نے لگائی ہو گی۔ اس کے چہرے کے تاثرات یہی بتا رہے تھے۔ کادے کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خجالت بھی تھی۔ آخر اس نے کہہ ہی دیا کہ کاش یہ کام میں نے کیا ہوتا۔

"نہ پُتر! اسے قانون کے حوالے کرنا اور بات ہے۔ اسے اس کے ظلموں کا بدلہ ملنا چاہئے پر..... یوں اپنے آپ کو پھنسا لینا ٹھیک نہیں ہے ویسے بھی اللہ پر چھوڑ دو تو وہ بڑا انصاف کرنے والا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ تم لوگ زینو کو لے کر اس کے مامے کے گھر چلے جاؤ۔ یہاں رہنا خطرناک ہے۔ آج ہی اندھیرے میں نکل جاؤ۔" خالہ فاطمہ بہت پریشان تھی اس کی پریشانی بجا تھی۔ میں جانتی تھی کہ اگر چوہدری نیاز کو بھنک بھی مل گئی کہ اس نے ہمیں پناہ دی تھی تو وہ اس کے لیے زمین بھی تنگ کر دے گا۔ وہ اکیلی عورت بچے کے ساتھ کہاں جائے گی۔ وہ تو اتنا ظالم تھا کہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

بابا اور کادا اسے دیکھتے ہی رہ گئے..... ابھی تک ہمیں اس آگ کے بارے میں کچھ پتا نہیں لگا تھا کہ اچانک دروازے کا پردہ ہٹا اور ماما اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر بلا کا سکوت طاری تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں بھاگ کر اس کے قریب چلی گئی۔ "کہاں چلا گیا تھا ماما تو؟"

"آگے تھلے پر گیا تھا..... وہاں ایک یار رہتا ہے میرا' وہ اسی تھلے پر کام کرتا ہے۔ میں نے سوچا تُو اور آپاں فاطمہ تھکی ہوئی ہے۔ وہاں چائے پی لیتا ہوں۔" اس نے پھولی ہوئی سانس سے کہا۔

وہ آنکھیں چرائے ہوئے تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ جھوٹ بول رہا ہے پھر میں نے جلدی سے فاطمہ خالہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔ وہ ایک ہاتھ اپنی کمر اور دوسرے ہاتھ کی انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھے ماما کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس دوران میں سناٹا گہرا ہو گیا تھا۔ میں نے جلدی سے بابا کی طرف اشارہ کر کے ماما کو بتایا کہ یہی وہ شخص ہے جس نے مجھے ایسے وقت میں سہارا دیا تھا جب میں آسمان اور زمین کے بیچ تنہا اور بے بس تھی۔ ماما یہ سنتے ہی بابا کی طرف بڑھا اور سینے سے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں کے کونے بھیگ گئے۔

"ویر جی! تُو نے میرے اوپر بڑا احسان کیا ہے۔ تُو اسے سہارا نہ دیتا تو جانے اس کا کیا ہوتا؟"

"نہ جی نہ ..... یہ تو دھی ہے جی میری۔ احسان تو اللہ کا ہے کہ یہ اس ویلے ہم کو مل گئی۔" بابا نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

میں نے کادے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں غصہ تھا۔ شاید وہ ماما کو دیکھ کر غصے میں آ گیا تھا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ کس طرح اس کے اور بابا کے ساتھ مامے کے گھر گئی تھی اور کیسی بلکتی روتی واپس آئی تھی۔ میں نے ملتجی نگاہوں سے کادے کو دیکھا تو اس نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

اسی وقت خالہ کا بیٹا پھر پھولی ہوئی سانس لئے واپس آ گیا۔ وہ بھاگتا ہوا آیا تھا۔

"اماں .....! چوہدری کے ڈھور ڈنگر سب جل گئے۔ کسی نے چارے میں آگ لگا دی تھی۔"

یہ سنتے ہی میری نگاہیں بے اختیار ماما کی طرف اٹھ گئیں۔ ماما کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ جسے شاید صرف میں ہی دیکھ سکی تھی۔ خالہ فاطمہ تو بھاگ کر گلی کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی تھی۔ وہ آج بہت بوکھلائی ہوئی تھی۔ میں جانتی تھی کہ اس کی یہ حالت کیوں ہے۔ میں نے بابا اور کادے سے کہا کہ وہ لوگ جس قدر جلد ہو سکے یہاں سے نکل جائیں۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ اگر چوہدری کو پتا چل گیا کہ ہم یہاں خالہ فاطمہ کے گھر ہیں تو اس کے لئے قیامت ہی آ جائے گی۔ بات ان لوگوں کو سمجھ میں آ گئی تھی۔ بابا خود بھی یہاں رکنے کو تیار نہ تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ رات ہی یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ وہ اس گاؤں سے باہر رہ کر دینو اور ماجے کو چھڑانے کی کوشش کریں گے۔ یہ سب سن کر ماما بھی اٹھ بیٹھا۔ اس نے بھی ان کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ اس وقت نکلنا زیادہ آسان تھا کیونکہ گاؤں کے سبھی لوگ چوہدری نیاز کی حویلی کی طرف چلے گئے تھے۔ خالہ کے بیٹے نے بتایا کہ سارا گاؤں وہاں آگ بجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ موقع غنیمت دیکھ کر وہ لوگ اس وقت وہاں سے نکلنے کو تیار ہو گئے۔ خالہ فاطمہ مجھے ان لوگوں کے ساتھ بھیجنے کو تیار نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں یہاں بہ آسانی چھپ سکتی ہوں۔ اس نے کہہ دیا کہ پہلے کہیں ٹھکانا کر لو پھر آ کر زینو کو لے جانا۔ کادے نے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی آ

کر مجھے بھی لے جائے گا مگر اس وقت تک جب تک وہ لوگ کوئی ٹھکانا تلاش نہ کر لیں مجھے یہیں رہنا تھا۔ خالہ فاطمہ نے یہ سب سن کر گہری سانس لی۔

میں کادے سے جدائی کے خیال ہی سے لرز اٹھی تھی۔ میں تو زمانوں بعد اسے دیکھ رہی تھی۔ اب اس سے علیحدہ ہونے کا تصور بھی میرے لئے بڑا تکلیف دہ تھا مگر حالات کے پیشِ نظر مجھے بہرحال وہی کرنا تھا جو ان سب نے طے کیا تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ ماما ہوتا تو شاید میں کادے کے ساتھ جانے کی ضد کرتی۔ وہ لوگ مجھے تسلی دے کر چلے گئے میں دیر تک دروازے میں کھڑی انہیں جاتا دیکھتی رہی۔ نہ معلوم کیوں ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ غلط ہو رہا ہے۔ ایک عجیب سی بے کلی تھی جو مجھے چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں بابا' کادے اور ماما وغیرہ کو آواز دے کر روک لوں۔ ان سے کہوں کہ وہ کہیں نہ جائیں یا پھر مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیں مگر میں یہ سوچتی رہ گئی اور وہ لوگ سنسان گلی سے تیز قدم اٹھاتے ہوئے میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ خالہ فاطمہ بھی میرے قریب کھڑی انہیں جاتا دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب گہرا اطمینان تھا۔ وہ بے چاری بھی کیا کرتی۔ میرا اور میرے گھر کا انجام دیکھ چکی تھی۔ مجھ میں تو جانے کہاں سے حوصلہ امنڈ آیا تھا کہ بے سوچے سمجھے قدم اٹھاتی چلی گئی' یہ تو میری قسمت ہی تھی جس نے مجھے بچائے رکھا تھا ورنہ میں یہ بات جانتی تھی کہ اگر میں چوہدری نیاز کے ہتھے چڑھ گئی تو میرا کیا حشر ہوتا۔

"چل اندر ....." خالہ فاطمہ نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اندر دھکیل دیا۔ "کب تک یہاں کھڑی رہے گی۔ دیکھ زینو پُتر! ان کا یہاں رہنا خطرناک تھا۔ خاص طور پر تیرے لئے۔ چوہدری کو پتا چل جاتا تو ان لوگوں کو بھی اٹھا لیتا اور تجھے بھی' ان لوگوں کا تو جانے کیا ہوتا پر تیرے تو وہ ٹوٹے کر کے کتوں کو کھلا دیتا۔ وہ تو اتنا حرامزادہ ہے کہ اپنے بھائی کو جان سے مار دیا' پھر تجھے کیسے چھوڑ دیتا۔" خالہ فاطمہ اپنی صفائی پیش کر رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں خالہ!" میں نے منجھی پر بیٹھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ "یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ خبیث مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا پر میں اب اس کے لئے ایسا تر نوالہ بھی نہیں ہوں جسے وہ آسانی سے نگل سکے۔"

میری بات سن کر خالہ منہ کھول کر مجھے دیکھنے لگی۔ شاید وہ میری بات نہیں سمجھی

تھی۔ "کیا مطلب؟" اس نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔

میں اسے ٹال گئی۔ اب اسے کیا بتاتی کہ میرے سینے میں دہکنے والی آگ میری انگلیوں کی پوروں تک آ گئی ہے۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ میں اب ایسی کوئی بات برداشت کرنے کے قابل نہیں رہی تھی جو میرے دکھ کو بڑھا دے یا مجھے تنہائی کے عذاب سے دو چار کر دے۔ ماما اور کادے وغیرہ کے مل جانے سے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا ویران گھر آباد ہو گیا ہو۔ جیسے مجھے میرے اپنے مل گئے ہوں۔ اب میں ان لوگوں کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ان لوگوں کے چلے جانے سے میرے دل پر ایک بوجھ سا آ گرا تھا۔ اب میرے پاس کرنے کو صرف انتظار ہی رہ گیا تھا' وہ بھی نامعلوم مدت تک کو۔ میں نے کادے سے کہہ دیا تھا کہ وہ جس قدر جلد ہو سکے مجھے آ کر لے جائے مگر میں نہیں جانتی تھی کہ وہ لوگ کہاں جائیں گے' کس جگہ ٹھکانا ڈھونڈیں گے۔ میں بڑی دیر تک بیٹھی یہ سب کچھ سوچتی رہی۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ خالہ فاطمہ کب میرے پاس سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔ میں چونکی اس وقت جب خالہ فاطمہ بوکھلائی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔

"زینو ....." اس نے داخل ہوتے ہی سرگوشی کی۔ اس کے لہجے میں عجیب طرح کا خوف تھا جو سوئیوں کی طرح میرے دماغ میں چبھ کر رہ گیا۔

"کیا بات ہے؟" میں گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر میں بوکھلا اٹھی تھی۔ دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

"وہ ..... کریم بتا رہا تھا کہ ..... کہ چوہدری کی حویلی کے پیچھے سے پولیس نے کچھ لوگوں کو پکڑ لیا ہے۔" خالہ فاطمہ یہ کہتے کہتے رو دی۔

یہ سن کر میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ "کیا ..... کیا کہا؟ کب ..... وہ لوگ تو ..... مگر خالہ وہ لوگ تو ....." میرے الفاظ میرے منہ میں ہی تحلیل ہو رہے تھے۔ مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ میرا ذہن الجھ رہا کر رہ گیا تھا۔ اتنی جلدی وہ لوگ حویلی کے پیچھے تک کیسے پہنچے ہیں۔ یہ وہ سوال تھا جس نے مجھے جکڑ لیا تھا۔

"ہاں پر۔ کیا پتا ..... کہ وہ لوگ وہاں تک پہنچ ہی گئے ہوں؟ ..... ہو سکتا ہے کہ پولیس نے راستے میں پکڑا ہو۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "ہائے ربا! مجھے کیا پتا تھا؟ کیوں بھیج دیا تھا میں نے .....؟" وہ سینے پر دو ہتڑ مار کر پھر رو دی۔

"خالہ ..... چپ کر جا ..... مجھے سوچنے دے۔" میں نے اپنے سینے پر یوں ہاتھ رکھ لیا جیسے میرا بے قابو ہوتا دل ٹھہر ہی تو جائے گا۔ "نہیں خالہ ..... وہ لوگ ابھی وہاں تک نہیں پہنچے ہوں گے۔ وہ سامنے والی سڑک سے نہیں گئے ہوں گے' اس سڑک پر جانا خطرناک تھا۔ وہ ساتھ والی گلی میں گئے ہوں گے' وہ پتلی گلی انہیں مکانوں کے پیچھے اس بھٹی تک لے جاتی جس کے بعد گنے کے کھیت شروع ہوتے ہیں۔" میں بول رہی تھی اور راستہ جیسے میری نگاہوں کے سامنے تھا۔

"پر زینو ..... وہ ..... وہ لوگ کیا جانیں کیا سڑک کھترناک ہے اور پتلی گلی کھیتوں تک لے جاتی ہے۔"

اس کی بات سن کر میں بے جان سی ہو کر منجھی پر ڈھے گئی۔ میں جو کچھ کہہ رہی تھی' سمجھ رہی تھی وہ محض اس بنیاد پر کہ میں اس راستے سے واقف تھی۔ میں تو بھول ہی گئی تھی کہ' بابا کملا اور کادا تو پہلی بار گاؤں آئے تھے اور ماما کو یہاں آئے برسوں گزر چکے تھے۔ اسے اگر یاد ہو گا تو بس اپنی آپاں کا گھر۔ وہ کیا جانے کہ اسے پتلی گلی سے جانا چاہئے۔ ممکن ہے کہ اس نے چوہدری کی حویلی ہی دیکھی ہو مگر ..... پھر میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ پولیس نے انہی لوگوں کو پکڑا ہو گا۔ مجھے یوں کھڑا ہوتا دیکھ کر خالہ فاطمہ بھی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"کک ..... کیا ہوا .....؟"

"خالہ! میں جاتی ہوں۔"

"کہاں؟" وہ چونک کر میرے راستے میں آ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے جیسے میرا راستہ روک رہی ہو۔ "کہاں جائے گی تُو ..... زینو وہ تجھے مار دیں گے' پکڑ لیں گے۔"

"مار دیں۔" میں بے ساختہ چیخ اٹھی ..... "پکڑ لیں ..... میں کسی سے نہیں ڈرتی ..... کسی سے بھی نہیں۔ میں اس طرح اذیت اٹھا اٹھا کر نہیں مرنا چاہتی۔ میں جاؤں گی خالہ' یا تو ان سب کو آزاد کراؤں گی یا ..... یا پھر چوہدری کی حویلی کی بجھتی ہوئی آگ پر تیل چھڑک کر آؤں گی۔ میں تو جل مروں گی مگر چوہدری نیاز کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" میں صدمے اور غصے سے پاگل ہو گئی تھی پھر اس سے پہلے کہ خالہ فاطمہ

مجھے روکتی میں نے لپک کر خالہ فاطمہ کا سفید لٹھے کا برقعہ اتار لیا جو کھونٹی پر ٹنگا ہوا تھا۔ اتنا ہوش مجھے تھا کہ میں دن میں یوں کھلے سر اور بغیر پردے کے نہیں نکلنا چاہتی تھی۔ میں برقعے کو سر پر ڈالتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ بری طرح گھوم گئی۔ میرا بازو خالہ فاطمہ کی گرفت میں تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تیر رہی تھی جو جانے دکھ کی تھی یا غصے کی مگر اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار تھے۔

"زینو ..... میں تجھے کہیں نہیں جانے دوں گی۔ دن کے ویلے نکلے گی تو وہ تجھے بھی پکڑ لیں گے۔ عقل سے کام لے زینو' تُو بھی ان کے جال میں پھنس گئی تو تم لوگوں کو بچانے والا کوئی نہیں ہو گا۔" وہ ایک دم ہی رو پڑی تھی۔ "میں میراں کو قیامت کے دن کیا منہ دکھاؤں گی زینو .....؟ مجھ پر رحم کر' معاف کر دے مجھے۔"

میں اس کے دونوں ہاتھ پکڑے زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ آنسو آبشار کی طرح بہہ نکلے۔ لگتا تھا دل پھٹ جائے گا۔ میں مر جاؤں گی۔ خالہ فاطمہ نے میرے قریب بیٹھ کر مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ ہم دونوں جانے کب تک روتے رہے۔ خالہ کا بیٹا گھر سے باہر تھا' شاید وہ بھی چوہدری کی حویلی میں لگی آگ کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ گھر میں میرے اور خالہ کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ڈھیروں آنسو بہہ گئے تو لگا جیسے طوفان تھم گیا ہو۔ اندر گہرا سناٹا تھا' آنسو خشک ہو چکے تھے۔ خالہ نے میری سنبھلی ہوئی حالت دیکھی تو اٹھ کر پانی کا کٹورا بھر لائی۔

"زینو تُو جلدی نہ کیا کر' کیا پتا وہ لوگ نکل گئے ہوں۔ یہ کوئی اور لوگ ہوں۔ یوں اگر بھاگتی چلی جاتی تو ..... تو کیا وہ تجھے چھوڑ دیتے؟"

وہ بات ٹھیک کہہ رہی تھی۔ کیا پتا وہ لوگ نکل گئے ہوں۔ کادے نے مجھے انتظار کرنے کو کہا تھا' میں اگر جذباتی ہو کر نکل چکی ہوتی اور پکڑی جاتی پھر کادا رات کو مجھے لینے آتا تو ..... تو کیا ہوتا؟ اس خیال سے میں لرز اٹھی۔ کادا سوچتا کہ میں نے پھر' ایک بار اسے دھوکہ دے دیا۔ میں پھر جان بوجھ کر اسے چھوڑ گئی۔ ان باتوں نے دل کو بڑی ڈھارس دی اور میں اپنے رب سے دعائیں کرنے لگی کہ وہ کادے وغیرہ کی حفاظت کرے۔ اب مجھے چوہدری کی حویلی کی فکر تھی۔ میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ آگ کہاں تک بھڑکی اور اس کا کتنا نقصان ہوا ہے۔ یہ جاننا بھی میرے لئے ضروری تھا کہ پکڑے

جاننے والے لوگ کون ہیں۔

بہرحال میں ہوش میں آ چکی تھی۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں دھیرے دھیرے بیدار ہو گئی تھیں۔ مجھے ٹھیک دیکھ کر خالہ بھاجی بنانے بیٹھ گئی۔ ہم نے ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ میری تو بھوک اُڑ چکی تھی پر خالہ اور اس کے بیٹے کو تو روٹی کھانا تھی۔ خالہ کھانا بناتی رہی اور میں سوچتی رہی کہ مجھے کب تک کاکے کا انتظار کرنا ہے۔ کافی دیر بعد کاکا آ گیا۔ اس نے بتایا کہ باڑے میں لگنے والی آگ نے حویلی کے پیچھے والے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ پیچھے بنی کوٹھڑی اور بڑے کمرے کے دروازوں کھڑکیوں کو آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس کی تین بھینسیں اور پانچ بکریاں بھی جل گئیں۔ پچھلے حصے کی طرف کھڑی جیپ کو آگ لگنے کی وجہ سے زیادہ نقصان ہوا ورنہ آگ کی لپیٹیں حویلی تک نہ پہنچ پاتیں۔ چوہدری نیاز کے پاس ایک ہی جیپ تھی جو زیادہ تر عبدالقادر کے پاس رہتی تھی اور جسے چوہدری نے میرے پیچھے لگا دیا تھا۔ یہ وہی جیپ تھی جس میں عبدالقادر نے بڑی دور تک اور بڑے دنوں تک میرا پیچھا کیا تھا۔ گویا خدا نے رسّی کھینچنا شروع کر دی تھی۔ مجھے یہ سن کر کافی اطمینان ہوا۔ کاکے نے بتایا تھا کہ اب بھی لوگ آگ بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کالا اور گاڑھا دھواں اب بھی آسمان کی طرف اٹھ رہا ہے۔ یہ تفصیل بتانے کے بعد اس نے روٹی کھائی۔ مجھے بھوک نہیں تھی مگر میں نے خالہ فاطمہ کی ضد پر دو چار نوالے لے لئے۔ وہ پھر پُرجوش انداز میں یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا کہ وہ کچھ دیر بعد آ کر بتائے گا کہ کیا ہوا۔ کچھ دیر بعد خالہ فاطمہ بھی مجھ سے قسم لے کر کہ میں کہیں نہیں جاؤں گی' برقعہ سر پر ڈال کر چوہدری کی حویلی چلی گئی تاکہ سونیا سے افسوس کر آئے۔

اب میں اکیلی رہ گئی تھی۔ ہزاروں وسوسے اور اندیشے مجھے گھیرے ہوئے تھے۔ میں نے خالہ فاطمہ سے کہا تھا کہ وہ کوشش کرے کہ پکڑنے جانے والوں کے بارے میں پتا چل سکے کہ وہ کون لوگ ہیں۔ مجھے اس وقت تک چین نہ آتا جب تک ان لوگوں کے بارے میں پتا نہیں چل جاتا۔ یوں تو میں جانتی تھی کہ چوہدری نیاز کی حرکتوں نے اب تک ہزاروں دشمن پیدا کر لئے ہوں گے مگر اتنا دل گُردہ کس کا تھا کہ وہ چوہدری کو نقصان پہنچانے کی ہمت کر لیتا۔ یہ تو کوئی ایسا بندہ ہی کر سکتا تھا جس کا ماما یا کاکے جیسا جگرا ہوتا۔

میں جوں جوں اس بارے میں سوچ رہی تھی مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ آگ لگانے والا ماما ہی ہے۔

وقت گزرتا رہا اور میں کوٹھڑی میں پڑی سوچتی رہی۔ خالہ فاطمہ نے بڑی دیر لگا دی تھی۔ کاکا بھی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اب دھوپ سامنے کی دیوار پر چڑھ چکی تھی۔ سورج دھیرے دھیرے مغرب کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ اب میں بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ خالہ نے دیر کیوں کر دی؟ یہ سوال مجھے بہت بے چین کر رہا تھا۔ انجانے خدشے مجھے گھبرائے دے رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ میں گھر میں اکیلی ہوں۔ اسے جلدی آ جانا چاہئے تھا۔ میں بے کل ہوئی تو اٹھ کر دروازے تک آ گئی۔ دوپہر میں تو گلی سنسان تھی پر اب جگہ جگہ لوگ گھروں کے سامنے بیٹھے چوہدری نیاز کی حویلی میں لگنے والی آگ پر تبصرہ کر رہے تھے۔ میں نے ٹاٹ کے پردے میں موجود سوراخ سے باہر جھانکا۔ لوگوں میں جوش و خروش زیادہ تھا۔ کسی کے چہرے پر دکھ یا افسوس کا تاثر نہیں تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے میرے بابا اور اماں کے ساتھ برسوں گزارے تھے اور پھر بابا کی خون میں نہائی لاش بھی دیکھی۔ مجھے اور اماں کو چوہدری کی حویلی جاتے بھی دیکھا تھا۔ پھر انہی لوگوں نے اماں کے مرنے اور میرے بھاگ جانے کی اطلاع بھی سنی ہو گی' میں یہ بھی جانتی تھی کہ ان لوگوں نے چوہدری نیاز کی سنائی کہانی پر اعتبار نہیں کیا ہو گا لیکن اپنے گاؤں کی مٹی سے جڑے رہنے کی خواہش نے ان کے ہونٹوں پر مہر لگا دی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ چوہدری کے خلاف آواز اٹھانے والے کا کیا حشر ہوتا ہے' یہ سب جانتے ہوئے بھی میں ان کے سامنے نہیں جا سکتی تھی کیوں کہ میں نہیں جانتی تھی کہ ان میں کون زیادہ بزدل ہے جو اپنی جان بچانے کے لئے میری آمد کی اطلاع دے سکتا ہے۔ میں یونہی ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کھڑی رہی۔ مجھے نوراں بھی نظر آئی جس کے ساتھ میں بچپن میں کھیلتی رہی تھی۔ وہ اب بہت پیاری اور جوان ہو گئی تھی۔ میرا جی چاہا کہ میں اسے آواز دے لوں مگر میں اسے نہ بلا سکی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ سورج کی کرنیں نارنجی ہو چکی تھیں۔ سامنے کی دیوار پر گہرا سایہ ہو گیا تھا۔ اب دھوپ اس پر سے اتر چکی تھی۔ خالہ فاطمہ اور کاکا ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ میں چولہے کے پاس جا بیٹھی۔ میں نے پتیلی میں چائے چڑھا دی۔ چائے بنا

کر میں منجھی پر آ بیٹھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ جلدی سے رات ہو جائے۔ مجھے یقین تھا کہ رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر کادا ضرور مجھے لینے آئے گا۔ میں کادے اور ماما کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ یہ خیال بھی پریشان کر رہا تھا کہ وہ لوگ واقعی پکڑے نہ گئے ہوں گو خالہ فاطمہ کا کہنا بھی صحیح تھا کہ اتنی جلدی وہ لوگ حویلی کے پچھواڑے نہیں پہنچ سکتے مگر کیا پتا کہ انہیں وہاں سے نہ پکڑا گیا ہو مگر مشہور یہی کیا گیا ہو کہ انہیں اس طرف سے پکڑا گیا ہے تاکہ ان پر آگ لگانے کا الزام ڈالا جا سکے۔ چوہدری نیاز جیسے خبیث آدمی کے راج میں سب کچھ ممکن تھا' وہ جھوٹے الزام لگانے میں ماہر تھا۔ میں جوں جوں سوچ رہی تھی میری حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اُڑ کر حویلی تک پہنچ جاؤں' پتا کروں کہ پکڑے جانے والے کون ہیں مگر میرا گھر سے نکلنا خطرناک تھا اس لئے میں دل مسوس کر رہ گئی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ خالہ فاطمہ ہی جلدی واپس آ جائے۔

اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ میں نے لالٹین جلا دی۔ اب مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ میں بار بار دروازے پر جاتی اور جلے پاؤں کی بلی کی طرح لوٹ آتی۔ اسی لمحے جب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے ہی والا تھا کہ خالہ فاطمہ بوکھلائی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔

"کیا ہوا خالہ؟" میں نے اسے دروازے پر ہی پکڑ لیا۔

"پُتر دم تو لینے دے۔" اس نے پھولے ہوئے سانس کے درمیان کہا اور برقع اتار منجھی پر ڈھے گئی۔ میں جلدی سے پانی کا کٹورا بھر لائی۔ اس نے ایک ہی سانس میں سارا پانی پی لیا۔ میں اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ میری آنکھیں اس کے چہرے پر گڑ کر رہ گئی تھیں۔

"پُتر! جو لوگ پکڑے ہیں ان کا تو کچھ بھی پتا نہیں لگا' صرف اتنا پتا لگا ہے کہ وہ اس گاؤں کے نہیں ہیں۔ وہ لوگ بالکل بات نہیں کرتے۔ پر میں نے کرما کو وہاں دوڑتے دیکھا تھا۔ اس سے پتا لگ سکتا ہے۔ وہ لوگ ابھی تھانے میں ہیں۔ چوہدری نیاز پاگل ہو رہا ہے۔ کہتا ہے کہ کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ اس کی حویلی کے پیچھے کافی حصہ جل گیا ہے۔ سونیا تو بری طرح سینہ کوٹ رہی تھی۔ دہائی دے رہی تھی۔ اب تو ..... مجھے بھی ڈر لگ رہا ہے ..... کہیں وہی لوگ تو نہیں ہیں ..... کیا پتا ..... کیا پتا؟"

اس کی آنکھوں میں ناچتے وحشت کے سائے بڑھتے بڑھتے اس کے پورے چہرے پر پھیل چکے تھے۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ خالہ فاطمہ کی دی ہوئی ڈھارس خود اسی نے توڑ دی تھی۔ اب تو میں بری طرح بے چین ہو گئی تھی۔

"پر پُتر! کچھ ویلے کادے کا انتظار کر لے ..... کیا پتا وہ لوگ نکل ہی گئے ہوں ..... یا ..... ان میں سے کوئی۔" اتنا کہہ کر وہ دونوں ہاتھ میں منہ چھپا کر رو پڑی۔

وہ ایسا بلک کر روئی تھی کہ میری رہی سہی آس بھی ٹوٹ گئی۔ مجھے یقین سا ہونے لگا کہ وہ جان چکی ہے کہ پکڑے جانے والے کون لوگ ہیں۔ میرے دماغ میں غبار سے اٹھنے لگے۔ میں اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ مجھے یوں بپھرا ہوا دیکھ کر خالہ فاطمہ نے جلدی سے آنکھیں رگڑ ڈالیں اور میرے قریب آ گئی۔ "پُتر .....! میں نے بہت کوشش کی کہ مجھے ان لوگوں کا پتا مل جائے پر وہاں تو لوگوں پر بھوت سوار تھا' کوئی کسی کی سنتا ہی نہیں تھا۔ میں تو ایک طرف' کونے میں چپکی بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھی' کاکا نظر نہیں آیا ورنہ اس سے پتا کرتی۔"

"کہاں ہے کاکا؟" میں نے پلٹ کر بے قراری سے پوچھا۔

"جانے کہاں ہے ..... مجھے تو کہیں نظر نہیں آیا۔ وہیں ہو گا جہاں آگ لگی تھی۔"

اب معاملہ ایسا نہیں تھا کہ میں وقت گنواتی۔ مجھے جلد از جلد فیصلہ کرنا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ اسی وقت مجھے اس ماسٹر کا خیال آیا جس کے گھر کادے وغیرہ نے رات گزاری تھی۔ میں نے خالہ فاطمہ سے کہا کہ وہ جا کر اس سے کہے۔ وہ کچھ کر سکتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ پھر میں ہی کوئی قدم اٹھاؤں گی۔ خالہ فاطمہ بھی جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے برقع اٹھایا اور تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔ اب میں پھر انتظار کی اذیت ناک کیفیت سے دوچار تھی لیکن اس سے اتنا ہوا کہ مجھے سوچنے کا موقع مل گیا۔ نہ جانے مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی تھی کہ میں ہر قدم اٹھانے کو تیار ہو جاتی تھی۔ آپ کے لئے یہ بڑی حیرت کی بات ہو گی کہ گاؤں کی ایک معصوم سی لڑکی چوہدری نیاز سے ٹکر لینے پر تل گئی تھی اور تنہا ہی سب کچھ کرنے نکل کھڑی ہوئی تھی مگر سچی بات یہی ہے کہ جو دکھ اور اذیت میں اٹھا چکی تھی وہ ایسے نہیں تھے کہ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر' ڈر کر بیٹھ جاتی اور

یوں کسی کے گھر میں محبوس ہو کر زندگی گزار دیتی' وہ بھی ایسی صورت میں کہ ہر لمحہ خوف میرا سایہ بنا رہتا۔ میں زندہ رہنا چاہتی تھی اور زندہ ہی رہنے کے لئے یہ سب کر رہی تھی۔ اگر چوہدری نیاز میرا پیچھا چھوڑ دیتا تو شاید میں کادے کے پیار میں گم ہو کر انتقامی جذبات سے کنارہ کش ہو جاتی' بلکہ دیکھا جائے تو یہ انتقامی جذبہ نہیں تھا بلکہ زندہ رہنے کی جدوجہد تھی اور اگر میں یہ سب نہ کرتی تو یا تو جیل کی کوٹھڑی میں پڑی اپنی باقی زندگی گزار رہی ہوتی یا چوہدری نیاز کی حویلی کے کسی تاریک گوشے میں پڑی سڑ رہی ہوتی اور ایک روز اپنی ماں کی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتی۔

میری ساری آس' بڑا آسرا کادا تھا اور اس وقت میں کادے کو رخصت کر چکی تھی۔ مجھے پتا چلا تھا کہ کادے وغیرہ کو پکڑ لیا گیا ہے' ایک موہوم سی آس جو کبھی ماما سے بندھی تھی اور جو ماما کو اپنے پاس دیکھ کر بڑی قوت میں تبدیل ہو چکی تھی وہ بھی اس وقت داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ گویا ماما اور کادا جو میری زندگی کا سرمایہ تھے اس وقت چوہدری نیاز کے ہتھے چڑھ چکے تھے اب میرے پاس کرنے کو کیا رہ گیا تھا؟ زندہ رہنے کو کیا رہ گیا تھا؟ اب تو یہی ہو سکتا تھا کہ میں اپنی جان پر کھیل کر ان لوگوں کو بچانے کی کوشش کروں یا خود اپنی جان دے دوں۔ میرے آگے پیچھے تمام راستے سنسان ہو چکے تھے۔ پلٹ کر دیکھتی بھی تو ویرانی کے سوا کیا تھا البتہ میرے سامنے ایک امید تھی کہ شاید میں انہیں بچا سکوں یا ان تک پہنچ سکوں' سو آگے بڑھنے کے لئے یہی کافی تھا۔ پیچھے تو صرف شادو کا دھواں دھواں سا چہرہ تھا اور مجھ میں تاب نہ تھی کہ کادے اور بابا کے بغیر اس کا سامنا کرتی۔ میں ان کے بغیر وہاں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

تبھی میں نے فیصلہ کر لیا یا تو خود کو بھی موت کے حوالے کر دوں گی یا ان سب کو وہاں سے نکال لاؤں گی۔ نکال لانے کا تو میں صرف سوچ ہی سکتی تھی' زیادہ امکان یہی تھا کہ میں خود کو تباہی کے منہ میں دھکیل دوں مگر اب میرے لئے تباہی یا موت و زندگی کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ خالہ فاطمہ جلد ہی واپس آ گئی۔ اس کے چہرے پر پھیلی مایوسی مجھے صاف دکھائی دے رہی تھی پھر بھی میں نے پوچھ لیا کہ کیا ہوا۔

"وہ نہیں ہے۔ در پر تالا پڑا ہے۔" سب کچھ جانتے ہوئے بھی خالہ کے الفاظ نے جیسے دل بھینچ دیا۔ خالہ کی آنکھیں مجھ پر گڑی تھیں۔ وہ برقع اتارتے ہوئے بھی مجھے ہی

تکے جا رہی تھی۔ میں نے آسمان پر نگاہ ڈالی۔ ڈوبتے سورج کی شعلے جیسی روشنی بھی ماند پڑ چکی تھی۔ گہرے سرمئی رنگ نے آسمان کو ڈھک' دیا تھا' باہر کے پیڑ پر پرندوں کا شور بڑھ گیا تھا۔ زمین پر بیٹھ کر میں نے سر دیوار سے ٹکا دیا۔ خالہ فاطمہ میرے پاس ہی آ بیٹھی مگر نہ تو اس کے ہونٹوں پر کوئی بات آئی اور نہ ہی میں نے کچھ کہا۔ خالہ فاطمہ کی آنکھوں میں کہیں خوف تھا۔ یوں جیسے اسے میرے فیصلے کا پتا لگ گیا ہو۔

میرے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں خوف کی حدوں سے گزر چکی تھی۔ آنے والے لمحوں کا عذاب سہنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ میں نے آسمان پر نگاہ کی اندھیرا بہت آہستگی سے پھیل رہا تھا۔

"روٹی کھائی تُو نے؟" خالہ فاطمہ شاید گہرے سناٹے سے گھبرا کر بولی تھی۔

"نہیں ..... مجھے بھوک نہیں ہے۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"روٹی نہ کھائی تو ..... تیرے اندر دم کہاں رہے گا کہ تُو کچھ کر سکے۔" اس نے بھیگے ہوئے انداز میں کہا۔ شاید وہ رو رہی تھی۔

"ابھی نہیں کھاؤں گی خالہ! کچھ دیر بعد کھاؤں گی۔"

یہ سنتے ہی خالہ چولہے کے آگے جا بیٹھی۔ وہ تازہ روٹیاں ڈالنے لگی۔ ساتھ ہی وہ کچھ بڑبڑاتی بھی جا رہی تھی۔ میں نے ذرا دھیان دیا تو سنا کہ وہ سونیا اور چوہدری نیاز کو کوس رہی ہے۔ "اپنے گھر پہ تباہی آئی ہے تو کیسے سینہ کوٹ رہی تھی' جو گھر کے گھر تباہ کر دیئے وہ بھول گئی۔ خدا اسے ایسی سزا دے گا کہ ساری عمر سینہ کوٹے گی۔"

میں کچھ نہ بولی' اب بولنے کو کچھ رہا ہی کہاں تھا؟ میں تو بس اندھیرے کی منتظر تھی۔ گہرا اندھیرا ہی میری نجات تھا۔ میں اس اندھیرے میں انہیں تلاش کر سکتی تھی۔ کادا ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ کوئی نئی بات پتا نہیں چلی تھی۔ اب اندھیرا کچھ گہرا ہو گیا تھا۔ ہوا ٹھنڈی تھی۔ میں خالہ کے پاس جا بیٹھی۔

"روٹی دوں؟ اب کھا لے۔" مجھے پاس بیٹھتے دیکھ کر خالہ فاطمہ نے کہا۔

"ہاں خالہ! دے دے" میں پاس رکھے برتن سے ہاتھ دھوتے ہوئے بولی۔ میں چاہتی تھی کہ خالی پیٹ نہ جاؤں۔ سارا دن ہو گیا تھا میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کادے وغیرہ کو ڈھونڈھنے نکلوں تو پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے یا کمزوری مجھے

تھکا دے۔ خالہ نے فوراً ہی پلیٹ میں بھاجی ڈال دی۔ مجھے قطعاً بھوک نہیں تھی بلکہ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر میں نے جیسے تیسے ڈیڑھ روٹی کھالی۔ پیٹ بھر کر پانی پیا اور خالہ سے کہہ دیا کہ میں جا رہی ہوں۔ خالہ کا رنگ سفید ہو گیا۔

"پر پُتر..... کہاں جائے گی تُو؟ اور اگر وہ لوگ آئے تو میں کیا کہوں گی؟"

"خالہ میری بات غور سے سن!" میں اس کے قریب سرک آئی۔ "میں یہاں سے تھانے جا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گی کہ پکڑے جانے والے کون ہیں' جو وہی لوگ ہوئے تو میں انہیں چھڑانے کی کوشش کروں گی اور ہو سکتا ہے کہ اس کوشش میں' میں بھی پکڑی جاؤں۔ ایسی صورت میں جو بھی ہو گا تم لوگوں کو پتا چل جائے گا اور جو وہ لوگ وہاں نہیں ہوئے تو پھر میں تھلے کے پیچھے والی پگڈنڈی سے ہوتی ہوئی گنوں کے کھیتوں میں چلی جاؤں گی' یہاں وہی ایسی جگہ ہے جہاں خود کو لوگوں کی نگاہوں سے بچایا جا سکتا ہے۔ جہاں گنے کے کھیت ختم ہوتے ہیں اور ریل کی پٹڑی شروع ہوتی ہے وہاں گورنمنٹ کے بنائے ہوئے کوارٹر ہیں وہ خالی پڑے ہیں۔ ممکن ہے وہ لوگ وہاں ہوں' جو نہیں بھی ہوئے تو میں وہیں چلی جاؤں گی۔ اگر ماما یا کادا مجھے پوچھنے آئے تو اسے بتا دینا کہ زینو جہاں ہے اسے وہاں سے لے لو۔ سمجھ گئی ناں توں؟" میں نے ہر بات تفصیل سے بتا کر کہا۔

"ہاں..... وہ تو ہے' پر زینو! اگر تجھے کچھ ہو گیا....."

"جو قسمت میں ہو گا خالہ اسے تو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ بس تُو وہ باتیں یاد رکھ جو میں نے کہی ہیں۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ منجھی پر دری کے نیچے رکھی اپنی کالی چادر اٹھائی' اسے اپنے گرد اچھی طرح لپیٹا اور خالہ فاطمہ پر آخری نگاہ ڈال کر باہر نکل آئی۔ ہوا ٹھنڈی ہونے کی وجہ سے گلی سنسان تھی ورنہ اس وقت تو لوگ گلی میں منجھیاں ڈالے باتیں کیا کرتے تھے۔

مجھے اپنے پیچھے خالہ فاطمہ کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں مگر میں رکی نہیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اب کوئی بھی چیز میری راہ کی رکاوٹ بنے۔ گلی میں اندھیرا تھا۔ میں اپنے گاؤں کافی دنوں کے بعد آئی تھی پر مجھے تھانے کا راستہ اچھی طرح یاد تھا۔ وہ راستہ بھلا میں بھول سکتی تھی۔ میں اپنی زندگی میں پہلی اور آخری بار اماں کے ساتھ بابا سے ملنے

تھانے گئی تھی اور وہاں بابا کی خون میں لت پت لاش دیکھی تھی' چوہدری نیاز مجھے اور اماں کو اپنی جیپ میں گھر لایا تھا۔ گو اس عرصے میں کچھ تبدیلیاں بھی رونما ہو چکی تھیں۔ مثلاً بڑی مسجد کے برابر والے خالی میدان میں تین کچے مکان بن چکے تھے۔ اب اس حصے میں بھینسوں کا باڑا بھی بن گیا تھا۔ اب الٹے ہاتھ کو مڑنے والی گلی تقریباً بند ہو گئی تھی بلکہ سیدھے ہاتھ کو مڑنے والا راستہ ہی آگے جا کر دوسری سمت مڑ جاتا تھا۔ یہاں سے تھانے کا راستہ لمبا ہو گیا تھا' اور میں وہی راستہ جانتی تھی اس لئے سمٹی سمٹائی' چوکنے انداز میں اس طرف بڑھ گئی۔ مسجد کی طرف مڑتے ہی مجھے دور سے آتی ہوئی آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا اور پھر لپک کر مسجد کے آگے بنے ان مکانوں کے طرف بڑھ گئی جو نئے بنے تھے۔ ایک دیوار کے پیچھے کھڑے ہو کر میں نے کمر دیوار سے ٹکائی آنے والے تین آدمی تھے۔ شاید وہ تھلے پر کام کرنے والے مزدور تھے۔ وہ باتیں کرتے ہوئے نزدیک آئے تو میں نے سانس بھی روک لیا۔ میں جس دیوار سے لگی کھڑی تھی اس پر تھوڑی سی دور ایک کھڑکی بنی ہوئی تھی جو اس وقت بند تھی۔ یہ کھڑکی میری بائیں جانب تھی اور دائیں جانب سے وہ لوگ آ رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی کہ آنے والے اس گلی میں نہ مڑیں' اگر ایسا ہوتا تو میں دیکھ لی جاتی یہاں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جس کی آڑ لے کر میں ان لوگوں کو نگاہوں سے چھپ سکتی۔ گو یہاں اندھیرا بھی تھا اور میں دیوار سے چپکی کھڑی تھی مگر گلی اتنی تنگ تھی کہ داخل ہونے والا باآسانی میری موجودگی سے باخبر ہو سکتا تھا۔ جوں جوں باتیں کرنے کی آواز قریب آ رہی تھی' ویسے ویسے میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اس وقت تو میرا دم ہی نکل گیا جب آنے والے تینوں میرے قریب اس چوڑی گلی میں کھڑے ہو گئے۔

اچھا جمالے کل ستو لے کر آنا۔ اور ہاں سن ..... رحمت بابا سے کہنا میں کل نہیں آؤں گا۔ کل میری نوں آ رہی ہے۔ شیدان کو بھی حکیم کے پاس جانا ہے' میں تھلے پر آؤں گا۔ تو اس سے کہہ دینا۔" ایک آدمی کی آواز آئی۔

میں نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ بس یہ شخص اس طرف مڑنے والا ہے۔ باقی دونوں نے غالباً اسے خدا حافظ کہا تھا پھر دو آگے بڑھ

گئے جب کہ ایک وہیں رک گیا۔ وہ دونوں آگے بڑھے تو مجھے نظر آ گئے مگر تیسرا میری نگاہوں سے اوجھل تھا۔ میں دیوار سے لگی کھڑی رہی۔ ٹھنڈ ہونے کے باوجود پسینا میری کنپٹیوں سے بہہ کر رخساروں تک آگیا تھا۔ وہ آگے بڑھتے چلے گئے تب میں نے ذرا سا سرک کر چوڑی گلی میں جھانکا۔ مجھے اس تیسرے شخص کی فکر تھی جس کے قدموں کی آہٹ تو آ رہی تھی مگر وہ میری نگاہ سے اوجھل تھا۔ اسے مخالف سمت جاتے دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ میں نے پھیپھڑوں میں بھری ہوا ایک لخت خارج کر دی۔ چادر کے پلو سے منہ پر آیا ہوا پسینا پونچھا اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ پسینے سے بھرے بدن سے ٹھنڈی ہوا ٹکرائی تو لمحہ بھر کو بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ میں نے پھر جھانک کر دیکھا۔ وہ شخص اندھیری گلی میں غائب ہو چکا تھا۔ میں نے آہٹ سننے کی کوشش کی مگر کوئی آواز محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے چادر کو دوبارہ سر پر جمایا اور گلی سے نکلنے کے لئے قدم بڑھایا ہی تھا کہ مجھے لگا جیسے کوئی دبے پاؤں اس طرف بڑھ رہا ہو۔ میں پھر سہم کر سمٹ گئی۔ مگر کافی دیر تک کوئی نہیں آیا نہ ہی آواز دوبارہ سنائی دی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا' گلی میں جھانکا اور پورے اطمینان کے بعد میں نے پھر چوڑی والی گلی میں جھانکا اور پورے اطمینان کے بعد میں پھر چوڑی والی گلی میں نکل آئی۔ اب میں تھانے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں بیچ گلی کی بجائے مکانوں کے کنارے کنارے آگے بڑھتی رہی۔ تھانہ بہت دور نہیں تھا مگر پھر بھی یوں لگ رہا تھا جیسے راستہ بہت لمبا ہو گیا ہو۔ شاید اس لئے کہ میں کسی نگاہوں میں آئے بغیر وہاں پہنچنے کی کوشش میں آہستہ اور چاروں طرف دیکھتی ہوئی چل رہی تھی اور کوئی بھی گلی عبور کرتے وقت کسی دیوار کے سائے میں دبک جاتی تھی اور جب تک دونوں جانب دیکھ کر اپنا اطمینان نہ کر لیتی آگے نہیں بڑھتی تھی۔

میں نہیں جانتی کہ میں کتنی دیر بعد تھانے والی سڑک پر پہنچی مگر لگ ایسا ہی رہا تھا جیسے یہاں پہنچنے میں زمانے بدل گئے ہوں۔ میری دونوں پنڈلیوں کے پٹھے اینٹھے ہوئے تھے اور درد کی لہریں سی کمر کی طرف جاتی محسوس ہو رہی تھیں۔ مگر تھانے کو سامنے دیکھ کر میری ساری تھکن جیسے ہوا ہو گئی۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر لی۔ تھانے کے اندر برآمدے میں جلنے والا بلب اپنی روشنی دور تک بکھیر رہا تھا۔ میں سامنے کی طرف جانے کی بجائے تھانے کی پچھلی طرف بڑھ گئی۔ اس جانب اندھیرا تھا۔ تھانے کی پشت پر پہنچنے کے بعد میں

دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اس طرف سپاٹ دیوار تھی' کوئی کھڑکی اور کوئی دروازہ نہ تھا۔ شاید یہی دیکھ کر میری ساری تھکن لوٹ آئی تھی۔ تھانے کے اندر جانے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیسے پتا کروں کہ وہ کون لوگ ہیں جنہیں چوہدری نیاز کی حویلی میں آگ لگانے کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ اس طرف کوئی سپاہی بھی نظر نہیں آ رہا تھا' ممکن ہے کہ ٹھنڈ کی وجہ سے وہ لوگ بھی اندر بیٹھے ہوں۔ اب سردی مجھے بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں دیوار کے پاس' سرکتی ہوئی اس طرف آ گئی جہاں میں تھانے کے سامنے والی گلی پر نظر رکھ سکتی تھی۔ یہاں اندھیرے کے ساتھ ساتھ جھاڑیاں بھی تھیں۔ میں کوئی بھی خطرہ محسوس کر کے جھاڑیوں میں دبک سکتی تھی مگر یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ میں کیسے پتا کروں یہاں بیٹھے بیٹھے کیا کروں۔ اب محسوس ہو رہا تھا کہ میں واقعی کم عقل ہوں اور سوچے سمجھے بنا قدم اٹھا لیتی ہوں۔ یہاں سردی میں سکڑتے رہنے سے بھلا کیا ہوتا؟

میں حیران بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اچانک کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے پیچھے سرک گئی۔ آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی جھاڑیوں پر روشنی پڑی اور لگا جیسے آنے والی گاڑی تھانے کے پاس آ کر رک گئی ہو۔ پھر چند لوگوں کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میرا جی چاہا کہ جھانک کر آنے والوں کو دیکھوں' مجھے یقین تھا کہ آنے والا چوہدری نیاز خود یا اس کے آدمی ہیں کیوں کہ ہمارے گاؤں میں صرف چوہدری نیاز ہی کے پاس کار اور ایک جیپ تھی مگر میں اس وقت کسی قسم کا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ سو میں نے اپنی تمام تر قوتیں اپنی سماعت میں سمیٹ لیں اور کان ان کی آوازوں پر لگا دیئے۔

چند لمحوں بعد ہی مجھے باتوں کی آواز آنے لگی۔ ایک بھاری سی آواز سنائی دی جو غالباً آنے والے سے باتیں کر رہا تھا۔ میں ذرا سی آگے سرک آئی۔ اب آواز صاف آ رہی تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ "گل سنو! چوہدری جی آکھ دے نے پٹھو نوہ تکلیف نئیں دینی۔ اے بڑے کم دا بندہ ہے گا۔ پر دینو اور ماجے دا جو دل میں آوے کرو' پٹھو دے نال جیہڑا ہے گا او بھی ساڈے کم دا ہے گا۔ تُسی نیوے بندوں نوں آرام نال رکھو۔ چوہدری جی دن وسیلے آویں گے۔"

"تُسی فکر ای نہ کرو۔ اس ویلے تے دینو اور ماجا وی ہوش میں نئیں ہیں۔ تُسی سنے چمڑی ای ادھیڑ چھڈی آ۔"

جواب دینے والا ہنس رہا تھا۔ یوں جیسے کٹھ پتلی کے کسی تماشے کا ذکر کر رہا ہو۔ اس گفتگو سے اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ دینو اور ماجے کو بھی چوہدری نیاز نے موقع غنیمت دیکھ کر پولیس کے حوالے کر دیا ہے مگر نئے لوگوں کا سن کر سہم اٹھی تھی۔ آنے والے نے ایک کو پٹھو کہا تھا۔ پتا نہیں یہ اس کا نام تھا یا یونہی کہا گیا تھا۔ ماجے اور دینو کے بارے میں جان جانے کے باوجود میں اب تک اندھیرے میں تھی۔ میں نے پھر باہر کھڑے لوگوں کی باتوں پر کان لگا دیئے اب وہ لوگ دوسری باتیں کر رہے تھے اور اونچے قہقہے لگا رہے تھے۔ میں بڑی توجہ سے ان کی گفتگو سن رہی تھی کہ شاید کسی وقت ان لوگوں کے منہ سے ان دوسرے لوگوں کا بھی نام نکل جائے مگر اب گفتگو کا موضوع بدل چکا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ فیر میں چلیا..... تُسی خیال رکھنا۔"

یہ آواز سنتے ہی میں نے آہستگی سے سر باہر نکالا اور جیپ میں بیٹھنے والے کو دیکھنا چاہا۔ وہ عبدالقادر قطعی نہیں تھا میں اس کی آواز پہچانتی تھی۔ میں باوجود کوشش کے اس کی صورت نہیں دیکھ سکی۔ وہ جیپ میں بیٹھ گیا اس کے چہرے پر روشنی نہیں تھی بلکہ تھانے کے بلب کی روشنی اس کے کپڑوں پر پڑ رہی تھی' پھر میں اتنی دور تھی کہ اس کی صورت ہلکی روشنی میں پہچانی بھی نہیں جا رہی تھی۔ اس کے قریب ہی دو سپاہی کھڑے تھے جن کی پشت میری جانب تھی۔ میں اس طرف سے مایوس ہو کر پھر دیوار سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ جہاں میری پریشانی نئے لوگوں کا سن کر بڑھ گئی تھی وہاں یہ سن کر مجھے اطمینان بھی ہوا تھا کہ دینو' ماجا دونوں زندہ ہیں ورنہ میں تو سمجھی تھی کہ شاید چوہدری نیاز نے ان دونوں کو جان ہی سے مار دیا ہو گا۔ میرے ذہن میں بالی اور ریشماں کا چہرہ گھوم گیا۔ پتا نہیں بالی' ماجے کے متعلق جانتی بھی تھی یا نہیں اور ریشماں کی کیا حالت ہو چکی ہو گی' اس بوڑھا باپ تو پہلے ہی پاگل ہو گیا تھا۔ بالے کی موت کا صدمہ اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر گیا تھا تو دینو کی گمشدگی نے اس پر کیا قیامت توڑی ہو گی۔ میں دیوار سے سر ٹکا کر سوچ رہی تھی اس وقت جیپ سٹارٹ ہونے کی گھر گھراہٹ سناٹے کو چیر گئی اور میں چونک اٹھی۔ جیپ الٹی چلتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ سامنے کی جھاڑیوں پر لمحہ بھر

روشنی ہوئی اور تاریکی میں ڈوب گئیں۔ وہ دونوں سپاہی اب بھی باہر کھڑے تھے جس طرف کا راستہ میرے گھر کی طرف جاتا تھا اور جو میرا جانا پہچانا راستہ تھا۔ اب میں اس وقت وہاں سے نکل سکتی تھی جب یہ دونوں سپاہی اندر چلے جاتے۔ ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی۔ گھر سے چلتے وقت مجھے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ میں کوئی گرم چادر وغیرہ لے لیتی۔ اس طرف تو جھاڑیوں کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی ٹھنڈ تھی۔

"یار مجھے تو لگتا ہے کہ کوئی چوہدری کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ پہلے کچھ لوگوں نے چوہدری کے بھائی چوہدری فیاض کو گولی ماری اور اب اس کی حویلی میں آگ لگا دی۔" اچانک ایک سپاہی بولا تو میں چونک اٹھی۔ وہ پھر موضوع پر آ گئے تھے۔

"شش....." دوسرے نے سرگوشی کی۔ "چوہدری فیاض کو کسی نے گولی نہیں ماری۔ اس کے سر پر گہرا زخم آیا تھا۔ وہ چوہدری کی حویلی میں تھا۔ کل رات تو پہنچا تھا یہاں رات اس کی حویلی میں گزاری تھی باہر نکلا ہی نہیں تھا۔" دوسرا سپاہی اسے آہستہ آہستہ بتا رہا تھا۔ مجھے ان کی آوازیں بڑی مشکل سے سنائی دے رہی تھیں۔ میں اور آگے کی طرف سرک آئی اب بھی ان کی پشت میری جانب تھی۔

"تیرا مطلب ہے کہ اسے....."

"چپ کر جا..... بات منہ سے نکلی تو کوٹھے چڑھ جائے گی۔" پہلے سپاہی نے تیز لہجے میں کہا۔

"ایک تو میں تیرے محاوروں سے تنگ آیا ہوا ہوں۔ آسان زبان میں بات نہیں کر سکتا تُو؟"

"پڑھا لکھا ہوں پھر کیوں آسان زبان میں بات کروں۔ میں نے آٹھ جماعتیں پڑھی ہیں آٹھ' اور اب بھی جو کتاب یا اخبار ہاتھ لگے ضرور پڑھتا ہوں۔ میں بھی آسان زبان میں بولنے لگا تو لوگ کہیں گے کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا۔" دوسرے نے فخر سے گردن اکڑا کر کہا۔

"اچھا چھوڑ یہ تو بتا پھر چوہدری نیاز نے جو فیاض چوہدری کے لیے بیان دیا تھا کہ دینو' ماجے کادے اور امام دین نے جس کے ساتھ ایک لڑکی تھی چوہدری فیاض کو گولی مار دی' دونوں آدمی اور لڑکی نکل گئے اور وہ دونوں رہ گئے تو پھر اس ویلے اس نے ان

دونوں کو ہمارے حوالے کیوں نہیں کیا تھا.....اب تک کہاں رکھا ہوا تھا؟ اور اب یہ آگ والی کہانی ڈال کر انھیں کیوں ہمیں دے دیا؟"

وہ بھی کہانی تھی یار اور یہ بھی کہانی ہے۔ پہلے بھی اس نے مشہور کیا تھا کہ وہ ان دونوں کو ہمارے حوالے کر چکا ہے پھر کیا نہیں تھا۔ دکھاوا تھا' صبح جیپ میں ڈال کر لایا تھا اور شام ہونے سے پہلے واپس لے گیا تھا۔ تھانے میں جو لاک اپ ہے اس سے اچھی لاک اپ تو اس کی حویلی کے پچھلے حصے میں تھی۔ آگ لگنے سے جل گئی ہوگی جبھی تو یہاں لے آیا۔ سالا ایک گھنٹے میں چھ دشمن پیدا کر لیتا ہے۔ اب تماشا تو اس وقت ہو گا جب چوہدری فیاض اپنے گھر پہنچے گا۔ اس کی ساری اولاد پڑھی لکھی ہے۔ وہاں چوہدری نیاز کی کہانیاں نہیں چلیں گی۔" اس نے ایک ہاتھ نچا کر عورتوں کی طرح کہا۔

"اس کے کسی بیٹے نے تفتیش شروع کر دی تو دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

اس کے آخری جملے نے میرے ذہن میں ایک جھماکا سا کر دیا۔ مجھے راستہ سمجھا دیا۔ میں چوہدری فیاض کے بیٹے سے مدد حاصل کر سکتی تھی۔ میں اسے حقیقت بتا کر صحیح صورتِ حال واضح کر سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ باپ کی اس حالت پر خاموش نہیں بیٹھے گا۔ اب میرا جی چاہ رہا تھا کہ دونوں سپاہی جلد سے جلد یہاں سے ٹلیں تو میں خالہ فاطمہ کے گھر کی طرف بھاگ پڑوں۔ میں یہاں جس کام سے آئی تھی وہ ادھورا تھا مگر ان سپاہیوں کی باتوں سے اندازہ ہو چکا تھا کہ کادا اور بابا محفوظ ہیں۔ یہی ہو سکتا تھا کہ دینو اور ماجے کے ساتھ پکڑے جانے والا کملا اور ماما ہوں۔ کادا اگر باہر تھا تو وہ یقیناً رات کے کسی بھی پہر خالہ فاطمہ کے گھر پہنچے گا۔ اگر وہ میری غیر موجودگی میں پہنچا تو غضب ہو جائے گا۔ خالہ فاطمہ اسے میری بتائی ہوئی تفصیل بتا کر لوٹا دے گی اور میں پھر اس کا انتظار کرتی رہ جاؤں گی۔ وہ جانے کہاں کہاں مجھے تلاش کرے گا اور جانے کیا کیا سوچے گا۔ میں مضطرب ہو گئی تھی۔ وہ دونوں سپاہی اتنی ٹھنڈ کے باوجود وہیں کھڑے تھے۔ ٹھنڈک دیوار سے میرے بدن میں منتقل ہونا شروع ہوئی تو میں دیوار سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ لمحہ لمحہ صدی بن کر رہ گیا تھا۔ تھانے کے اندر جانے کا بھی کوئی راستہ' کوئی طریقہ نہ تھا کہ میں دینو یا ماجے کے لیے کچھ کر سکتی۔

اسی وقت مجھے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز نے چونکا دیا۔ دونوں سپاہی بھی پلٹ کر تھانے کی اندر کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ کچھ گڑبڑ سی محسوس ہوئی پھر کسی نے چیخ کر باہر کھڑے سپاہیوں سے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ مگر وہ ایسی ہی بات تھی کہ دونوں سپاہی بوکھلا کر رہ گئے۔

"کی ہویا؟" ایک نے چیخ کر کہا۔ میں سر نکالے اس جانب دیکھ رہی تھی تبھی میں نے اچانک دھماکے کی زبردست آواز سنی اور اس آواز کے ساتھ ہی ایک سپاہی جو باہر کھڑا تھا الٹ کر زمین پر گر پڑا۔ میں جو دھماکا سن کر لرز اٹھی تھی بھاگ کر جھاڑیوں میں گھس گئی۔ اب مجھے سامنے کا کافی حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس سپاہی کے گرتے ہی جیسے وہاں قیامت سی مچ گئی۔ کئی سپاہی تھانے سے نکل کر بھاگتے ہوئے سامنے کی اندھیری گلی میں داخل ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ وہ ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے اور بُری طرح چیخ رہے تھے۔ میں نے ان سب کو اِدھر اُدھر بھاگتے دیکھا اور دبک گئی۔ اس وقت ایک سپاہی ہاتھ میں بندوق تھامے تھانے کی پچھلی طرف بھاگتا ہوا آیا اور جھاڑیوں کے بالکل قریب کھڑا ہو کر چوکنی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میرا تو دم ہی نکل گیا۔ میری ہلکی سی جنبش میرے لیے خطرہ بن سکتی تھی۔ میں نے سانس تک روک لیا اور آنکھیں پھاڑے اپنے سر پر کھڑے اس سپاہی کو دیکھنے لگی۔ اسی وقت کوئی چیخا۔ "رحمان گل.....!"

میرے سر پر کھڑا سپاہی ایک دم پلٹا۔ "آہو" اس نے چیخ کر جواب دیا۔

"او سامنے گیا سی....." دور سے چیخنے والے نے کہا اور یہ سنتے ہی میرے سر پر کھڑا سپاہی پلٹ کر بھاگا۔ مجھے یوں لگا جیسے اب بھی اگر وہ نہ جاتا تو میں دم گھٹنے سے مر جاتی۔ میں نے گہرے گہرے سانس لیے تو کچھ ہوش آیا۔ میرا یہاں سے نکلنا ناگریز ہو چکا تھا مگر خطرہ تو اب چاروں طرف دور دور تک سپاہیوں کی شکل میں پھیل چکا تھا جو کسی کی تلاش کر رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے کوئی ملزم بھاگ نکلا ہے۔ کچھ سپاہی اسی زخمی سپاہی کے پاس کھڑے زور زور سے بول رہے تھے انھی کی باتوں سے پتہ چلا کہ دینو اور ماجے کے ساتھ پکڑا جانے والا ایک مرد بھاگ گیا ہے۔ اس نے اندر بھی کسی سپاہی کو زخمی کر دیا اور اس کی بندوق لے کر بھاگ گیا جس سے اس نے باہر والے سپاہی پر گولی چلائی تھی۔ وہ

سپاہی مرا نہیں تھا مگر شدید زخمی تھا۔ ذرا دیر بعد ہی ایک گاڑی آگئی جس میں اس زخمی پولیس والے کو دو اور پولیس والے غالباً گاؤں کی ڈسپنسری لے گئے۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد کچھ سناٹا ہوا۔ پانچ چھ سپاہی تو اس بھاگے ہوئے ملزم کو تلاش کرنے چلے گئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اب تھانے میں ایک دو ہی پولیس والے رہ گئے ہوں گے..... میرا جی چاہا کہ میں اب تھانے میں جا کر، کوئی بہانہ بنا کر پتا کرنے کی کوشش کروں کہ دینو اور ماجے کی کیا حالت ہے اور بھاگنے والا کون تھا مگر یہ صرف سوچ کر ہی رہ گئی۔ مجھے کاوے کی فکر بھی تھی۔ اب تو کافی رات ہو گئی تھی۔ میں نے کچھ سکون دیکھ کر آہستہ آہستہ جھاڑیوں ہی میں پیچھے کی طرف سرکنا شروع کر دیا۔ مجھے یاد تھا کہ اس طرف جھاڑیاں ختم ہونے کے بعد ایک ندی بہتی ہے اور ندی کے ساتھ ساتھ اگر دائیں طرف نکلیں تو تین یا چار کوس کے بعد بڑی سڑک آجاتی ہے۔ میں نے سوچا کہ سامنے سے نہ جا سکی تو بڑی سڑک پر پہنچ کر وہاں سے تھلے کی جانب جا کر میں خالہ فاطمہ کے گھر تک پہنچ سکتی ہوں کم از کم یہاں سے تو دور ہو ہی جاتی اور اچانک پڑنے والی افتاد سے محفوظ ہو سکتی تھی ورنہ اب پولیس والے کافی چوکنے ہو چکے تھے اور ہر تھوڑی دیر بعد ایک سپاہی ہاتھ میں بندوق لیے باہر آتا اور چاروں طرف نگاہیں دوڑا کر پھر اندر چلا جاتا تھا اس لیے اب میں اس راستے سے واپس جانے کا تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی جس طرف آئی تھی۔ جھاڑیوں کی ٹھنڈک اب ہڈیوں تک سرایت کر گئی تھی اور اب سردی ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی میں نے تیزی سے پیچھے کی طرف سرکنا شروع کر دیا مگر میرا منہ اب بھی اسی طرف تھا تاکہ میں باہر آنے والے اور پہرا دینے والے سپاہی پر نظر رکھ سکوں۔ جب وہ سپاہی اندر چلا جاتا تو میں اپنی رفتار تیز کر دیتی اور جب وہ باہر آتا تو پھر جھاڑیوں میں دبک جاتی تھی۔

دھیرے دھیرے میں تھانے سے دور ہوتی چلی گئی۔ یہ جھاڑیاں زیادہ دور تک نہیں تھیں۔ وہ جلد ہی ختم ہو گئیں۔ اب چھوٹی بڑی کھائیاں تھیں۔ گڑھے تھے، بعض گڑھوں میں گندا پانی بھرا ہوا تھا۔ میں سنبھل کر چلتی ہوئی پتھروں پر قدم رکھتی ہوئی، اس طرف بڑھنے لگی جہاں سے راستہ پکی سڑک پر جاتا تھا۔ راستہ لمبا تھا مگر میں تو جان بچانے کے لیے جو راستہ عبور کر رہی تھی وہ اب برسوں پر محیط ہو چکا تھا۔ اس کے آگے یہ چند کوس کا فاصلہ بھلا کیا اہمیت رکھتا تھا مگر آج میں جانتی تھی کہ کاوا میرا منتظر ہو گا۔ منزل میری راہ

دیکھ رہی ہو گی، اس لیے میں جلد از جلد اس تک پہنچ جانا چاہتی تھی۔ آج تو لمحوں کا فاصلہ بھی ایک صدی جتنا لگ رہا تھا۔

اب تھانہ پیچھے رہ گیا تھا۔ آسمان پر بکھرے ستاروں کی روشنی میں راستہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں جھاڑیوں کی نسبت ٹھنڈک کچھ کم تھی اور پھر چلتے رہنے کی وجہ سے بھی بدن میں حرارت تھی اس لیے سردی زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں جلد از جلد اس ناہموار راستے سے گزرنا چاہتی تھی۔ مجھے خوف بھی تھا کہ پولیس والے اس بھاگنے والے کو تلاش کرتے ہوئے اس طرف آگئے تو اس وقت یہاں موجودگی کا کیا بہانہ کروں گی۔ میں جلد ہی پکی سڑک تک پہنچ گئی۔ یہاں سے جو راستہ خالہ فاطمہ کے گھر کی طرف جاتا تھا وہ کافی لمبا تھا لیکن اب میں تھانے سے بہت دور نکل چکی تھی۔ گو رات زیادہ ہو گئی تھی مگر دور سڑک کے اس پار لاری اڈے پر کافی رش تھا۔ ہوٹلوں کے باہر بینچوں پر لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں اندھیری گلی سے ہوتی ہوئی خالہ فاطمہ کے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ ابھی زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ مجھے بھاگتے ہوئے قدموں کی آہٹ آئی۔ میں ایک مکان کی آڑ میں ہو گئی۔ میرے بدن پر لپٹی کالی چادر مجھے بچانے میں معاون ثابت ہو رہی تھی جو اندھیرے میں میرے وجود کو چھپا کر اندھیرے ہی کا حصہ بنا دیتی تھی۔ مجھ سے تقریباً بیس قدم کے فاصلے پر ایک مکان کا دروازہ تھا جو اس وقت کھلا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر آنے والے پولیس کے سپاہی ہوئے تو میں اس کھلے دروازے میں داخل ہو جاؤں گی۔ یہی سوچ کر میں دیوار سے چپکی ہوئی دروازے کی طرف سرکنے لگی۔ ابھی میں دروازے سے دور تھی کہ میں نے ایک سائے کو دبے پاؤں اس کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اسے خود سے اتنے قریب پا کر میں نے سانس روک لیا۔ میں بال بال بچی تھی اگر میں نے سرکنے میں ذرا سی بھی تیزی سے دکھائی ہوتی تو دھر لی جاتی۔ جانے یہ کون تھا؟ میں حیرت سے سوچ رہی تھی کیونکہ اس نے مجھے سخت خطرے میں ڈال دیا تھا۔ وہ اندر جا کر دروازہ بند کر گیا تھا۔ اس کا انداز ایسا نہیں تھا کہ میں اسے اس کے گھر کا فرد سمجھتی۔ اب میں سخت خطرے میں تھی۔ بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا کروں؟ اسی لمحے میں نے چاروں طرف دیکھا۔ سامنے کوڑا کرکٹ ڈالنے والا ڈرم پڑا تھا۔ میں جلدی سے اس طرف بڑھی اور بغیر سوچے

سمجھے اس میں داخل ہو کر چھپ گئی۔ یہاں بھی خدا میرے ساتھ تھا میں نے جونہی سر اندر کیا' غالباً وہ لوگ عین اسی لمحے اس گلی میں داخل ہوئے کیونکہ ٹارچ کی روشنی کا دائرہ میرے سر پر سے ہو کر گزر گیا۔ آنے والے شاید تین چار افراد تھے۔ وہ باتیں بھی کر رہے تھے۔

"وہ اس طرف نہیں آیا یار..... ایک تو تم لوگ بات نہیں مانتے ہو۔" ان میں سے ایک بڑے بیزار کن لہجے میں بولا۔

"میں نے خود دیکھا تھا۔ وہ بڑی سڑک سے پہلے کھیتوں کی طرف مڑا تھا پھر پلٹ کر اس طرف آگیا تھا۔" دوسری آواز سنائی دی۔

"اب کر لو تلاش! وہ یہیں کھڑا ہو گا ناں؟ ابے وہ نکل بھی چکا ہو گا۔ ایک تو یہ سالا چوہدری عذاب بن گیا ہے ہمارے لیے' یہ مجرم نہ لائے تو پورے گاؤں میں امن ہی امن ہے۔ پتا نہیں کہاں سے کھود کر مجرم نکال لیتا ہے۔" وہی بیزار شخص بڑبڑا رہا تھا۔

"اچھا اب کیا کرنا ہے؟" ایک اور آواز آئی۔

"مجھے تو کچھ نہیں کرنا۔ واپس چلو کہہ دیں گے کہ کہیں نہیں ملا۔ اس نے بھی تو کتے پالے ہوئے ہیں' ان سے تلاش کروائے ناں؟"

"گویا اس کو یوں ہی کھلا چھوڑ دیں۔ تھانیدار کی بدلی کروا دے گا وہ حرامی۔"

"اچھا ہے کروا دے۔ سالا خود تو اس سے ہزاروں بٹور لیتا ہے ہمیں ٹکوں پر ٹرخا دیتا ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں ابا ٹھیک کہتا تھا کہ چھولوں کا ٹھیلا لگا لے' سکون سے سوئے گا۔"

اس کی بات سن کر باقی لوگ ہنس پڑے۔ شاید وہ لوگ پلٹ گئے تھے۔ ان کے قدموں کی چاپ دھیرے دھیرے دور ہو رہی تھی۔ میرا بدبو سے دماغ پھٹ رہا تھا۔ پیر گندے ہو چکے تھے' میں چادر کو خوب اچھی طرح لپیٹے بیٹھی تھی۔ انھیں جاتا محسوس کر کرے میرا دم ٹھہرا ورنہ جب وہ قریب کھڑے باتیں کر رہے تھے تو میرا دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔ میں نے ذرا سا جھانک کر دیکھا وہ لوگ مڑ رہے تھے۔ ان کے مڑتے ہی میں دبے پاؤں باہر آگئی۔ باہر آتے ہی میری نگاہ اس دروازے پر پڑی جو بے آواز کھلتا جا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی دروازے میں جھری بنا کر دیکھ رہا ہے۔ وہ جو کوئی بھی

تھا یقیناً مجھے دیکھ چکا ہے۔ مجھے تو یہ جان کر ڈھارس ہوئی تھی اور یقین تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو تھانے میں سے بھاگا ہے' یہ ماما یا کملا بھی ہو سکتا تھا اور دینو بھی! میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے کے قریب پہنچ گئی۔ مجھے قریب آتا دیکھ کر بھی اس نے دروازہ بند نہیں کیا۔ اندر گہرے اندھیرے کے باعث نظر نہیں آرہا تھا کہ وہاں کوئی کھڑا ہے یا نہیں مگر جب میں بالکل قریب پہنچ گئی تو مجھے کوئی دکھائی نہ دیا۔ دروازہ ایسے ہی کھلا ہوا تھا۔ لمحہ بھر کو تو یوں لگا جیسے میں نے اب سے پہلے کوئی خواب دیکھا تھا وہ سایہ میرا وہم تھا' یہ سوچ کر میں نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اندر جھانکنا چاہا تبھی لگا جیسے قیامت سی آگئی ہو۔ کسی نے اچانک ہی مجھے دبوچ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میری بے ساختہ چیخ نکلتی وہ میرا منہ دبا چکا تھا۔ میں غوں غوں کرتی اور ہاتھ پاؤں مارتی رہ گئی مگر اس کی مضبوط گرفت سے نہیں نکل پائی۔ وہ مجھے گھسیٹتا ہوا اندر کی جانب لے جا رہا تھا۔ اس سے قبل ہی اس نے دروازے کی کنڈی چڑھا دی تھی۔ اسے یقیناً ان پولیس والوں سے بھی خطرہ تھا جو کتوں کی طرح اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ میں روشنی میں اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ روشنی میں جاتے ہی وہ مجھے چھوڑ دے گا مگر اندر داخل ہوئی تو وہاں بھی گھپ اندھیرا تھا۔ کوٹھڑی میں داخل ہوتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ وہاں ہم دونوں کے علاوہ بھی کوئی ہے' اور جو بھی ہے اسے وہ پہلے ہی باندھ چکا ہے۔ اس کا منہ بھی بند تھا شاید بندھا ہوا تھا کیونکہ وہاں سے بھی غوں غوں کی سی آواز آرہی تھی اور لگتا تھا کہ جیسے کوئی چارپائی سے اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے' چارپائی کی چرچراہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ میرے منہ پر سے اپنا چوڑا پھاوڑے جیسا ہاتھ ہٹائے تو میں کچھ بولوں مگر اس نے مجھے بُری طرح دبوچ رکھا تھا پھر اس نے سب سے پہلے میرے منہ پر کپڑا لپیٹا' مجھے اتنا موقع ہی نہ دیا کہ میں کچھ بولتی۔ اچھی طرح باندھنے کے بعد اس نے میرے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیے' اب میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں اور وہ بھی اس اندھیرے میں کچھ تلاش کر رہا تھا اور میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ ماما ہے یا کملا مگر کبھی وہ مجھے ماما لگتا تھا' کبھی کملا اور کبھی میں سوچتی تھی کہ یہ دینو یا ماجا اب وہ کچھ بول ہی نہیں رہا تھا کہ میں پہچان سکتی۔

میں خود کو آزاد کرنے کی سب کوشش کر چکی تو بے دم سی ہو گئی' اس نے مجھے ایک ٹوٹی ہوئی سی منجھی پر ڈالا ہوا تھا۔ میرے پیر آزاد تھے اور میں حیران تھی کہ اس نے میرے پیر کیوں آزاد رکھے ہیں۔ وہ یہاں وہاں کچھ ٹٹول رہا تھا۔ پھر وہ کوئی کپڑا لے آیا کیونکہ اس نے اس بار میرے پاؤں کسی کپڑے سے باندھ دیے۔ اب میں بالکل بے بس ہو چکی تھی۔ مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر غالباً دوسری منجھی تھی جس پر کوئی اور بندھا پڑا تھا۔ وہ جو بھی تھا اس گھپ اندھیرے میں بڑی مہارت سے یہاں وہاں پھر رہا تھا یوں جیسے اسے سب کچھ صاف نظر آرہا ہو۔ چند لمحوں بعد وہ کوٹھڑی سے باہر چلا گیا۔ میں کان لگائے لیٹی رہی تاکہ اندازہ لگا سکوں کہ وہ گھر کے اندر ہے یا باہر چلا گیا۔ پہلے مٹکے سے پانی انڈیلنے کی آواز آئی پھر اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دی مگر وہ کمرے میں نہیں آیا پھر یوں لگا جیسے کسی نے باہر سے کنڈی گرائی ہو۔ دروازہ اسی مانوس آواز کے ساتھ کھل گیا جیسے میرے کھولنے پر کھلا تھا اور اوپر لٹکی ہوئی کنڈی دروازے پر ٹکرائی تھی۔ وہ غالباً باہر چلا گیا تھا یا شاید باہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں سخت بے چین تھی کہ اس سے بات کروں۔ اسے بتاؤں کہ میں اس کی دشمن نہیں ہوں بلکہ ایک لحاظ سے دوست ہوں وہ بھی چوہدری نیاز کا ڈسا ہوا ہے اور میں بھی اس کے زہر سے تڑپ رہی ہوں۔ میں اس سے ماجے اور دینو کی خیریت بھی معلوم کرنا چاہتی تھی اور اگر وہ ماجا یا دینو تھا تو میں جاننا چاہتی تھی کہ دو نئے آدمی کون ہیں جنھیں چوہدری نے پکڑ کر پولیس کے حوالے کیا ہے۔ وہ ماما ہرگز نہیں تھا کیونکہ جس وقت اس نے مجھے دبوچا تھا تو مجھے اس کا جسم مضبوط اور کچھ فربہ لگا تھا جب کہ ماما تو بہت لاغر ہو چکا تھا۔ ماما کی گرفت اتنی سخت اور ہاتھ اتنا چوڑا نہیں ہو سکتا تھا پھر اس کے پاس سے جو اماں کی خوشبو آتی تھی وہ بھی محسوس نہیں ہوئی تھی بلکہ عجیب سی ناگوار بدبو نتھنوں میں گھس گئی تھی۔ ممکن ہے وہ کملا ہو۔ بہرحال میں اس سے بات کرنے کے لیے بے چین تھی مگر وہ دوبارہ کوٹھڑی میں نہیں آیا۔ میں اس کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اچانک برابر والی منجھی پھر بول اٹھی۔ شاید اب سے پہلے اس پر جو شخص بندھا ہوا تھا وہ میری طرح ساکت ہو کر اس آدمی کی حرکات و سکنات محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب وہ ہلا تو میری توجہ بھی اس کی جانب مبذول ہو گئی۔ میں نے منجھی پر سے اٹھنے کی کوشش کی' مجھے دشواری صرف اس لیے ہو رہی تھی کہ وہ شخص مجھے جس منجھی

پر ڈال گیا تھا وہ بہت ڈھیلی تھی اور اس وقت میں اس پر عجیب کمان بنی ہوئی پڑی تھی' اگر منجھی سیدھی ہوتی تو میں آسانی سے اٹھ کر بیٹھ سکتی تھی۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہونے کی وجہ سے میرے شانے شل ہو چکے تھے اور کلائیوں میں بلا کا درد تھا۔ میں اٹھنے کی کوشش کرتی رہی مگر مجھے لگا جیسے میں اٹھ کر بیٹھی بھی تو کھڑا ہونا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ برابر والی منجھی مسلسل ہل رہی تھی اور کافی شور کر رہی تھی۔ میں نے سر گھما کر دیکھا' اس پر لیٹا وجود اب اٹھ بیٹھا تھا۔ میری نگاہیں اس پر گڑی رہی۔ وہ مینڈک کی طرح اچھلتا ہوا دروازے کے روشن چوکھٹے کی طرف بڑھا تو میں جان سکی کہ اس کے بھی دونوں ہاتھ پیر باندھے گئے ہیں۔ ہمیں باندھنے والا شخص یقیناً جا چکا تھا کیونکہ اگر وہ یہاں ہوتا تو اس کی اچھل کود پر ضرور آچکا ہوتا۔ میں نے غوں غوں کر کے اس وجود کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ اس نے غالباً رک مجھے دیکھا اور پھر اچھلتا ہوا باہر چلا گیا۔ کافی دیر تک پھر کمرے میں کوئی نہ آیا۔ کبھی کبھی مجھے برتنوں کے گرنے کی اور دوسری چیزوں کی آواز تو آرہی تھی مگر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید وہ چولھے کے پاس کوئی چیز تلاش کر رہا تھا جس سے رسی کاٹی جا سکے۔ مجھے اندازہ تھا کہ چھری یا کوئی اور ایسی چیز ہاتھ آنے کے باوجود اتنی جلدی اس کا آزاد ہونا ممکن نہیں ہو گا۔ میں جس شدت کے ساتھ اس کا انتظار کر رہی تھی اسی شدت کے ساتھ میرے بدن کے اکڑے ہوئے پٹھوں میں درد اور اینٹھن ہو رہی تھی' پھر میں تھک گئی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ شاید دن نکلنے تک ہمیں اسی طرح پڑے رہنا پڑے۔

اب مجھے خود پر غصہ آرہا تھا۔ میں واقعی جلد باز تھی' میرے اندر صبر نام کو بھی نہ تھا۔ مجھے سکون سے گھر پر بیٹھ کر کادے کا انتظار کرنا چاہیے تھا مگر میں یوں گھر سے نکل کھڑی ہوئی' اب اگر وہ آئے گا تو یہ سن کر اس کی کیا حالت ہو گی کہ میں تھانے پہنچ گئی ہوں یا گنے کے کھیتوں میں اس کی منتظر ہوں۔ وہ مجھے کہاں کہاں تلاش کرے گا اور..... اور جو وہ تھانے کی طرف چلا گیا تو..... تو کیا ہو گا؟ ممکن ہے وہاں چوہدری بھی ہو' ممکن ہے پولیس اسے گرفتار کر لے اور پھر..... اور پھر.....' میرا دماغ چٹخنے لگا۔ میں نے بدن کو زور دار جھٹکا دے کر اٹھنا چاہا۔ اس بار میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئی۔ منجھی اتنی ڈھیلی تھی کہ میرے بدن کے ساتھ ہی اس کی بان مڑ گئی۔ اسی

لمحے کوٹھڑی کے دروازے کے باہر مجھے روشنی دکھائی دی' یوں لگا جیسے کسی نے بتی جلا دی ہو۔ میں بڑی تکلیف دہ حالت میں تھی۔ یہ روشنی قریب آنے لگی تو میں نے اطمینان بھرا سانس لیا' شاید یہاں بندھا ہوا شخص خود کو رسیوں سے آزاد کرا چکا تھا اور اب لالٹین یا تیل کی بتی جلا کر کوٹھڑی کی طرف آ رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر بے دم سی ہو کر پھر منجھی پر لیٹ گئی۔ اب میرے بازو شل ہو چکے تھے اور دونوں پیر سن تھے۔ مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ روشنی اب بہت قریب آ چکی تھی۔ آنے والے کے بارے سوچ کر میرا دل بھی دھڑک رہا تھا۔ وہ جو بھی تھا میرے لئے قطعی اجنبی تھا' رات کا وقت تھا اور میں تنہا اس کے گھر میں بندھی پڑی تھی جب کہ وہ آزاد ہو چکا تھا۔ ان خیالات نے مجھے لمحہ بھر کو لرزا دیا اور بے بسی کی وجہ سے میرے آنسو نکل آئے۔ میں نے اپنے رب سے رحم کی بھیک مانگی' عین اسی لمحے آنے والا دروازے تک پہنچ گیا اور یہ دیکھ میں حیرت زدہ رہ گئی کہ وہ کوئی مرد نہیں بلکہ عورت تھی۔ تیل کے کپڑے کی بتی والا دیا اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کی روشنی میں وہ مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ بھی روشنی میں مجھے دیکھ کر حیران تھی' پھر وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ اس نے دیا ایک طرف رکھ دیا اور مجھے سہارا دے کر بٹھایا۔ سب سے پہلے اس نے میرے منہ پر بندھا کپڑا کھولا۔ منہ کھلتے ہی میں زور زور سے سانسیں لینے لگی۔ اسی لڑکی نے جلدی سے میری پشت سے میرے ہاتھ کھولے پھر پیر کھول دیئے۔ میری حالت اس قدر خراب تھی کہ میں فوراً ہی نہ اٹھ سکی بلکہ بے سدھ سی پڑی رہی۔ وہ لڑکی باہر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کٹورا تھا۔ اس نے پانی میری طرف بڑھا دیا۔ میں ایک ہی گھونٹ میں سارا پانی پی گئی۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں اتنی دور پیدل چلی تھی پھر ایسے اذیت ناک عذاب سے گزری تھی کہ میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔

"کون ہے توں؟" اس لڑکی نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"میں ..... میں ....." میں اپنا نام بتاتے بتاتے رہ گئی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ مجھے اپنا نام نہیں بتانا چاہئے۔ "میں ریشم ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"توں کیدروں آئی سی؟" وہ پھر بولی۔

اس کا سوال خطرناک تھا۔ میں اسے کیا بتاتی کہ میں اتنی رات کو اس کے گھر میں

کیوں داخل ہوئی تھی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے وقت ضائع کئے بغیر الٹا سوال کر ڈالا۔ "یہ کون تھا؟ تجھے بھی باندھا ہوا تھا اس نے! کیا گھر میں اس ویلے کوئی بھی نہیں ہے؟ توں کیا اکیلی تھی؟"

"ہاں ..... میں اس ویلے ہی نہیں' ہر ویلے کل ہوندی آں۔ آج پتا نئیں کی ہویا؟" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ "سمجھ ای نئیں آئی؟ اے تے نئیں ملوم کون سی اور کیدروں اندر آ گیا سی' میں تھاں مانجھن لگی سی۔ پچھوں آ کے تے پھڑ لیتا۔" وہ اپنی کلائی ملتے ہوئے بولی۔ اس کی کلائی جہاں رسی بندھی تھی سرخ ہو رہی تھی۔ یہ سن کر میں چپ ہو گئی۔ وہ اب بھی استفہامیہ انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"میں اپنی ماسی دے گھر جاندی پئی سی' مینوں وی پچھوں آ کے پھڑ لیتا میں چلی آں' میری ماسی پریشان ہوئے گی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ربا.....! میں فیر کلی آں۔" اس کے لہجے میں بلا کا کرب تھا۔

میری ہمت نہ ہوئی کہ میں فوراً ہی اسے چھوڑ کر باہر نکل جاتی' میرے پاؤں جیسے زمین نے پکڑ لئے تھے۔ میرے اصرار پر جو کچھ اس نے بتایا وہ میرے بوکھلانے کے لئے کافی تھا۔ وہ عبدالقادر کی بہن تھی۔ گویا یہ عبدالقادر کا گھر تھا۔ اس عبدالقادر کا جسے چوہدری نیاز نے میرے پیچھے لگا کر چھوڑ دیا تھا۔ جو کتوں کی طرح میری بو سونگھتا پھر رہا تھا۔ جس نے کراچی میں ایک بار مجھے گاڑی سے کچلنے کی کوشش کی تھی۔ یہ سب سنتے ہی میری تو کپکپی چھوٹ گئی۔ اس لڑکی کا نام زہرہ تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے ماں باپ مر چکے ہیں۔ ایک بڑی بہن تھی جو بیاہ کر دوسرے گاؤں چلی گئی ہے۔ عبدالقادر غیر شادی شدہ تھا اس لئے وہ گھر میں اکیلی تھی۔ عبدالقادر زیادہ تر چوہدری کی حویلی پر رہتا تھا' جب سے بڑی بہن بیاہی تھی اس نے رات کو گھر آنا شروع کر دیا تھا مگر دن بھر وہ گھر سے باہر رہتا تھا۔ آج اگر چوہدری نیاز کی حویلی میں آگ نہ لگی ہوتی تو وہ اب تک واپس آ چکا ہوتا۔ زہرہ نے بتایا کہ عبدالقادر باہر سے تالا ڈال کر جاتا ہے۔ آج بھی وہ تالا ڈال کر گیا تھا مگر شام کو جانے کس کام سے آیا تھا' پھر اس نے زہرہ سے روٹی مانگی' وہ روٹی ڈالنے لگی۔ اسی وقت چوہدری جیپ لے کر دروازے پر آ گیا۔ وہ عبدالقادر کو لینے آیا تھا۔ جلدی میں عبدالقادر دروازے میں تالا ڈالنا شاید بھول گیا تھا۔ زہرہ روٹی ڈال کر برتن دھونے لگی' وہ

سمجھی تھی کہ عبدالقادر تالا ڈال گیا ہو گا اور روٹی کھانے ضرور آئے گا۔ وہ برتن دھونے بیٹھی تو اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ اس نے دروازہ کھلنے اور کنڈی چڑھانے کی آواز سنی تو سمجھی کہ عبدالقادر آیا ہو گا مگر پھر آنے والے نے اچانک اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے دبوچ لیا پھر اندر لے جا کر باندھ دیا اور بتی بجھا دی۔ باقی کے حالات کی میں خود گواہ تھی۔

اب مجھے دھڑکا لگ گیا تھا کہ عبدالقادر کسی بھی وقت واپس آ سکتا ہے۔ میں خود موت کے منہ میں پہنچ چکی تھی۔ اپنی جان پر بنی ہو تو آدمی کس قدر خود غرض ہو جاتا ہے اس بات کا اندازہ مجھے اُس روز پہلی بار ہوا اور میں اس لڑکی کی آنکھوں میں پھیلی ویرانی اور اس کے لہجے کا کرب بھول گئی۔ میں نے جلدی سے چادر لپیٹی اور باہر جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔

"ریشم! تُو بھاجی کو نہ بتانا کہ ..... کہ اوہ آیا سی۔ او مینوں جان سے مار دے گا۔ کدی نئیں سنے گا کہ میں اوس نوں نئیں جاندی۔" اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"نئیں نئیں ..... میں نہیں بتاؤں گی۔" میں نے جلدی سے کہا اور بولی۔ "تو ..... تو بھی کچھ نہ بتائیں ..... میرے بارے اچ بھی نہ بتائیں۔" میں تو یہی چاہتی تھی۔ وہ بے چاری کیا جانے کہ میں بھی اس کے بھائی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں اتنا کہہ کر باہر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ باہر غضب کا سناٹا اور اندھیرا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا مگر میں نے وہاں سے نکلنے میں دیر نہیں کی۔ میں تیز قدموں سے اس سمت بڑھ گئی جدھر سے خالہ فاطمہ کے گھر والی گلی شروع ہوتی تھی۔ اب مجھے عبدالقادر کا ڈر لگا ہوا تھا۔ میں نے کافی فاصلہ طے کر لیا۔ گلی سے باہر نکلتے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا گلی سنسان تھی، مگر عین اسی لمحے کسی گاڑی کی روشنی یہاں تک پہنچ رہی تھی۔ میں مخالف سمت بھاگ اٹھی۔ میں نے کوشش کی تھی۔ کہ میرے قدموں کی آہٹ نہ ہو، میں نے چپل بھی اتار کر بغل میں دبا لئے تھے۔ خدا نے مجھے بال بال بچایا تھا۔ میں ایک بار پھر عبدالقادر کے ہاتھ آنے سے بچ گئی تھی، اگر میں لمحہ بھر کی بھی دیر کرتی تو اس کے گھر میں یا گلی میں پکڑی جاتی۔ واقعی خدا کارساز ہے میں نے جونہی وہ گلی عبور کی تھی وہ آیا تھا۔ اب یہاں ٹھہرنا خطرے سے

خالی نہیں تھا۔ ممکن ہے جیپ اسی طرف آتی اور یہاں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں میں خود کو چھپا سکتی میں بے آواز قدموں سے بھاگتی رہی اور پلٹ پلٹ کر اسی گلی کی طرف دیکھتی رہی جہاں سے آتی روشنی چوڑی سڑک تک آتے آتے مدھم ضرور ہو گئی۔ مگر اس روشنی کی وجہ سے میرا راستہ آسان ہو گیا تھا۔

خدا میرے ساتھ تھا۔ میں نے اس روشنی کے حرکت کرنے سے قبل ہی وہ چوڑی گلی عبور کر لی اور دائیں طرف والی اپنے گھر کو جاتی گلی میں مڑ گئی۔ یہ گلی بھی سنسان تھی۔ خالہ فاطمہ کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ میں نے آہستہ سے دروازے کو بجایا۔

"کک..... کون اے؟" اندر سے خالہ فاطمہ کے بیٹے فیکے کی آواز آئی۔

"فیکے .....! کاکے کھول ....."

اس نے شاید میری آواز پہچان لی تھی۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ خالہ فاطمہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا رنگ فق تھا، لالٹین کی زرد روشنی میں اس کا چہرہ کسی مُردے کا چہرہ لگ رہا تھا۔ "کیا ..... کیا ہوا ..... کیا ہوا ہے؟" میں نے اسے شانوں سے پکڑ لیا۔

"اوہ ....." اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ "خالہ بول کیا ہوا ہے؟" میں دبے دبے لہجے میں چیخ پڑی۔ فیکا در بند کر چکا تھا۔

"کچھ نہیں پُتر! شکر ہے تُو کھیریت سے ہے۔ تیری طرف سے بہت دکھی تھی۔" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر کچھ تلاش کرنا چاہا تو وہ جلدی سے پلٹ گئی۔ "میں تیرے جانے کے بعد سوچ رہی تھی پُتر کہ تُو ..... تُو کیا کرے گی؟ تو کیوں چلی گئی۔ تیرا ماما آیا تو میں اسے کیا جواب دوں گی؟"

"خالہ تُو ..... تُو پوچھے گی نہیں کہ وہاں تھانے میں کون ہے؟" میں نے چادر اتار کر منجھی پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"مجھے پتا ہے۔" وہ بے ساختہ کہہ اٹھی۔

"پتا ہے؟" میں چونک گئی۔ "کیسے ..... کون ہے وہاں؟" میں جلدی سے اس کے قریب جا پہنچی۔

"وہ ..... ماشٹر تھا زینو ..... نس گیا۔"

میں اچھل پڑی۔ "وہ ..... ماشٹر تھا؟ کرم داد؟"

"ہاں ..... پُتر اور وہ آیا سی اتھوں۔ بولتا سی کہ ان لوگاں نوں بولو جلدی گاؤں سے چلے جائیں۔" وہ گھبراہٹ میں آدھی اردو اور آدھی پنجابی بول رہی تھی حالانکہ وہ مجھ سے زیادہ تر اردو میں ہی بات کرتی تھی۔

"اوہ ..... اور وہ دوسرا ..... دوسرے لوگ کون ہیں؟"

"ماجا دینو اور ..... کوئی جانو ہے گا ..... دینو دا یار اے کوئی۔"

اور میں فوراً ہی پہچان گئی کہ یہی وہ جانو ہو گا جس سے دینو مجھے ملانا چاہتا تھا اور ریشماں نے مجھے اس سے ملنے سے منع کیا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ جانو اچھا آدمی نہیں ہے۔ مجھے اس وقت وہ اچھا آدمی لگا کیونکہ اس نے اپنے یار دینو کے لئے خود کو اتنے بڑے خطرے میں دھکیل دیا تھا۔ وہ یقیناً دینو کے لئے یہاں تک پہنچا ہو گا۔ حیرت اس پر تھی کہ ماسٹر کرم داد کیسے چوہدری کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ جانو کے ساتھ کیا کر رہا تھا۔ میں نے خالہ فاطمہ سے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ یہ سب کچھ معلوم نہیں کر سکی۔ وہ آیا تھا اور نے ادھر ہی کھڑے کھڑے کہا کہ ہم لوگوں کو یہاں سے نکل جانا چاہئے اور پھر وہ رکا نہیں۔

"کادا' یا اور کوئی نہیں آیا؟" میں نے پوچھا۔ اس اطمینان نے مجھے بڑی قوت بخشی تھی کہ کادا اور ماما بابا سب محفوظ ہیں اور میں جیسے کمالا سمجھی تھی وہ دراصل ماسٹر کرم داد تھا۔

"نئیں ..... پُتر! مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ اتی رات ہو گئی پر وہ لوگ ....." وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے ہونقوں کی طرح کھڑی تھی۔

"رب کرے گا وہ سب خیریت سے ہوں گے خالہ! میں ..... میں ایسا کرتی ہوں خالہ کہ اپنے گھر چلی جاتی ہوں۔ اگر کادا وغیرہ آ جائیں تو تُو انہیں بتا دینا۔ میں وہیں سے ان کے ساتھ نکل جاؤں گی۔" میں اس کی پریشانی کو خوب سمجھ رہی تھی۔ وہ بے چاری ہم سب کی وجہ سے عذاب میں آ گئی تھی۔ خوف سے اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ یہ سن کر اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر سی دوڑ گئی۔

"ہاں زینو! یہ تو مجھے کھیال ہی نہیں آیا۔ تُو وہاں چھپی رہے گی تو ..... تو کسی کو پتا

بھی نہیں چلے گا۔"

میں نے گھر کی چابیاں لیں' اپنا ٹین کا بکسا اٹھایا اور گلی میں جھانک کر اطمینان کرنے کے بعد کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا' باہر آ گئی۔ بہت آہستگی سے میں نے دروازہ کھولا اور دبے پاؤں اندر داخل ہو گئی۔ میں خالہ سے ماچس لینا نہیں بھولی تھی۔ یہاں لالٹین میں تیل کافی تھا۔ میں نے اندر جا کر کنڈی چڑھا دی اور خالہ فاطمہ سے کہہ دیا کہ وہ گھر جائے۔ وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی تھی۔ میں نے ماچس کی تیلی جلا کر لالٹین ڈھونڈی اور جلا کر بتی اونچی کر دی۔ یہاں آ کر میرے وجود میں ٹھنڈک سی اتر گئی۔ میں بہت دیر تک پورے گھر میں پھرتی رہی۔ میں نے بستر جھاڑے۔ دریاں جھاڑیں' برتن ترتیب سے رکھے۔ بیچ آنگن میں رکھی وہ منجھی جس پر بابا کی میت رکھی گئی تھی دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی۔ پورا گھر سمیٹ کر' صاف کر کے میں نے برآمدے میں بچھی منجھی پر بستر لگایا اور لالٹین کی بتی نیچی کر کے کونے میں رکھ دی تاکہ اس کی روشنی دروازے یا کھڑکیوں سے باہر نہ جا پائے اور کسی کو اندر میری موجودگی کا احساس نہ ہو۔ مجھے اس بات کا دھڑکا تھا کہ میں اپنے گھر میں ہوتے ہوئے بھی نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو اس گھر کے آباد ہونے کا پتا چلے' یہ کیسی مجبوری تھی' کتنی بے بسی تھی کہ میں اپنے ہی گھر میں چوروں کی طرح چھپی بیٹھی تھی۔ میں نے تو سوچا تھا کہ میں جا کر گھر میں چراغاں کروں گی' اسے آباد کروں گی اور چوہدری کو بتاؤں گی کہ دیکھ' جس گھر کو تُو نے ویران کر دیا تھا' اسے میں نے پھر آباد کر دیا ہے' جس کے پیچھے تُو نے اپنے کتے چھوڑ رکھے تھے مگر وہ اب تک مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے۔ میں اپنے گھر میں ہوں محفوظ ہوں اور ہمیشہ اس گھر کو آباد رکھوں گی مگر میرا یہ خواب ابھی تعبیر تک نہیں پہنچا تھا۔ میں بہتے دریا کے کنارے ہوتے ہوئے بھی پیاسی تھی۔ میں بستر پر لیٹ کر جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ آج پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ کاش میرا کوئی بڑا بھائی ہوتا' کاش کوئی ایسا بیٹا ہوتا جو ماں باپ پر ہونے والے ظلم کا بدلہ لے سکتا۔ بدلہ لینے کی قسم تو میں نے بھی کھائی تھی' غصے میں تو میں بھی جانے کیا کیا سوچ لیتی تھی مگر میں کس قدر بے بس تھی اس کا اندازہ مجھے آج ہو رہا تھا۔ اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو میں بھلا یوں اپنے ہی گھر میں چھپی بیٹھی ہوتی' پھر مجھے ماما کا خیال آیا' میرا بھائی نہیں تو کیا ہوا' اماں کا بھائی تو آ ہی گیا تھا ناں مگر اس کی حالت دیکھ کر میرے دل میں ہوک سی اٹھ رہی

تھی۔ کاش وہی پہلے والا پہلوان سا ہوتا۔ لمبا چوڑا جس کے بازوؤں کی مچھلیاں دھوپ میں چمکا کرتی تھیں اور جب وہ اکھاڑے میں اترتا تھا تو آنکھوں میں کیسے بجلیاں سی چمک جاتی تھیں۔ یہ دبلا پتلا' دھونکنی کی مانند چلتا ہوا سانس اور لرزتے ہوئے ہاتھ تو اب کسی قابل نہ رہے تھے پھر بھی اس کی موجودگی اور کادے کی موجودگی نے میرے حوصلے کافی بڑھائے تھے۔ ویسے چوہدری فیاض کے بارے میں سن کر مجھے اندازہ ہوا تھا کہ چوہدری نیاز کتنا خود غرض اور خراب آدمی ہے مجھے اب چوہدری فیاض کی بھی فکر تھی۔ میں نے سنا تھا کہ وہ مرا نہیں بلکہ زخمی ہے مگر خالہ فاطمہ نے یہ بھی کہا تھا کہ چوہدری نیاز تو وہ آدمی ہے جس نے اپنے بھائی کو بھی جان سے مار دیا۔ یہ خیال مجھے ابھی ابھی آیا تھا کہ میں نے خالہ سے ٹھیک سے پوچھا کیوں نہیں کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا۔ یہ خیال آتے ہی میں بے چین ہو گئی۔ ہزاروں سوچیں تھیں جو مجھے ڈس رہی تھیں اور وقت دھیرے دھیرے گزر رہا ہی چلا جا رہا تھا۔

"اب تک کادا آیا کیوں نہیں؟" میں زیر لب بڑبڑائی۔ اب تک تو اسے آجانا چاہئے تھا۔ اس خیال نے مجھے بستر پر لیٹے نہ رہنے دیا اور میں بے کل ہو کر اٹھ بیٹھی۔ بالکل اسی لمحے مجھے یوں لگا جیسے کسی نے کوٹھڑی کی پچھلی کھڑکی پر ہلکی سی دستک دی ہو یا کوئی چیز اس کھڑکی سے ٹکرائی ہو۔ میں تیزی سے کوٹھڑی کی طرف بڑھی۔ شاید کادا آ گیا تھا۔ اس خیال سے میں نے کھڑکی کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"کادا کھڑکی کی طرف سے کیسے آ سکتا ہے؟" ایک سرگوشی نے مجھے منجمد کر دیا۔ یہ سرگوشی میرے اندر کہیں گونجی تھی۔ وہ آتا تھا تو خالہ فاطمہ مجھے لینے آتی۔ اس نے جاتے جاتے تاکید کی تھی کہ میں در نہ کھولوں جب تک وہ آواز نہ دے۔ میں نے خوفزدہ نگاہوں سے ہلتی ہوئی کھڑکی کو دیکھا پھر بھاگ کر باہر سے لالٹین اٹھا لائی۔ وہ کھڑکی واقعی بج رہی تھی جیسے کوئی اسے باہر سے کھولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ خوف سے میرا بدن لرزنے لگا۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے سرکنے لگی۔ جلد ہی کوٹھڑی سے باہر آ گئی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ ایک ہی بات میرے ذہن میں آئی تھی کہ میں بھاگ کر خالہ فاطمہ کے گھر چلی جاؤں۔ ابھی میں دروازے تک پہنچی بھی نہیں تھی کہ مجھے لگا کہ کوئی کھڑکی کے ذریعے اندر آ گیا ہے۔ کھڑکی شاید ٹوٹ چکی تھی۔ لکڑی کے پٹوں سے بنی کھڑکی تھی بھی تو نازک

کہ ہلکے دھکے سے بھی ٹوٹ سکتی تھی۔ میں بھاگ کر دروازے تک پہنچی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کنڈی گرائی اور در کھولا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے مجھے دبوچ لیا۔

مجھے دبوچنے والے نے سب سے پہلے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا' اگر وہ ایسا نہ کرتا تو حلق میں گھٹ جانے والی چیخ شاید پورے گاؤں کو اکٹھا کر لیتی۔ میں خوف اور دہشت سے بری طرح کانپ رہی تھی۔ آنے والے کے ہاتھ کا ٹھنڈا یخ لمس میرے بدن میں تھرتھری بن کر دوڑ گیا تھا۔ میں بہت مچلی' خود کو آزاد کرانے کے لیے میں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر اس کی مضبوط گرفت نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ میں نے پاؤں چلا کر دیوار کے سہارے کھڑی منجھی بھی گرانا چاہی تاکہ اس کی آواز کسی تک یا کم از کم خالہ فاطمہ تک پہنچ جائے مگر اس نے بڑی زور سے میرے منہ پر تھپڑا مارا' میں چکرا کر رہ گئی۔ اس دوران میں بھی اس نے اپنا چوڑا چکلا ہاتھ میرے منہ پر جمائے رکھا تھا۔ وہ کیا چاہتا ہے' یہ اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ کون ہے' یہاں تک کیسے پہنچا' وہ کیسے جانتا تھا کہ میں یہاں ہوں' یہ سب باتیں میرے دماغ میں چکرا رہی تھیں' یہ تو میں جان چکی تھی کہ آنے والا' ماما' کادا' بابا یا کملا نہیں ہو سکتا' ماسٹر کرم داد بھی جانتا تھا کہ میں یہاں ہوں تو اپنے گھر میں' میں ہی ہو سکتی ہوں۔ وہ بھی ایسا سلوک نہ کرتا جیسا یہ آنے والا کر رہا تھا۔ میری ماں کے ویران اور اجاڑ گھر میں حسرتوں کی راکھ کے سوا اور دھرا ہی کیا تھا کہ میں کسی چور یا ڈاکو کے بارے میں سوچتی۔

میں نے خود کو آزاد کرانے کی آخری بھرپور کوشش کی اور اپنے ناخن اس شخص کی بالوں سے بھری کلائی میں گاڑ دیے اور ٹانگیں چلا کر اس کی ٹانگوں پر ٹھڈے مارنے کی کوشش بھی کی۔ وہ میرے اس حملے سے بوکھلایا تو ضرور مگر بری طرح طیش میں آ گیا۔ اس نے اپنے دوسرے ہاتھ سے میرے بال پکڑ کر اتنی زور سے جھٹکے دیے کہ میری آنکھوں میں تارے ناچ گئے۔ میں کوشش کر رہی تھی کہ کسی بھی طرح خالہ فاطمہ تک اس دھما چوکڑی کی آواز پہنچ جائے۔ اس وقت اس شخص نے مجھے کوٹھری کی جانب کھینچنے کی کوشش کی۔ عین اسی لمحے میں نے گلی میں آہٹ سنی پھر مدھم سی آوازیں بھی سنائی دیں' میں نے کان کھڑے کر لیے' میرا سارا دھیان گلی کی طرف تھا۔ ابھی میں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ آوازیں کیسی ہیں۔ اچانک میں نے کسی در کو کھٹکھٹانے کی آواز سنی پھر

جلد ہی دروازہ کھلنے اور کسی کے دبے لہجے میں بات کرنے کی آواز آئی مگر سمجھ میں نہ آیا کہ باتیں کرنے والا کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ رات کے گہرے سناٹے میں جب کسی کا دھیان کسی آہٹ پر لگا ہو تو ہلکی سی آواز بھی کافی محسوس ہوتی ہے۔ میں تو یہ سب جان رہی تھی مگر شاید اس شخص کو یہ آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے انداز سے پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس نے بھی آہٹ سنی ہے یا نہیں' اس کی پوری توجہ میری جانب تھی۔ لالٹین منجھی اور ٹین کے آٹے کے ڈبے کے پیچھے رکھی تھی اور اس کی لو اتنی نیچی تھی کہ اس کی روشنی محدود حصے تک ہی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ لمبا چوڑا آدمی ہیولے کی شکل میں تو صاف نظر آ رہا تھا مگر اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا' پھر وہ میری پشت پر تھا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ سامنے آیا تو میں پہچان لوں گی۔ اس نے گھیردار شلوار اور قمیض پہنی ہوئی تھی۔ پیروں میں پشاوری جوتے تھے۔ بس یہی کچھ تھا جو میں دیکھ پائی تھی۔ اچانک۔ بالکل اچانک ہی کسی نے دروازے کو بجایا۔ میں سہم کر رہ گئی۔ میں نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ دستک کی آواز پر وہ شخص ساکت رہ گیا۔ میں خود بھی ساکت تھی اور اس کا ردِعمل دیکھنا چاہ رہی تھی۔ دستک دوبارہ ابھری اور ساتھ ہی خالہ فاطمہ کی آواز آئی۔ وہ مجھے ہولے ہولے پکار رہی تھی۔ میں نے مچل کر حلق سے آوازیں نکالنے کی کوشش کی اور تبھی اس سفاک آدمی نے میرے منہ کو اس قدر زور سے دبایا کہ میری آنکھیں پھٹ گئیں' دم اکھڑ گیا اور میں مچھلی کی طرح تڑپ اٹھی۔ اب مجھے یقین تھا کہ میری معمولی سی حرکت بھی خالہ کو متوجہ کر لے گی۔ یہ سوچ کر ہی مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ باہر کادا بھی ہو گا۔ خالہ نے کہا تھا کہ کادا لینے آیا تو وہ آئے گی اور مجھے آواز دیں گی تب میں در کھولوں۔ وہ مجھے آوازیں دے رہی تھی۔ باہر کادا یا ماما موجود تھے۔ میں نے لمحہ بھر کو آنکھیں نچا کر چاروں طرف دیکھا۔ کوٹھڑی کا دروازہ قریب تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں بس ذرا سا آگے کی طرف سرک جاؤں تو دروازہ میرے اتنے قریب آ سکتا تھا کہ میں اس پر لات مار کر آواز پیدا کر سکتی تھی۔ اسے شاید اس کا بھی اندازہ ہو چکا تھا۔ اچانک اس نے میرے منہ پر گرفت سخت کر کے دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے سے میری کنپٹی پر دباؤ ڈالا۔ مجھے زور کا چکر سا آیا اور یوں لگا جیسے میں کسی کھائی میں گرتی جا رہی ہوں۔ آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں' ذہن سن ہونے لگا تھا' ہوش و حواس کے آخری لمحے میں' میں نے کادے کی

سرگوشی سنی۔ اب وہ بھی مجھے آوازیں دے رہا تھا۔ در کھولنے کو کہہ رہا تھا مگر میں تو اندھیرے کنویں میں اتر رہی تھی۔ ایک بے چینی سی تھی جو اس آواز کو چھونا چاہتی تھی مگر سُن ہوتے ہاتھ پیروں سے جان ہی نکل گئی۔

☆==========☆==========☆

میں نہیں جانتی تھی کہ میں کتنی دیر تک بے ہوش رہی۔ ہوش آیا تو ملگجی روشنی میں ماحول کی اجنبیت کا احساس شدت کے ساتھ ہوا۔ یہ ایک بہت چھوٹا سا کمرا تھا۔ پہلے تو خیال ہوا کہ شاید میں اپنے ہی گھر کی کوٹھڑی میں ہوں مگر بہت جلدی یہ خیال ذہن سے نکل گیا کیونکہ اس کوٹھری میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا بلکہ چھت پر ایک چمنی بنی تھی' جہاں سے سرمئی سی روشنی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ میں کمرے میں تنہا تھی اور ننگے فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔ لمحہ بھر میں ہی میں نے سوچ لیا' جان لیا اور پھرا چھل کر اٹھ بیٹھی۔ دائیں جانب ایک پتلا سا دروازہ تھا جو یقیناً باہر سے بند تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی۔ جھٹکے دیے مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں۔ وہ شخص کون تھا جس نے میری کنپٹی کو دبا کر مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ کیا کادے کو احساس ہو گیا تھا کہ میں خطرے میں ہوں۔ کیا خالہ فاطمہ سمجھ گئی تھی کہ گھر میں میرے سوا بھی کوئی ہے؟ یہاں مجھے کون لایا ہے؟ میں کس کی قید میں ہوں' کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بے چینی اور خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں برف ہو چکے تھے۔ یہ چھوٹا سا کمرا بہت ٹھنڈا تھا' لگ رہا تھا جیسے میں کسی سرد خانے میں کھڑی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کمرا اتنا ٹھنڈا کیوں ہے۔ یہ کون سی جگہ ہے۔ شاید دن نکلنے والا تھا۔ میں کافی دیر تک دروازے سے لگی کھڑی رہی۔ میں نے باہر کسی قسم کی آواز بھی سننے کی کوشش کی مگر سوائے جھینگروں کی تیز آواز اور سرسراتی ہوا کی سرگوشیوں کے کچھ اور سنائی نہ دیا تو میں تھک کر پھر ننگے فرش پر بیٹھ گئی۔ فرش بے حد ٹھنڈا تھا۔ میں نے چادر کو اس طرح لپیٹ لیا کہ میرے پاؤں گرم رہیں' پھر میں گٹھڑی کی طرح سکڑ کر بیٹھ گئی۔ اب انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اتنا میں جان چکی تھی کہ میں کسی سفاک اور اجنبی شخص کی قید میں ہوں' اگر یہ کادا ہوتا تو یوں مجھے بے ہوش چھوڑ کر کہیں بھی نہ جاتا بلکہ مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کرتا اور مجھے تسلی

دیے بغیر نہ رہتا کہ اب میں محفوظ ہوں۔

یہ اجنبی کون ہے؟ کیا چاہتا ہے' اس کا پتا اس وقت تک نہیں چلتا جب تک میں اس اجنبی کو دیکھ نہ لیتی یا اس سے یہ سب کچھ پوچھ نہ لیتی۔ اچانک ایک خیال زہریلے بھالے کی طرح مجھ میں کھب گیا۔ "یہ چوہدری نیاز کا قید خانہ تو نہیں؟" اس خیال نے تو جیسے میرے اندر بجلی سی بھر دی' میں پھرتی چھل کر کھڑی ہو گئی۔ میں جوں جوں اس بارے میں سوچ رہی تھی' میرا یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ یقیناً عبدالقادر نے مجھے اپنے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا ہو گا۔ اس نے میرا پیچھا کیا ہو گا اور جان گیا ہو گا کہ میں زینو ہوں' پھر اس نے خالہ کے گھر کے باہر میرا انتظار کیا ہو گا پھر جب دیکھا ہو گا کہ میں تنہا یہاں آ گئی ہوں تو گویا اس کا کام آسان ہو گیا ہو گا تب اس نے مجھے گھیر لیا۔ یہ سب جان کر تو میری جان ہی نکل گئی' اگر میں واقعی چوہدری نیاز کے ہتھے چڑھ گئی تھی تو ساری کہانی ہی ختم ہو چکی تھی۔ اب یہی سرد کمرا میری قبر بھی بن سکتا تھا۔ چوہدری نیاز تو پاگل ہو رہا تھا۔ میری وجہ سے اس کے خاندان کی عزت داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ میری وجہ سے اسے بھائی کو گولی مارنا پڑی تھی۔ اب جو میں اس کے ہاتھ لگی تھی تو وہ تو واقعی میرے ٹوٹے کرا کے کتوں کو کھلا دے گا۔ میری ساری ہمت اور عقل جواب دے گئی۔ میں نے سر دیوار سے ٹکا لیا۔ اب تک میں زندگی کے سرے کو پکڑے کادے کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی مگر اب زندگی کا وہ آخری سرا بھی چھوٹنے والا تھا۔ اب موت میرے بالکل قریب آ چکی تھی۔ میرا انتظار ختم ہو چکا تھا۔ میری بالکل وہ کیفیت ہو گئی جو کسی پھانسی پر چڑھائے جانے والے کی ہوتی ہو گی' جو کال کوٹھڑی میں اپنی آخری سانس گن رہا ہوتا ہے۔ کادے کا ہنستا مسکراتا چہرہ میری پلکوں میں آئے ہر آنسو میں چمک رہا تھا۔ اس کی سرگوشیاں میرے پورے وجود میں دائرے سے بن رہی تھیں۔ کادے کے بابا کا شفیق چہرہ سامنے آیا تو میں دم بخود رہ گئی۔ یوں لگا جیسے یہ میرے اپنے بابا کا چہرہ ہے' وہی شفیق ہونٹ جنہیں میں اس وقت بہت تکتی تھی جب وہ مجھے موٹے بھینسے والی کہانی سناتے ہوئے ہونٹوں کو دائرے کی طرح بنا کر حلق سے عجیب عجیب سی آوازیں نکالا کرتا تھا پھر ماما کا مدقوق چہرہ آنسوؤں میں تر میرے سامنے آیا تو میں برداشت نہ کر پائی اور بری طرح سسک اٹھی۔ یہ تمام وہ چہرے تھے جو میری آنکھوں میں آہستہ آہستہ زندگی کی طرح دھندلاتے جا رہے تھے۔ میں کادے کو نہ پا سکی'

یہ میری بدنصیبی کی انتہا تھی۔ مجھے وہ دن بے طرح یاد آ رہے تھے جب میں کادے کے گھر میں رہتی تھی اور اس کی تپتی نگاہوں سے بچنے کے لیے ہر لمحہ اپنا آپ چرائے پھرتی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں مجھے زندگی کی حسین وادی کی طرف بلاتی تھیں اور میں یوں گھبرا کر منہ پھیر لیتی تھی جیسے مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو رہا ہو۔ شاید حسین زندگی کا خواب ہی میرا بڑا گناہ تھا جسے میں ہر لمحہ پلکوں پر چنے رہی۔ آج اسی خواب کی کرچیں میرے پورے وجود میں کھبی ہوئی تھیں۔ سارے چہرے اور ساری یادیں دھیرے دھیرے آنسوؤں کے ہجوم میں گم ہو گئیں تو میں موت کا انتظار کرنے لگی۔ اس لمحے میں نے اپنے پورے وجود میں ایک عجیب سا سناٹا پھیلتا محسوس کیا یوں جیسے بے تحاشا شور کے بعد بلا کا سکوت چھا جائے۔ میرے تمام احساسات' تمام محسوسات جیسے برف کی طرح منجمد ہو گئے۔ بس سانسوں کا زیر و بم مجھے احساس دلا رہا تھا کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ چند بھولی بھٹکی سانسیں ہیں جو میرے جسم میں چکراتی پھر رہی ہیں' اب مجھے انہی سانسوں کے ختم ہونے کا انتظار تھا' یہ چند سانسیں جو میری روح کی اذیت میں بے طرح اضافہ کر رہی تھیں۔ بس ان چند سانسوں کے ختم ہونے کی دیر تھی کہ میری ساری تکلیفیں اور اذیتیں ختم ہو جاتیں۔ تب میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

پھر اچانک یوں لگا جیسے میرے اندر کہیں زلزلہ سا سر ابھار رہا ہو' پھر یہ احساس میرے وجود سے باہر آ گیا' زمین ہلنے لگی' دروازہ بجنے لگا' دیواروں میں تھرتھری سی پیدا ہو گئی۔ میں نے گھبرا کر سر دیوار سے دور کر لیا۔ تبھی کہیں دور کسی ریل کی سیٹی کی آواز ابھری۔ میں کھڑی ہو گئی۔ دیواروں کی تھرتھراہٹ بڑھتی گئی۔ میرے پیروں تلے ٹھنڈا فرش لرز رہا تھا۔ اب میں جان گئی تھی کہ میں کہاں ہوں۔ ریل ایک تیز آواز کے ساتھ میرے قریب ہی سے گزری تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے نے کمرے کے دروازے کو بری طرح دھڑ دھڑا کر رکھ دیا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ مجھے قید کرنے والے نے مجھے یہاں' ویرانے میں لا کر قید کیا تھا۔ چوہدری نیاز ابھی اتنا کنگال تو نہیں ہوا تھا کہ ایک لڑکی کو قید کرنے کے لیے اتنی بڑی حویلی میں کہیں بھی جگہ نہ ملی ہو۔ حویلی کا پچھلا حصہ جلا تھا۔ حویلی کے اندر اور نیچے بنے قید خانے تو محفوظ تھے پھر۔ پھر اس نے مجھے یہاں کیوں بند کیا۔ یہ وہی جگہ تھی جس کے بارے میں' خالہ بتا چکی تھی کہ اگر میں تھانے سے واپس

نہ آؤں تو کادے سے کہنا کہ میں ریل کی پٹڑی کے قریب بنے گورنمنٹ کے ان کوارٹروں میں اس کا انتظار کروں گی جو ویران پڑے رہتے ہیں۔ یہ وہی کوارٹر تھا' انھی میں سے کسی کوارٹر کا کمرا تھا مگر میں تو واپس پہنچ گئی تھی پھر بھلا کادا کیسے سوچے گا کہ میں یہاں ہوں گی۔ جانے اس شخص کی موجودگی کا اسے احساس ہوا بھی تھا یا نہیں۔ جانے وہ کیا سوچ رہا ہو گا۔ کہاں کہاں تلاش کرے گا۔ کیا وہ یہاں بھی پہنچ جائے گا؟ اس خیال نے ابھرتی ہوئی کرن کی طرح سر ابھارا تھا مگر یہ خیال گھور اندھیروں میں چھپ گیا۔ میں یہ سوچ کر رہ گئی کہ دروازہ نہ کھلنے پر اس نے دروازہ توڑ دیا ہو گا یا شاید اس نے پچھلی کھڑکی کی طرف سے اندر جا کر مجھے دیکھنے کی کوشش کی ہو گی تو اسے ٹوٹا دیکھ کر ہی سب کچھ جان گیا ہو گا۔ میری چپلیں بھی تو وہیں رہ گئی تھیں تب وہ کیسے سوچ سکتا ہے کہ میں اپنے پیروں پر چل کر کہیں گئی ہوں گی۔ اس کی کیا حالت ہوئی ہو گی یہ سوچ کر ہی میرے پسینے چھوٹنے لگے۔

اب میں یہ بھی جان گئی کہ یہ کمرا اتنا ٹھنڈا کیوں ہے؟ یہ کوارٹر خودرو جھاڑیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ اس کی پشت پر چاول کی فصل شروع ہو کر دور تک چلی گئی تھی' جہاں مستقل پانی بھرا رہتا تھا۔ یہی سیلن اس کمرے کی دیواروں میں رچ بس گئی تھی۔ پھر کھلے علاقے میں کھڑا یہ چھوٹا سا کوارٹر' تیز ہوا اور خنکی کی زد میں رہتا تھا۔

اب تو موت کا وہ انتظار بھی ختم ہو گیا تھا جو میں نے چند لمحے پہلے ہی شروع کیا تھا۔ رہ رہ کر یہ بات پریشان کر رہی تھی کہ اگر مجھے چوہدری نیاز کے کسی آدمی نے پکڑا ہے تو وہ مجھے یہاں کیوں لایا ہے' اسے تو سیدھا چوہدری کی حویلی میں لے کر جانا چاہیے تھا۔ میں جانتی تھی کہ چوہدری میرے ہاتھ آ جانے کی خبر کو لمحہ بھی کبھی ہضم نہیں کر پائے گا' میں تو وہ تھی جس نے اس کی راتوں کی نیندیں اڑا دی تھیں۔ وہ تو دوسرے ہی لمحے میرے سر پر پہنچ جاتا پھر۔ پھر یہ کون ہے؟ سوچتے سوچتے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ چمنی سے آنے والی روشنی اب بھی مدہم تھی' شاید سویرا ہونے میں ابھی بہت دیر تھی یا ممکن ہے کہ ریل کی پٹڑی کے قریب لگے کسی لیمپ کی روشنی کو میں سویرے کی روشنی سمجھ رہی تھی۔ یہ سوچ سوچ کر اب مجھے ہول آ رہے تھے کہ آنے والا جب آئے گا تو کیا ہو گا؟ وہ کون ہو گا اور مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا کہ شاید یہاں مجھے کادا لایا ہو' اس نے اس سفاک آدمی کو مارا ہو' شاید وہ اب بھی اس کا پیچھا کر کے اسے مار رہا ہو' ایسے ہی فضول خیالات

آندھیوں کی صورت ذہن میں آتے اور نکلتے رہتے۔

وہ کسی کی آہٹ تھی۔ کوئی سوکھے ہوئے پتوں پر بے دردی سے پاؤں رکھتا ہوا قریب آ رہا تھا۔ میں کمرے کے کونے میں سکڑ گئی۔ میں نے چادر کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا تھا۔ میرا دل بڑی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس وقت تو میری گھگھی بندھ گئی جب میں نے کسی کو دروازے پر محسوس کیا۔ چند لمحوں بعد زنگ آلود کنڈی کی کریہہ آواز ابھری اور پھر دروازے کی چرچراہٹ پر ختم ہو گئی۔ وہی لمبا چوڑا آدمی میرے سامنے کھڑا تھا۔ گہرے سانولے رنگ کا وہ لمبوترے چہرے والا شخص' اس ملگجی روشنی میں بڑا خوفناک لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گھنی سیاہ داڑھی اور مونچھیں تھیں۔ وہ شاید میری طرف دیکھ رہا تھا مگر میں اس پر ایک نگاہ ڈال کر آنکھیں جھکائے یوں دیوار میں گھسنے کی کوشش کر رہی تھی جیسے یہ دیوار مجھے خود میں سمو کر اس خوفناک آدمی سے بچا ہی تو لے گی۔

"چل۔" عجیب کھردری سی آواز ابھری۔

میں مزید سکڑ گئی۔ وہ کچھ دیر وہیں دروازے کی چوکھٹ میں کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ پھر ایک قدم اندر آ گیا۔ میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔

"چل باہر۔" اس نے پھر اپنی کھردری آواز میں کہا۔

"کک۔ کہاں؟ تم۔ تم کون ہو۔ کیوں لائے ہو مجھے یہاں؟" میری زبان کھلی تو میں نے کئی سوال کر ڈالے۔

اس نے میری کسی بات کا جواب دینے کی بجائے آگے بڑھ کر میرا بازو پکڑ لیا۔ اس کی مضبوط اور موٹی موٹی انگلیاں میرے بازو میں گڑ کر رہ گئیں۔ وہ مجھے دروازے کی سمت لے جا رہا تھا۔ میں بلبلا اٹھی۔ میں نے اس سے اپنا بازو چھڑانا چاہا' تب وہ جھٹکے سے رک گیا۔ "سدی طرح چلنی اے کہ نئیں؟ نئیں تے میں چک کے لے جاں گا۔"

میں گھبرا کر آگے بڑھ گئی۔ "گل سن!" اس نے دروازے کے قریب رکتے ہوئے کہا۔ "ایتھے پولیس دا پیرا ہے گا۔ جے توں واج کڈھی تے فیر سوچ لئیں۔ اگے کھوا اے تے پچھے کھائی۔"

اس نے مجھے صاف صاف دھمکی دی تھی۔ شاید وہ جانتا تھا کہ میں پولیس سے چھپتی

پھر رہی ہوں۔ پر وہ کون تھا' مجھے کہاں لے جا رہا تھا' میں کچھ نہ جان پائی۔ میں نے صرف لمحے بھر میں ہی فیصلہ کر لیا کہ میں تنہا نہ تو اس کے چنگل سے نکل سکتی ہوں نہ یہاں ویرانی میں میرے چیخنے چلّانے سے کوئی فرق پڑنے والا ہے' سوائے اس کے کہ میں عتاب میں آ جاؤں' میں کچھ بھی نہیں کر سکتی اس لیے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینا ہی بہتر تھا۔ میں نے زندگی کو بچپن ہی سے اتنا مشکل اور تکلیف دہ پایا تھا کہ اب اس سے انسیت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ میرے لیے وہ چند روز ہی حسین زندگی کی مثال تھے جو کادے کی قربت میں گزارے تھے' ان دنوں جیسے میں نے پہلی بار زندگی کے پُرکشش لمس کو محسوس کیا تھا۔ وہ لمس آج بھی بدن پر' آنکھوں پر اور ہونٹوں پر محسوس ہوتا تھا۔ اب تو وہ سب کچھ مجھ سے اتنی دور ہو چکا تھا کہ میں صرف سوچ ہی سکتی تھی۔ کادے کا چہرہ دھندلایا اور اس کی سرگوشیاں مدھم ہوئیں تو جیسے زندگی بہت دور رہ گئی۔ اب تو میرے پہلو میں موت تھی اور سامنے اندھیرا۔

"او چل ناں!" اس دیو نما آدمی نے میرے بازو کو جھٹکا دیا۔

"تُو بازو چھوڑ میرا۔ تب چلوں گی۔" میں نے ضدی انداز میں کہا۔

"ورنہ..... ورنہ تُو کیا کر لے گی؟" اس نے بپھرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"مَیں جاؤں گی..... پانویں توں جندبی کڈھ لے۔"

"اوہو..... ہو..... ہو۔" اس نے زور سے قہقہہ مارا' یوں جیسے اس کی آواز سننے والا دور تک کوئی نہ ہو۔ اس سے مجھے یہ اندازہ ہو ہی گیا کہ اس نے پولیس کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔ بہرحال میں پھر بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی سوائے اس کے کہ میں اس سے ہاتھ چھڑا کر بھاگ جاؤں۔ بھاگ جانے کا خیال آتے ہی میں چوکنی ہو گئی۔ یہ تو میں کر ہی سکتی تھی۔ میں چپ چاپ اس کے ساتھ باہر آ گئی' اس کی گرفت میرے بازو پر بہت سخت تھی' یوں لگتا تھا۔ جیسے اس کی انگلیاں گوشت میں دھنسی جا رہی ہیں۔ باہر ایک کھلی جیپ کھڑی تھی۔ یہ جیپ چوہدری نیاز کی نہیں تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ چوہدری نیاز جیسے آدمی کے سامنے بھیگی بلی بن کر جانے سے بہتر تھا کہ میں کسی کھائی میں چھلانگ لگا کر مر جاتی۔ وہ اکیلا ہی تھا' یہ دیکھ کر بھی مجھے حیرت ہوئی لیکن میں چپ چاپ جیپ میں بیٹھ گئی۔ وہ کافی چوکنا تھا۔ میرا ہاتھ چھوڑے بغیر وہ اچھل کر

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ایک ہاتھ سے اس نے سیلف میں چابی گھمائی' میرا ہاتھ پکڑے پکڑے گیئر بدلا اور جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ اس نے لمحہ بھر کو بھی میرے ہاتھ پر اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی کہ میں چھلانگ ہی لگا دیتی۔ جیپ کماد کے کھیتوں اور ریل کی پٹڑی کے درمیان اچھلتی' کودتی' جھٹکے لیتی آگے بڑھتی رہی۔ میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ کہاں جا رہا ہے مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ہم کافی دیر بعد ایک کچی سڑک پر نکل آئے۔ یہاں سے ایک راستہ ریل کی پٹڑی سے دور ہوتا ہوا دور نظر آنے والے ٹیلوں میں جا کر غائب ہو چکا تھا۔ اس نے جیپ اس رستے پر ڈال دی۔ میرا دل دھڑک اٹھا اس لیے کہ میں نے دوسرے گاؤں یا شہر کی طرف جانے والی سڑک ہی دیکھی تھی جب کہ یہ بالکل مختلف راستہ تھا اور جانے کدھر کو جاتا تھا۔ میں کسمسائی تو اس نے سر موڑ کر مجھے دیکھا۔ آسمان پر سرمئی رنگ گہرا ہو چکا تھا شاید صبح ہونے والی تھی۔ اتنی کم روشنی میں بھی میں اس کی آنکھوں میں بھری وحشت دیکھ کر سہم میں گئی۔ "تُسی مینوں کتھے لے چلے او!" میں روہانسی ہو گئی۔

"میں تینوں افک دے پار لے چلا آں۔ اعتراض اے تینوں؟" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

نہ معلوم اس کے لہجے میں ایسا کیا تھا کہ جس نے مجھے بے چین کر دیا۔ وہ کسی صورت یہ بتانے کو تیار نہ تھا کہ وہ کون ہے اور مجھے کہاں لے جا رہا ہے اور میں کسی حال میں بھی خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ اس نے مجھے بری طرح سہما کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت جیپ کی رفتار بہت کم نہ تھی مگر یوں لگا جیسے میرے اندر طوفان سا اٹھا ہے۔ میں نے بے سوچے سمجھے جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا اور دائیں طرف کود گئی۔ میرے پیر زمین سے ٹکرائے تو یوں لگا جیسے میری روح بدن چھوڑ بیٹھی ہو۔ پوری دنیا گھوم گئی اور پھر شاید میرا سر زمین سے ٹکرایا تھا۔ میری بند ہوتی آنکھوں میں وہ منظر بس گیا کہ جیپ دھول کے غبار میں میری جانب مڑ رہی تھی۔ میں شاید بے ہوش ہو گئی تھی۔ کاش میں اس وقت مر چکی ہوتی۔ یہ خیال مجھے اس وقت آیا جب روشنی میری آنکھوں میں چبھنے لگی۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ چار آدمی تھے' ہیبت ناک اور خوفناک شکلوں کے۔ بڑی بڑی مونچھیں ان کے چہرے کی ہیبت کو مزید بڑھا رہی تھیں۔

میں نے اٹھنا چاہا تو انکشاف ہوا کہ میں اٹھ نہیں سکتی۔ بدن میں درد کی ٹیسیں سی بل کھا کر رہ گئیں۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک پتلے سے گدیلے پر پڑی تھی۔ یہ گدیلا فرش پر بچھا ہوا تھا۔ میری کہنی پر پٹی بندھی تھی، سر بھی پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ کمر پھوڑے کی طرح دکھ رہی تھی اور ٹانگیں تو لگتا تھا جیسے ہیں ہی نہیں۔ اٹھنے کی کوشش میں میرے منہ سے بے ساختہ کراہ نکلی جس نے ان چاروں کو چونکا دیا۔ میں نے ان کے اپنی جانب پلٹنے سے پہلے ہی آنکھیں بند کر لیں اور یوں بن گئی جیسے یہ کراہ بے ہوشی میں میرے منہ سے نکلی ہو۔

"دیکھو اسے۔" ایک بھاری اور بھرائی ہوئی سی آواز آئی۔ پھر کوئی میرے قریب آ گیا۔

"نہ جی، ہوش تو کوئی نئیں۔" کسی نے میرے قریب بیٹھے بیٹھے کہا۔

"اس گاؤں میں کوئی ڈاکٹر ایسا نہیں جو اسے دیکھ لے۔" وہی پہلی والی آواز آئی۔ وہ بڑی صاف اردو بول رہا تھا گو اس کا لہجہ بھی اس کے پنجابی ہونے کی چغلی کھا رہا تھا مگر وہ اردو کراچی والوں جیسی بول رہا تھا۔

"چھیلا گیا تے اے..... گورنامنٹ ڈسپنسری دا اک بندہ ہے گا، شاید او مل جائے۔" جو بھی میرے قریب بیٹھا تھا، وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"بہت دیر ہو گئی ہے۔ ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔ ہمیں مانگا منڈی تک جانا ہے۔" بھرائی ہوئی آواز والا بولا۔

"اس بلا کو اتار دینا تھا پھر چلتے۔"

"بکواس بند کرو..... جسے تم بلا کہہ رہے ہو وہ پانچ لاکھ کا مال ہے۔"

"پانچ لاکھ؟ مجھے یقین نئیں آتا۔ چوہدری پانچ دھیلا بھی نئیں دینے والا۔"

"پھر اسے اپنی جان دے کر یہ قیمت چکانا ہو گی۔ حساب لگائیں تو وہ بھی پانچ لاکھ سے زیادہ کا نہیں۔ میں سمجھوں گا کہ حساب برابر ہو گیا۔"

"تم بھول رہے ہو ملک کاکا۔ حساب برابر نہیں ہونا، تیرا پلہ بھاری رہنا اے، یہ سوہنی تو فیر مفت ہوئی ناں!" اس کے انداز میں جانے کیا تھا کہ میرا دل لرز اٹھا اتنا میں جان گئی تھی کہ یہ جو بھی ہیں مجھے چوہدری نیاز کے ہاتھوں بیچنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے

انھیں چوہدری نیاز ہی نے لالچ دیا ہو کہ یہ لوگ مجھے اس کے حوالے کر دیں تو وہ انھیں پانچ لاکھ روپے دے گا۔ اس شخص نے ٹھیک کہا تھا کہ چوہدری، اگر یہ چوہدری نیاز ہی تھا تو، پانچ دھیلے دینے والا بھی نہیں تھا۔ وہ مجھے حاصل کرتے ہی ان سب کو بھون کے رکھ دیتا۔ جس شخص کی نظر میں پیسے کے آگے خون کی کوئی حیثیت نہ ہو، وہ میرے لیے اتنی بڑی رقم کیسے دے سکتا تھا؟

"بحث نہ کیا کرو۔" میں سوچ ہی رہی تھی کہ پھر وہی بھرائی ہوئی آواز آئی۔ "تم ڈاکٹر کا انتظام کرو، اسے ایسی حالت میں لے جانا بھی خطرناک ہے پھر ہم اتنی جلدی، یوں بغیر روپیہ ملے، اسے اس کے حوالے نہیں کرنا چاہتے۔ ویسے بھی میں کام صاف کرتا ہوں اور صفائی پسند کرتا ہوں۔"

"تو یہ تو مہینا نئیں ٹھیک ہونے والی۔"

"اگلے مہینے سہی۔" جواباً اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"ملک کاکا! عورت گلے کا گھنٹا ہوتی ہے۔ جہاں جاؤ گے، پہلے ہی لوگوں تک خبر پہنچ جانی ہے۔ مانو تو پہلے اس کا سودا مکاؤ۔ بندہ بھیج دو چوہدری تک۔"

"یہ علاکا دانو گردیزی کا ہے گا۔ سوچ لو، اج دو جا دن چڑھیا اے۔"

"جب سے تُو نے شادی کی ہے تُو بزدل ہو گیا ہے۔ اب یقین آ رہا ہے کہ عورت واقعی گلے کا گھنٹا ہوتی ہے۔" بھرائی ہوئی آواز والا شخص غصے سے بولا۔

اور پھر یوں لگا جیسے وہ دور چلا گیا ہو۔ وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا، میں نے آنکھ کی جھری سے دیکھا، وہ واقعی دروازے سے باہر جا رہا تھا۔ باقی تینوں بھی اس کے پیچھے ہی باہر چلے گئے۔ میں نے چند لمحے کو پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اسی وقت کسی نے باہر کی طرف کھلنے والا دروازہ بند کر دیا۔ بند کرنے والے نے باہر سے کنڈی بھی لگا دی تھی۔ میں نے کنڈی کی آواز سنتے ہی آنکھیں کھول دیں۔ سب سے پہلے میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ کسی پکی لال اینٹوں کے بنے مکان کا کمرا تھا۔ کمرے میں ایک طرف پیٹرومیکس رکھا تھا۔ دیوار پر لگی کھونٹیوں پر مردانہ کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ اس کے نیچے ہی انگریزوں والے لمبے لمبے جوتے رکھے تھے۔ ایسے جوتے میں نے چوہدری نیاز کی حویلی میں بھی دیکھے تھے اور بڑی زمیندارنی سے پوچھا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ یہ انگریزوں والے جوتے ہیں، چوہدری نیاز

اکثر شکار پر جاتے ہوئے وہی جوتے پہنا کرتا تھا۔ ایک طرف کچھ برتن پڑے تھے۔ پلیٹوں میں بھنے ہوئے مکئی کے دانے اور کچھ پکوڑے پڑے تھے جنہیں دیکھتے ہی میری بھوک چمک اٹھی۔ دن کی روشنی تھی مگر لگتا تھا جیسے شام کا وقت ہے جب کہ ریل کی پٹڑی کے قریب بنے کوارٹر سے ہم جیپ پر روانہ ہوئے تھے اس وقت سویرا نکلنے والا تھا۔ شاید میں سارا دن بے ہوش رہی تھی۔ یہ خیال آتے ہی مجھے اپنی تکلیف کا احساس ہوا۔ میں نے دیکھا کہ میرے داہنے بازو پر کلائی سے اوپر تک پٹی بندھی تھی۔ پٹی کسی رنگین کپڑے کی تھی۔ سر پر بھی پٹی تھی۔ گھٹنے پھوڑے کی طرح دکھ رہے تھے۔ ان پر بھی کپڑا باندھا گیا تھا اور شاید میرے کولھے کی ہڈی پر بہت سخت چوٹ آئی تھی کیونکہ باوجود پوری کوشش کے میں خود کو ذرا سی بھی جنبش نہیں دے سکی۔ گویا میں معذور ہو گئی تھی۔ میں نے چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر پلیٹوں میں پڑے پکوڑے یا چنے اٹھالوں مگر پلیٹیں مجھ سے دور تھیں اور سرکنے کا یارا ہی نہ تھا۔ ذرا سا بھی ہلنے کی کوشش کرتی تو بے ساختہ سی چیخ ہونٹوں تک آ کر رہ جاتی اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ یہ شخص یقیناً ہمارے گاؤں کا نہیں تھا ورنہ میں اسے ضرور جان جاتی۔

اب بات کسی حد تک واضح ہو چکی تھی کہ چوہدری نیاز نے ہر طرف سے مایوس ہو کر اس شخص سے میرا سودا کر لیا تھا۔ یہ شخص میرے بارے میں کیسے جانتا تھا' مجھ تک کیسے پہنچا' یہ سب میرے لیے حیران کن تھا۔ جانے یہ کب سے اور کہاں سے میرے پیچھے لگا ہوا ہو گا جبھی تو وہ اماں کے گھر تک پہنچ گیا۔ جانے اسے کیسے پتا چل گیا کہ میں وہاں ہوں۔ میں بھی ملک کاما کی صورت ابھی نہیں دیکھ سکی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ یہ وہ شخص قطعی نہیں ہے جو مجھے گھر سے اٹھا کر لایا ہے۔ اس شخص کا لہجہ ٹھیٹ پنجابیوں والا تھا جب کہ ملک کاما بڑی صاف اردو بول رہا تھا اور اس کے لہجے سے یہ اندازہ بھی بہت کم لوگ لگا سکتے تھے کہ وہ پنجابی ہے۔

میں نے اماں اور ابا سے ڈکیتوں کی بہت سے کہانیاں سنی تھیں' پتا نہیں مجھے کیوں یہ خیال آ رہا تھا کہ ملک کاما بھی انہی جیسا ڈکیت ہے جو ڈاکے کے علاوہ پیسے لے کر قتل بھی کرتے ہیں۔ آگے پیچھے حالات ایسے نہیں تھے جیسے اب ہو گئے تھے۔ میری معذوری نے مجھے بے بس کر دیا تھا ورنہ شاید میں یہاں سے بھی بھاگنے کا سوچتی۔ اب مجھے افسوس ہو رہا

تھا کہ میں نے ناحق چلتی جیپ سے چھلانگ لگائی۔ ہوا تو کچھ بھی نہیں الٹا میں معذور ہو کر رہ گئی۔ اب وہ لوگ مجھے بڑی آسانی سے چوہدری نیاز کے حوالے کر سکتے تھے۔ نہ میں اپنی آزادی کے لیے کچھ کر سکتی تھی' نہ اس قابل تھی کہ چوہدری نیاز کا منہ نوچ سکوں۔ اپنی بے بسی اور بے چارگی پر میرے آنسو نکل آئے۔ نہ معلوم میں کہاں تھی۔ مجھے گھر سے غائب ہوئے کتنا عرصہ' کتنے دن گزر چکے تھے۔ جانے کادے نے کیا کیا ہو گا! کیا سوچا ہو گا۔ ماما مجھے نہ پا کر کیسا تڑپا ہو گا' بابا کتنا بلک کر رویا ہو گا اور خالہ فاطمہ..... اس نے خود کو تو بہت کوسا ہو گا کہ اس نے مجھے اماں کے گھر کیوں جانے دیا۔ انھیں کیا پتا کہ میں یہاں کس حال میں ہوں۔ کیا خبر میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اگر ان لوگوں نے مجھے چوہدری کے حوالے کر دیا تو وہ تو میری لاش کو کتوں سے نچوا دے گا اور کادا..... کادا مجھے تلاش ہی کرتا رہ جائے گا۔ بابا رب سے میری خیریت کی دعائیں مانگتا رہے گا اور ماما..... ماما شاید چوہدری کو مارنے کی آس لیے گھٹ گھٹ کر مر جائے گا۔

اب میرے پاس یہ باتیں سوچنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ پانچ لاکھ روپے کی لالچ کم نہ تھی کہ وہ ڈکیت میری التجا پر مجھے چھوڑ دیتے پھر بھی میں نے سوچ لیا کہ میں ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر دیکھوں گی' ان سے منتیں کروں گی شاید رب ان کے دل میں نرمی ڈال دے' رحم ڈال دے۔ میں کتنی ہی دیر روتی رہی' شاید کئی گھنٹے گزر گئے مگر کوئی نہ آیا۔ میرے آنسو خشک ہو گئے۔ بھوک سے پیٹ میں درد ہونے لگا۔ سر درد سے پھٹنے لگا تب میں نے زور سے آواز دی۔ "کوئی ہے..... پانی..... پانی دے دو۔"

تبھی باہر بھاری قدموں کی آواز ابھری۔ چند لمحے بعد ہی کسی نے دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر ایک دبلا پتلا منحنی سا' ٹیڑھی ناک والا آدمی کھڑا تھا۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر اس نے پلٹ کر کسی کو میرے ہوش میں آ جانے کی اطلاع دی پھر کمرے میں داخل ہو گیا۔

"پانی..... پانی دے دو۔" میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ میں نے آواز دی تو مجھے شدت سے پیاس کا احساس ہوا۔ میرا حلق تک خشک ہو رہا تھا۔ اس نے لپک کر ایک پلاسٹک کا برتن اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے نکلتے ہی دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ کمرے میں اب کچھ اندھیرا چھا گیا تھا پھر بھی میں ان دونوں کو صاف طور پر دیکھ سکتی تھی۔ وہ دونوں بھی میرے لیے قطعی اجنبی تھے۔ ایک آدمی

سانولے رنگ کا گٹھے ہوئے بدن کا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں' داہنے رخسار پر موٹا سیاہ مسہ تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی مگر چمک دار تھیں۔ دوسرا شخص لمبا چوڑا' گورے رنگ کا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا رعب تھا۔ چمکتے ہوئے چہرے پر سیاہ مونچھیں' سیاہ گھنی داڑھی اور سیاہ بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ اس کی آنکھوں میں عجیب ٹھنڈی ٹھنڈی کیفیت تھی۔ وہ دونوں میرے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ دونوں ہی مجھے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ گٹھے ہوئے بدن والا شخص سلیٹی شلوار اور قمیض میں تھا۔ دوسرے شخص نے آسمانی شلوار قمیض پہن رکھا تھا۔ اوپر کالی واسکوٹ تھی۔ گلے میں کالا ہی مفلر ٹائپ کا کپڑا تھا۔ وہ ایک خوب صورت اور بارعب شخص تھا۔

"تکلیف کیسی ہے تمھاری؟" اسی گورے اور لمبے چوڑے شخص نے مجھ سے پوچھا تو مجھے پتا چلا کہ وہی ملک کاما ہے۔ میں اسے آواز سے پہچانی تھی۔

"تم کون ہو؟" جانے یہ بے خوفی کہاں سے در آئی تھی کہ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

وہ دھیرے سے مسکرایا۔ "تمھیں کیا نظر آ رہا ہوں۔" اس کے مسکرانے کی وجہ سے میرا حوصلہ ایک دم بڑھ گیا۔

"دکھتے تو انسان ہو پر کوئی انسان کسی اکیلی لڑکی کو یوں نہیں اٹھواتا۔ تم..... تم مجھ سے کیا چاہتے ہو..... میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

یوں لگا جیسے میرے کہے ہوئے الفاظ میں کوئی ایسا جادو تھا جو انسان کو درندہ بنا سکتا ہے۔ وہ کھڑے کھڑے تمتما گیا۔ اس کی آنکھوں کی نرمی جیسے آنکھوں ہی میں کہیں تحلیل ہو گئی۔ چہرہ سرخ ہو کر تپ گیا' جبڑے بھنچ گئے اور یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی بھر گئی ہوں۔ گھور گھٹاؤں کی سی ٹھنڈک شعلوں میں تبدیل ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا' پھر ایڑیوں کے بل گھوم گیا۔ دوسرا گٹھے ہوئے جسم کا مالک سراسیمہ ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر پہلے ملک کاما کو' پھر مجھے دیکھا اور چند قدم میری طرف بڑھ آیا۔

"اے..... تو زیادہ بات مت کر..... بک بک کرنے کی ضرورت نہیں ہے....."

"یہاں..... اس دنیا میں سب کچھ کر گزرنے والے انسان ہیں..... ایسے انسان جن کے اندر شیطان گھر کر گیا ہے۔" ملک کاما نے پھنکارتی ہوئی آواز میں کہا۔

"پر..... کیا وہ شیطان تم میں بھی....." ابھی میں نے جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ وہ چیخ اٹھا۔ یوں لگا جیسے کسی نے اس کے کلیجے میں بھالا اتار دیا ہو۔

"ہاں..... ہاں..... مجھ میں بھی..... مجھ میں بھی وہی شیطان ہے۔"

"بس کر ملک کاما..... بس کر..... چل باہر' باہر چل....." گٹھے ہوئے جسم کے آدمی نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا اور تقریباً گھسیٹتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ ملک کاما میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعاعوں کی تپش' میں اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔

"شادے..... اس سے کہہ کہ یہ چپ کر کے پڑی رہے۔ زندگی اور انسانیت کا فلسفہ سکھانے کی ضرورت نہیں ہے مجھے..... میں..... میں اسے اٹھوا کر کتوں کے آگے پھینکوا دوں گا۔" مارے طیش کے وہ بل کھا رہا تھا۔ "میں..... میں نہیں چاہتا کہ اس معذور کو..... اس مجبور کو اس حالت میں چوہدری کے حوالے کر دوں کہ یہ..... یہ....."

"معذور اور مجبور مجھے ان چوٹوں نے نہیں کیا ہے۔" خدا جانے وہ کیا بات تھی جو مجھ میں بھی شعلے دہکا گئی تھی۔ شاید موت کو بالکل اپنے سامنے دیکھ کر آدمی یونہی نڈر ہو جاتا ہے' اپنے اندر سے سب کچھ نکال دینا چاہتا ہے' وہ سارے بوجھ اتار دینا چاہتا ہے جو اس کی روح کو ہلکا پھلکا نہیں ہونے دیتے۔ میری بات سن کر ملک کاما نے شادے کی گرفت سے اپنا بازو ایک جھٹکے سے چھڑایا اور پھر میرے قریب آ گیا۔ اس کا انداز جارحانہ تھا مگر میں ذرا بھی نہ ڈری۔

"پھر.....؟" اس نے بپھرے ہوئے انداز میں کہا۔

"پھر یہ کہ میں ایک لڑکی ہوں..... ایک بے آسرا اور تنہا لڑکی' تم مضبوط ہاتھ پیروں والے مرد اور ایک نہیں چار مرد' جو مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے ہو اور محض ان ٹکوں کے لیے جو بہرحال ایک روز ختم ہو جائیں گے مگر تمھارے نزدیک پانچ لاکھ روپے اتنی بڑی رقم ہے جس کے عوض تم ایک جان ختم کر سکتے ہو۔ ایک عورت کو بیچ سکتے ہو'

تم جیسے وہ لوگ تم سے زیادہ اچھے ہیں جو عورتوں کو بازار میں بیچ دیتے ہیں مگر موت کے کارندے کے ہاتھوں نہیں' کسی ایسے شخص کے ہاتھوں نہیں بیچتے جو ان عورتوں کی زندگیوں کو ختم کر دیتے ہیں' یوں ایک اچھی زندگی کی آس انھیں آگے بڑھنے اور جدوجہد کرنے کے لئے اکساتی تو رہتی ہے۔ ان میں سے چند تو شاید ان جہنم کدوں سے نجات بھی حاصل کر لیتی ہوں..... مگر تم..... تم تو ان مردوں سے بھی گھٹیا اور ذلیل ہو۔"

میری آواز بتدریج بلند ہوتی چلی گئی اور آخری جملہ تو میں نے اپنی پوری قوت سے چیخ کر کہا تھا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے تپتے چہرے پر زلزلے کے سے آثار تھے۔ اس کے خوب صورت نقوش مسخ ہو چکے تھے۔ وہ پتھرا کر رہ گیا تھا۔ میں تو سمجھی تھی کہ اب وہ بے قابو ہو کر میرے بال پکڑ لے گا' میری چوٹوں کا خیال کیے بغیر اپنے مضبوط بازوؤں سے مجھے اٹھا کر زمین پر پٹخ دے گا مگر وہ یوں کھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا جیسے وہ گوشت پوست کا نہ ہو سنگِ مرمر سے تراشا گیا ہو' میں جانتی تھی کہ اس سکوت اور پتھریلے پن کے اندر کیسی زوروں کی آندھی چل رہی ہو گی' کیسے آتش فشاں پھٹ رہے ہوں گے اور میں تو یہی چاہتی تھی کہ وہ مجھے چوہدری نیاز کے حوالے کرنے کی بجائے اپنے ہاتھوں سے مار دے۔ گلا گھونٹ دے میرا مگر مجھے اس کتے کے حوالے نہ کرے جس کو تہس نہس کر دینے کی قسم میں اپنی اماں کی بند ہوتی آنکھوں کے سامنے کھا چکی تھی۔ میں اس حالت میں اس تک نہیں جانا چاہتی تھی مگر وہ..... وہ ساکت کھڑا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر سے نگاہ ہٹائی تو میری نظر دروازے سے جھانکتے ہوئے ان دونوں آدمیوں کے چہرے پر پڑی جو کافی دیر پہلے ہی کمرے سے باہر جا چکے تھے اور اب غالباً میری آواز سن کر اندر جھانک رہے تھے۔ وہ گٹھے ہوئے بدن کا آدمی بھی خوف اور دہشت سے سفید ہو چکا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں ملک کاما کے چہرے کی لرزتی ہوئی کھال پر جمی ہوئی تھیں۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے ملک کاما سے غصے کی زیادتی کی وجہ سے بولا نہ جا رہا ہو۔ اس کے ہونٹ پھڑک رہے تھے مگر اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اچانک وہ پلٹا۔ اس نے کونے میں رکھے برتنوں کو زور سے لات ماری' کمرے میں شور سا مچ گیا۔ میرا دل

بھی لرز اٹھا مگر میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ ایک مرتبہ پھر میری جانب مڑا اور پھر کسی دیو کی طرح جھومتا ہوا دروازے سے باہر چلا گیا۔ جاتے جاتے بھی اس نے دروازے کو لات ماری پھر کمرے میں سکوت چھا گیا۔ شادے نام کا آدمی چند لمحے وہاں کھڑا مجھے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورتا رہا پھر وہ بھی لپک کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ دروازے سے جھانکنے والے دونوں آدمی جو ملک کاما کو باہر نکلتے دیکھ کر دور ہو گئے تھے' اب پھر دروازے کے قریب آ گئے' وہ مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میں دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہوں۔ میں خاموشی سے انھیں دیکھتی رہی۔ ایک نے جھجکتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا۔

"یہ تُو..... تُو نے کیا کیا؟ باؤ کو غصہ دلانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ وہ تو میٹھے پانی کا سمندر ہے۔ کیا کیا تُو نے؟" ان میں سے ایک حیرت سے بولا۔

"وہ میٹھے پانی کا سمندر نہیں' سمندر کے اندر اٹھنے والا جوار بھاٹا ہے۔ اس کے اندر رحم نہیں' غیرت نہیں' انسانیت نہیں' سنگلاخ چٹانیں ہیں' پتھر ہیں' میں نے تو کچھ نہیں کیا' ان پتھروں کو کوٹنے کی کوشش کی ہے۔ ان..... ان ہاتھوں سے..... ان کمزور ہاتھوں سے۔" میں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے پھیلا دیے تب میری نگاہ اپنی چھلی ہوئی ہتھیلیوں پر پڑی جن پر خون چھلک رہا تھا۔ شاید جیپ سے چھلانگ لگاتے ہوئے میرے ہاتھ چھل گئے تھے۔

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہے؟" دوسرے نے حیرت سے پہلے مجھے پھر اپنے ساتھی کو دیکھ کر پوچھا۔

"بات سن! ملک کاما دوسرے ٹائپ کا آدمی ہے۔ زیادہ بولنے والے کا کلیجہ نکال دیتا ہے۔ وہ بزنس مین ہے' بزنس مین..... روکھڑا اس کا ایمان ہے' تُو سب کچھ بھول جا اور بس۔"

میرا جی چاہا کہ میں اس شخص کا منہ نوچ لوں مگر میری معذوری نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ ابھی میں اسے جواب دینے ہی والی تھی کہ اچانک وہ دونوں ہڑبڑا کر پیچھے ہٹ گئے دوسرے ہی لمحے کمرے میں ملک کاما داخل ہوا۔ وہ اب پُر سکون تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا' آنکھوں میں وہی پہلے والی نرمی تھی۔ اس کے پیچھے ہی شادے نام کا آدمی تھا اور اس نے ہاتھ میں ایک کالا ڈبا اٹھا رکھا تھا۔ اس کے پیچھے ایک بوڑھا سا آدمی تھا۔ چوخانے والی

دھوتی باندھے' اس پر کھدر کا لمبا کرتا پہنے' سر پر پگڑی لپیٹے' وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آ گیا۔ اس نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا' پھر وہ میری کہنی کی پٹی کھولنے لگا۔ میں ملک کاما کو غور سے دیکھ رہی تھی جس کی نگاہیں میری کہنی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میری تیز نگاہوں کو اپنے چہرے پر محسوس کر رہا ہے مگر اس نے نگاہ اٹھا کر میری جانب نہیں دیکھا۔

بوڑھے دیہاتی نے میری پٹی کھول دی تھی۔ میں نے دیکھا کہ زخم گہرا تھا اور خراب ہو گیا تھا جبھی میرے بازو میں اس قدر تکلیف تھی۔ اس نے اچھی طرح زخم دیکھنے کے بعد اس کالے ڈبے کو کھولا۔ چند لمحے وہ اس میں کچھ تلاش کرتا رہا پھر ایک دوا نکال کر اس نے روئی سے میرے زخم پر لگائی تو یوں لگا جیسے اس نے میرے زخم میں مرچیں سی بھر دی ہوں۔ میں بے ساختہ چیخ اٹھی۔ ملک کاما کے پتھریلے چہرے پر لمحہ بھر کو بے کلی سی چھائی مگر دوسرے ہی لمحے وہ پُرسکون ہو گیا۔ پھر وہ دیہاتی جو غالباً ڈاکٹر تھا' کافی دیر تک میرے زخم دھوتا رہا' دوا لگاتا رہا۔ میں سسکیاں بھرتی رہی' ملک کاما پر بے کلی چھاتی رہی۔ وہ بوڑھا خاموشی سے اپنے کام میں لگا رہا۔ اس کے چہرے پر میرے لیے شفقت اور ہمدردی تھی۔ شادا برابر میں رکھے ہوا بھرنے والے اسٹوو پر پانی گرم کر کے دیتا رہا' پھر اس نے باقی گرم پانی میں چائے کی پتی ڈال کر چائے بنالی۔ اسے چائے بناتا دیکھ کر مجھے پھر اپنی بھوک کا خیال آ گیا اور میں نے بلا جھجک کہہ دیا کہ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ میری بات سن کر ملک کاما نے گھور کر شادے کی طرف دیکھا۔

"اسے ابھی تک کھانا نہیں دیا؟"

اور وہ کوئی جواب دیے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ بوڑھا اب اپنا کالا ڈبا بند کر رہا تھا۔ ڈبا بند کر کے اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ "تو جلدی ٹھیک ہو جائے گی' فکر نہ کرنا' روٹی پیٹ بھر کر کھانا۔" پھر وہ ملک کاما کی طرف پلٹا۔ "اسے وقت پر کھانا اور دوا ملنا چاہیے۔ دوا بھیج دوں گا اسے لگی بندھی کھانا۔ زخم کی روز دھلائی ہو گی ورنہ یہ خراب ہو جائیں گے۔ ابھی یہ سفر کے قابل نہیں ہے اسے مکمل علاج اور آرام کی ضرورت ہے۔"

"ہم یہاں سے جانا چاہتے ہیں' زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتے۔" ملک کاما نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"میں نے اپنا مشورہ دیا ہے' اگر تم اسے اس حالت میں لے کر سفر کرو گے تو مٹی دھول اور تکان کی وجہ سے اس کی حالت مزید خراب ہو گی۔ آگے تمھاری مرضی۔" اس نے اپنا ڈبا اٹھاتے ہوئے کہا' پھر وہ جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

ملک کاما نے واسکوٹ کی جیب سے روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے "یہ لو....."

اس نے حقارت سے ان روپوں کی طرف دیکھا اور بولا۔ "میں کسی بے سرا' مجبور' تنہا اور معذور لڑکی کے علاج کی فیس نہیں لیتا۔ یہ جائز نہیں ہے۔ ناجائز کام میں کرتا نہیں ہوں۔" اس کے لہجہ میں گہرا طنز تھا۔

میں نے ملک کاما کو دیکھا۔ اس کے پُرسکون چہرے پر پھر زلزلے کے سے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے روپوں کو مٹھی میں بھینچ لیا پھر انھیں کسی پتھر کی طرح پوری قوت سے دیوار پر دے مارا۔ اس دیہاتی بوڑھے ڈاکٹر پر اس کی اس حرکت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ویسے ہی پُرسکون کھڑا رہا پھر اس نے مسکرا کر میری جانب دیکھا اور پلٹ کر کھلے ہوئے دروازے سے باہر نکل گیا۔ کمرے میں گہرا سناٹا طاری تھا۔ ملک کاما شعلہ بنا دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت شادا ہاتھ میں روٹی کی چھابی اور پلیٹ پکڑے داخل ہوا۔ "اٹھ..... روٹی کھا لے۔" اس نے چھابی اور پلیٹ میرے قریب رکھتے ہوئے کہا۔

"میں اُٹھ نہیں سکتی۔ تُو یہ میرے قریب رکھ دے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ اس نے چھابی اور پلیٹ میرے قریب سرکا دی۔ ملک کاما اب میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں ان لوگوں کے باہر جانے کا انتظار کرنے لگی۔ شاید وہ سمجھ گیا کہ میں ان کی موجودگی میں روٹی نہیں کھانا چاہتی۔ اس نے شادے کو باہر آنے کا اشارہ کیا اور خود بھی باہر چلا گیا۔ باہر جا کر انھوں نے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے فوراً ہی سر گھما کر کھانے کی طرف دیکھا۔ وہ آلو گوبھی ٹماٹر کی بھاجی تھی۔ گرم گرم' بھاپ اٹھتی ہوئی بھاجی۔ میں نے بڑے بڑے نوالے لینا شروع کر دیے۔ مجھے بے تحاشہ بھوک لگی ہوئی تھی۔ دس منٹ میں ہی ساری بھاجی اور روٹی ختم کر چکی تھی۔ کھانا کھاتے ہی مجھے اونگھ آنے لگی۔ میرے زخموں کی تکلیف میں بھی کچھ کمی تھی' پھر پیٹ بھر کر کھانے سے ہی مجھ پر غنودگی چھا گئی اور میں چند ہی

لمحوں میں بے خبر سو گئی۔

☆=========☆=========☆

ہم وہاں چار روز رہے۔ شاید ڈاکٹر کے کہنے کی وجہ سے ملک کاما نے اپنا سفر ملتوی کر دیا تھا۔ ان چار دنوں تک وہ دیہاتی بوڑھا میرے زخم دھونے اور دوا لگانے آتا رہا۔ جتنی دیر تک وہ بوڑھا میرے پاس ہوتا شادا میرے سر پر کھڑا رہتا تھا۔ میں نے کئی بار محسوس کیا کہ وہ بوڑھا مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ وہ بار بار شادے کی طرف دیکھتا اور بے چین سا ہو جاتا تھا۔ میں خود بھی اس تمام عرصے میں محسوس کر چکی تھی کہ وہ بوڑھا میری مدد کر سکتا ہے۔ میں اس سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ مجھے یہاں سے نکال دے، مگر ایک بڑا مسئلہ تو میری معذوری تھی۔ میں اب اٹھ کر بیٹھنے کے قابل تو ہو گئی تھی مگر میری ٹانگیں، گھٹنے کی چوٹ کی وجہ سے بیکار ہو کر رہ گئی تھیں۔ کولھے کی چوٹ بھی مکمل ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ وہ اگر میری مدد کرتا بھی تو مجھے یہاں سے فرار ہونے کے لیے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ضروری تھا۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ اب کسی بھی وقت ملک کاما یہاں سے روانہ ہونے کی تیاری نہ شروع کر دے۔ بوڑھے ڈاکٹر نے مجھے تیل بھی دیا تھا اور کہا تھا کہ میں اسے اپنے کولہے کی چوٹ پر ملوں۔ یہ چوتھے روز کی بات ہے کہ بوڑھے نے شادے سے کہا کہ وہ ملک کاما سے بات کرنا چاہتا ہے۔ شادے نے گرم پانی کی پتیلی اسے دی اور اپنے ہاتھ کُرتے کے دامن سے پونچھتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ پہلے اس نے دروازے کے باہر کھڑے آدمی کو بھیجنے کی کوشش کی مگر وہ باہر نہیں تھا۔ وہ آدمی جو مستقل باہر کھڑے رہتے تھے غالباً شادے کی موجودگی میں اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ مجبوراً شادے کو ہی جانا پڑا۔ شاید بوڑھا اسی کے جانے کا منتظر تھا۔ اس کے دروازے سے باہر نکلتے ہی اس نے جلدی سے کہا۔ "یہ تیل دو دن میں تجھے ٹھیک کر دے گا۔ تیرے کولھے کے پٹھے کی کھال پھٹ گئی تھی۔ اتنے روز آرام کے بعد یہ ٹھیک ہو گئی ہے۔ اب جو درد ہے وہ اس تیل سے چلا جائے گا مگر تُو ان لوگوں کے سامنے کھڑی مت ہونا۔ یہی ظاہر کرنا کہ ابھی تُو چلنے کے قابل نہیں ہے پھر رات کو ضرور کھڑے ہونے اور قدم اٹھانے کی کوشش کرتی رہنا۔"

"ڈاکٹر جی! تم مجھے یہاں سے نکال دو..... یا..... میرے گاؤں میں میری ماسی کو اطلاع کر دو۔ وہ یہاں سے بہت دور نہیں ہے پر شاید سارا دن اور رات کا سفر ہے۔

کسی کو وہاں بھیج کر میرے ماما کو کہلا دو۔" میں نے جلدی جلدی کہا۔

"میں یہاں سے نہیں نکل سکتا۔ ان لوگوں نے مجھے بھی اپنے پاس ہی رکھا ہے۔ میرے گھر والوں کو کہہ دیا ہے کہ میں سات روز کے لیے دوسرے گاؤں جا رہا ہوں۔ میں اب تک گھر نہیں جا سکا، پر تُو فکر نہ کر۔ میں نے اتنے روز یہاں جھک نہیں ماری۔ میں..... میں تجھے نکال لوں گا۔ پر یہ خیال رکھنا کہ تجھے ابھی تکلیف کا ڈھونگ رچانا پڑے گا، اگر انھیں پتا لگ گیا کہ تُو ٹھیک ہو گئی ہے تو..... تو وہ رکیں گے نہیں اور میں بھی کچھ نہیں کر سکوں گا۔ ٹھیک ہے نا!" اس نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے سر ہلا دیا۔ میرے لیے یہی بہت تھا کہ ان لوگوں کے درمیان بھی میرا ایک ہمدرد پیدا ہو گیا تھا۔ نہ معلوم کیوں مجھے یقین ہو گیا کہ اب میں ان لوگوں کے چنگل سے نکل پاؤں گی۔ اس بوڑھے کے دو جملوں نے جیسے میرے اندر روح پھونک دی تھی۔ میں اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ جیسا وہ چاہتا ہے میں ویسا ہی کروں گی۔ ہم اتنی ہی بات کر پائے تھے کہ شادا ملک کاما کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ میں تین روز کے بعد ملک کاما کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔ اسے دیکھ کر بوڑھا اپنا ڈبا اٹھا کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "اس کے زخم تو کچھ ٹھیک ہو گئے ہیں مگر ابھی یہ چلنے کے قابل نہیں ہوئی ہے۔"

"کیوں..... اتنے روز کے بعد بھی یہ چلنے کے قابل کیوں نہیں ہوئی؟ تمہارے علاج کا فائدہ کیا ہے۔" وہ غرایا۔

"بات میرے علاج کی نہیں۔ میں نے تمہارے آدمی کو کچھ دوائیں لکھ کر دی تھیں، وہ مجھے ابھی تک نہیں ملیں۔ وہ دوائیں ضروری ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس کے کولھے کے پٹھے کا ٹشو پھٹ گیا ہے۔ وہ اتنی جلدی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے کم سے کم پندرہ روز درکار ہوتے ہیں۔"

"بکواس بند کرو۔ ہم یہاں اتنے روز نہیں رہ سکتے۔" وہ دھاڑا۔

"میری بات پوری نہیں ہوئی ہے ملک کاما۔ میں اسے اس سے بھی پہلے ٹھیک کر سکتا ہوں مگر شرط یہی ہے کہ وہ دوائیں مل جائیں۔"

"کون گیا تھا دوا لینے؟" ملک کاما شادے کی طرف پلٹ کر بولا۔

"وہ یہاں نہیں ملیں ملک! اس کے لیے ہمیں بھوئے آصل جانا پڑے گا۔"

"تو جاؤ۔" وہ پھر چیخ اٹھا۔ "گردیزی کو ہماری یہاں موجودگی کی بھنک پڑ چکی ہے۔ میں اب یہاں زیادہ عرصہ نہیں رک سکتا۔" وہ سخت غصے میں تھا۔

"ملک! میں نے پہلے ہی کہا تھا اس گھنٹے کو گلے سے اتار پھینکو۔ چوہدری کو یہاں بلوا لو اور اسے اس کے حوالے کر کے نکل چلو۔" اس نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ اس کی بات سن کر میں دھک سے رہ گئی۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ میری معذوری سے تنگ آ کر ایسا بھی کوئی فیصلہ کر سکتا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو غضب ہو جائے گا' میں واقعی لاش بنی اس کے ساتھ جانے پر مجبور ہو جاؤں گی۔ وہ میرے ساتھ ہر طرح کا ظلم کرنے کو آزاد ہو گا۔ میں خود کو بچانے کے لیے کچھ بھی نہ کر پاؤں گی۔ میں نے دیکھا کہ ملک کاما کسی گہری سوچ میں غرق شادے کو تکے جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بھی اب یہی سوچ رہا ہو۔ پتا نہیں یہ گردیزی کون تھا۔ نہ معلوم ملک کاما کو اس سے کیا خطرہ تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا' پھر اچانک ہی میں نے فیصلہ کر لیا اور بول اٹھی۔

"میں پہلے سے تو بہت چنگی بھلی ہوں۔ شاید..... شاید ایک دو روز میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ یہ دیکھو..... اب میری ایک ٹانگ تو بالکل ٹھیک ہو گئی ہے۔" میں نے جلدی سے اپنی دائیں ٹانگ ہلائی۔ گو درد کی ایک ٹیس گھٹنے سے پیروں کی طرف دوڑ گئی' کراہ ہونٹوں تک آ گئی مگر میں نے جلدی سے ہونٹ بھینچ کر اس کراہ کو روک لیا۔ میرا مقصد اسے مطمئن کرنا تھا۔ اسے اس فیصلے سے باز رکھنا تھا جو وہ کر لیتا تو شاید میری زندگی میں چند ہی روز باقی رہ جاتے۔

بوڑھا ڈاکٹر جو بے چین سا ہو گیا تھا گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"ٹھیک ہے۔ دو دن انتظار کرو' اگر یہ ٹھیک نہیں ہوتی تو برکت کو چوہدری تک بھیج دو۔ میں اپنا وقت برباد نہیں کر سکتا۔" اتنا کہ کر ملک کاما رکا نہیں' دروازے سے باہر نکل گیا۔

☆==========☆==========☆

اب میرے پاس صرف دو دن تھے۔ دو دن' اور اب تک میں اپنے پیروں پر کھڑے

ہونے کے قابل نہیں ہوئی تھی۔ میرے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ کنپٹیوں میں دھماکے ہونے لگے۔ اعصاب جھنجنا اٹھے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے مجھے صرف دو دن بعد پھانسی پر چڑھائے جانے کی اطلاع دی ہو۔ جیسے اب میری زندگی میں یہی دو دن رہ گئے ہوں۔ ملک کاما یہ حکم دے کر چلا گیا۔ شادا اس کے ساتھ ہی باہر گیا تھا۔ میں نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ وحشت اس کی آنکھوں میں بھی لہریں سی لے رہی تھی' اس کے باوجود اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے تسلی دی۔ میں جانتی تھی کہ وہ اب کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ پہلے تو مجھے خیال تھا کہ وہ چاہے تو میری مدد کر سکتا ہے' مجھے یہاں سے نکال سکتا ہے' یا کم از کم خالہ فاطمہ تک ہی میرا پیغام پہنچا سکتا ہے مگر یہ میرے لیے انکشاف تھا کہ ملک کاما نے میرا علاج کرانے کے لیے اسے بھی قید کر رکھا تھا۔ میری رہی سہی آس بھی ٹوٹ چکی تھی۔ میں ہر طرف سے مایوس ہو چکی تھی' پھر بھی دیہاتی ڈاکٹر کے تسلی دلانے پر کچھ ڈھارس سی ہوئی۔ میں نے ذرا سا سر اٹھا کر دروازے سے باہر جھانکا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ "تم کیا کرو گے؟" میں نے موقع دیکھ کر اسے مخاطب کیا جو اب اپنا دواؤں کا ڈبا بند کر رہا تھا۔

"کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔ تم آج ہی رات کھڑا ہونے کی کوشش کرو۔ یہ تیل اچھی طرح مل لینا۔" اس نے سر جھکائے جھکائے آہستہ سے جواب دیا۔ اس لمحے باہر آہٹ محسوس ہوئی' آہٹ محسوس کرتے ہی میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ غالباً شادا اندر آیا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر چلا گیا ہے۔ اس کے بعد ہی دروازہ بند ہونے کی آواز نے میرے بے حس و حرکت بدن میں جیسے بجلی سی بھر دی۔ میں فوراً ہی اٹھ بیٹھی' پھر میں نے دیوار کا سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کی۔ تکلیف اتنی شدید تھی کہ میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے اپنا نچلا ہونٹ کاٹ کر چیخ کو روکا۔ شدید درد کو برداشت کیا اور کسی نہ کسی طرح کھڑی ہو گئی۔ اس کوشش میں میرا پورا بدن لرز اٹھا۔ سانس بری طرح پھول گئی مگر میں ضبط کیے کھڑی رہی۔ جب میرا سر چکرانے لگا تب میں بڑی مشکل سے لیٹی۔ میں نے تیل ملنے میں بھی بالکل دیر نہیں کی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں رات بھر میں دو تین مرتبہ تیل کی مالش کروں گی خواہ مجھے اس کے لیے تمام رات جاگنا پڑے۔

اس رات میں واقعی جاگتی رہی۔ میں نے تیل دو تین مرتبہ ملا۔ تکلیف میں حیرت

انگیز حد تک کمی بھی محسوس کی۔ ملک کاما پھر نہیں آیا تھا۔ رات اس نے میرے لیے دوا اور کھانا بھیج دیا تھا۔ کھانا تو مجھ سے کھایا نہیں گیا۔ دوا میں نے فوراً کھالی تھی۔ صبح کی سپیدی پھیلتے ہی میں کچھ دیر کے لیے سو گئی۔ مجھے شدت سے احساس تھا کہ وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے۔ دن چڑھے میری آنکھ کھلی۔ شاید دروازے پر ہونے والی آہٹ نے مجھے جگا دیا تھا۔ کوئی دروازہ کھول رہا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنے والا ملک کاما اور شادا تھا۔ میں اسے اس وقت دیکھ کر گھبرا گئی۔ وہ اب سے پہلے کبھی یوں سویرے سویرے نہیں آیا تھا۔ وہ اندر آکر کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر لکڑی کی ایک پیٹی جس میں برتن رکھے تھے' خالی کر کے اور پاؤں کی ٹھوکر سے اسے الٹا کر اس پر بیٹھ گیا۔

"نام کیا ہے تیرا؟" اس نے گھمبیر آواز میں پوچھا۔

"اتنی جلدی تمہیں نام پوچھنے کا خیال کیسے آگیا؟" میں اب کافی نڈر ہو گئی تھی۔ بلا جھجک بول پڑتی تھی۔ یہ اعتماد بھی شاید اس کے رویے نے ہی بخشا تھا۔ ایک لڑکی ہونے کے ناتے جو خوف مجھے شروع میں ان لوگوں سے ہوا تھا' وہ ان لوگوں کے شریفانہ رویے سے ختم ہو چکا تھا۔ یہ سچ ہے کہ ملک کاما نے میرا بڑا خیال رکھا تھا۔ کسی کو بھی بے وجہ میرے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ شادا صرف اس وقت آیا کرتا تھا جب اسے کھانا پانی دینا ہوتا تھا یا ڈاکٹر کے ساتھ آتا تھا۔ خود کاما کبھی کبھی ہی آتا تھا۔ ان تینوں کے علاوہ آج تک میرے کمرے میں کسی اور کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ حتیٰ کہ دروازے پر پہرہ دینے والے بھی کبھی کمرے میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ شادا شاید کاما کا قابلِ اعتماد آدمی تھا جو یوں بے دھڑک آجاتا تھا۔ شروع شروع میں تو مجھے اس سے بھی خوف آتا تھا۔ مجھے ان لوگوں سے ڈر تھا تو صرف اتنا کہ یہ لوگ مرد ہیں اور میں تنہا عورت مگر کبھی کسی نے میری طرف بری نگاہ نہیں ڈالی تھی۔

"اے..... زیادہ بات مت کر' ایک تو تُو بولتی بہت ہے۔ جو سوال ملک نے کیا ہے بس اس کا جواب دے۔" شادے نے غرا کر کہا۔

"تُو بیچ میں نہ بول۔" میں نے پلٹ کر اسی کے سے انداز میں اسے ڈانٹ دیا۔ شادا سٹپٹا گیا اور ملک کاما کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تیر گئی' مگر شاید وہ اپنی مسکراہٹ کو مجھ سے چھپانا چاہتا تھا اسی لیے اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا اور دور پڑی پلیٹوں کو اٹھا کر

ایک طرف رکھنے لگا۔ لیکن میں وہ مسکراہٹ دیکھ چکی تھی۔ "ہاں تو' تجھے میرے نام سے کیا کام پڑ گیا؟ تجھے تو اپنے پیسے سے مطلب ہونا چاہیے' پانچ لاکھ روپے مل رہے ہوں تو نام کی کیا حیثیت ہے؟" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"پھر بولی تُو.....!" شادا پھر بھڑک اٹھا۔ شاید اسے خوف تھا کہ ملک کاما غصے میں آ کر جانے کیا کر بیٹھے۔

"ملک کاما! اسے بولو چلا جائے یہاں سے۔ ویسے بھی مجھے تم سے بات کرنا ہے اور میں وہ بات کسی کے سامنے نہیں کرنا چاہتی۔" میں نے شادے کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

میری بات سن کر شادا بھنا گیا۔ اس نے نتھنے پھلا کر کچھ کہنا چاہا' اسی وقت ملک کاما نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیا۔ وہ بل کھا کر رہ گیا۔ "جا..... یہ اسٹوو اٹھا کر لے جا اور اچھی سی چائے بنالا۔ میں بھی تو سنوں کہ اسے کیا بات کرنا ہے۔"

شادا مجھے غصے سے گھورتا ہوا کونے میں رکھا اسٹوو اٹھا کر باہر نکل گیا۔

"ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے؟"

"تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"

میرا سوال سن کر اس کے جبڑے بھینچ گئے۔ "یہ میرا ذاتی معاملہ ہے' اس میں بات کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔"

"یہ تمہارا ذاتی معاملہ نہیں' میری موت اور زندگی کا سوال ہے۔" میں نے بپھرتے ہوئے جواب دیا۔

"جائیداد کا معاملہ موت اور زندگی کا نہیں ہوتا۔" اس نے چند لمحے مجھے گھورنے کے بعد کہا۔

"جائیداد کا معاملہ؟ کیسی جائیداد؟" میں حیران ہو گئی۔

"اگر تم اپنی جائیداد چوہدری کے نام کر دیتیں تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ ویسے تم اکیلی لڑکی ہو اور اس لحاظ سے کافی بہادر ہو کہ چوہدری نیاز جیسے آدمی سے پنگا لے لیا۔ اب تمہیں اپنی زندگی کی اہمیت کا احساس ہو رہا ہے۔ اس وقت تمہیں دولت کا گھمنڈ تھا۔" وہ کہہ رہا تھا اور میں حیرت سے سن رہی تھی۔ اس نے بات ختم کی تو یوں لگا جیسے مجھ میں کرنٹ دوڑ گیا ہو۔

"میرے پاس کوئی جائیداد نہیں۔ اس نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔" میں جوش میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "یہ جھوٹ ہے۔ قسم اللہ پاک کی یہ جھوٹ ہے۔" میں بے اختیار چیخ پڑی۔ "وہ مجھے مارنا چاہتا ہے' اس لیے کہ میں اس کے خلاف گواہی دے سکتی ہوں۔ اسے پھانسی چڑھا سکتی ہوں۔ اس نے مجھے تباہ کر دیا ہے۔ میرے بابا کو۔ میری ماں کو مار دیا ہے۔ اس نے مجھے دربدر کر دیا ہے۔ وہ..... وہ تمہیں بھی بے وقوف بنا رہا ہے۔ جھوٹ بول رہا ہے تم سے۔ وہ تمہیں ایک دھیلا..... ایک ٹکا بھی دینے والا نہیں ہے۔" میں پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی اور وہ چبھتی ہوئی نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ آخر میں بلک بلک کر رو دی۔ اس کے چہرے کی بے یقینی مجھے مارے دے رہی تھی۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بچہ اس کے سامنے اداکاری کر رہا ہو۔ وہ میرے چیخنے اور رونے سے ذرا بھی متاثر معلوم نہیں دے رہا تھا۔ "ٹھیک ہے۔" آخر میں نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے پھر تم میرے گاؤں جاؤ۔ میرے محلے میں جاؤ اور خالہ فاطمہ سے پوچھو..... پوچھو کہ میں کون ہوں۔ میرے پاس کون سی جائیداد ہے۔ چوہدری نیاز کیوں میری جان کا بیری ہو رہا ہے۔ جاؤ..... میرے گاؤں والوں کو یقین دلاؤ کہ انھیں کچھ نہیں ہو گا پھر دیکھو کہ وہ چوہدری نیاز کے مظالم کی کتنی داستانیں سناتے ہیں..... جاؤ..... پوچھو میرے مامے سے جو اپنی بہن اور اس کے خاوند کی موت پر رو رو کر آدھا ہو گیا ہے۔ پوچھو کادے اور اس کے بابا سے کہ وہ کیوں اپنے گھر کو ویران کر کے گاؤں گاؤں پھر رہے ہیں۔ ابھی جاؤ اور تھانے میں جا کر دیکھو کہ ماجا اور دینو اور..... اور جانو وہاں کیوں بند ہیں' ان کی کیا حالت ہے اور یہ حالت کس نے بنائی۔ جا کر پوچھو ..... پھر..... پھر میں کچھ نہیں کہوں گی۔ کچھ نہیں کہوں گی۔" میں باوجود برداشت کرنے کے پھر سسک اٹھی۔

اب اس کے چہرے پر سوچ کی لکیریں گہری ہو گئیں۔

"کیا کہا ہے اس نے تم سے..... بتاؤ کیا کہا ہے؟" میں نے اپنے دوپٹے کے پلو سے ناک صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

میری بات سن کر اس نے چند لمحے مجھے دیکھا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ میری بات کا جواب دے یا نہیں پھر اس نے گہرا سانس لیا اور بولا۔ "تم اس کے باپ کی رکھیل کی اولاد

ہو؟"

"اوہ....." میں نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔ میری نگاہوں میں اپنی معصوم اور دکھیاری ماں کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ منظر یاد آ گیا جب وہ بڑے زمیندار کی موت پر سینہ کوٹ کوٹ کر روئی تھی اور وہ اور بابا کہہ رہے تھے۔ "ہم یتیم ہو گئے..... یتیم ہو گئے ہم۔"

"چلو..... مجھے لے کر چلو اس حرامزادے کے پاس۔ میں تمہارے سامنے اس سے پوچھوں گی۔ سارے گاؤں والوں کو اکٹھا کر کے پوچھوں گی کہ بتا میں کون ہوں؟ میری ماں تو اس کے فرشتہ جیسے باپ کو اپنا باپ سمجھتی تھی۔ پورا گاؤں اسے باپ کی طرح چاہتا اور عزت دیتا تھا۔ اس کتے کے بچے نے اپنے باپ کے منہ پر بھی کالک مل دی' یہ نہ سوچا کہ اس طرح الزام اس کے باپ پر بھی آتا ہے۔ چلو..... لے کے چلو مجھے مگر تم میرے ساتھ رہنا۔ میں وہاں بھرے گاؤں کے بیچ لوگوں کو بتاؤں گی کہ وہ اپنے باپ کا قاتل ہے۔ اس کی بیوی اس کی ماں کی قاتلہ ہے۔ میں..... میں گواہی دوں گی کہ اس نے بڑی زمیندارنی کو میرے سامنے دم گھونٹ کر مارا ہے۔ بہت بڑے بزنس مین بنتے ہو تم اور یہ نہیں جانتے کہ سامنے والا سچ بول رہا ہے یا جھوٹ..... چلو..... دو دن بعد نہیں ابھی..... اور اسی وقت....." میں جذبات میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ کولھے کی ہڈی کڑکڑا کر رہ گئی۔ تکلیف کے مارے سسکاری نکل گئی مگر میں نے پروا نہ کی اور کھڑی ہو گئی۔

اس نے مجھے حیرت سے دیکھا' پھر میری ٹانگوں کو دیکھنے لگا' تبھی مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اب تک تو میں نے اس پر یوں ظاہر کیا تھا جیسے میں لیٹے لیٹے بھی اپنی ٹانگیں ہلانے کے قابل نہیں ہوں اور اب میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ تیل کی مالش نے جادو کی طرح اثر کیا تھا۔ تکلیف رات کی نسبت بہت ہی کم تھی۔ میں نے چاہا کہ چیخ کر بیٹھ جاؤں تاکہ اسے مجھ پر شک نہ ہو مگر اب وقت گزر چکا تھا اس لیے میں بیٹھی تو نہیں البتہ کھڑے کھڑے ہی میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں جوش اور جذبات میں اپنی تکلیف بھول گئی تھی اور زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکتی' حالانکہ میں محسوس کر رہی تھی کہ اب میں کھڑی رہ سکتی ہوں بلکہ تھوڑی ہی کوشش سے قدم بھی اٹھا سکتی ہوں مگر میں نے

مزید کوئی حماقت کیے بغیر دیوار سے ٹیک لگالی اور پھر دیوار سے گھسٹتی ہوئی بیٹھ گئی۔ وہ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ کچھ تو مجھے تکلیف تھی اور کچھ میں نے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار پیدا کر لیے اور چکرا کر گدیلے پر گر پڑی۔ اس نے اسی لمحے شادے کو آواز دی۔ اس کے اندر آتے ہی اس نے ڈاکٹر کو بلانے کے لیے کہا۔ چند ہی لمحوں میں وہ ڈاکٹر کو لے آیا۔ ڈاکٹر کے آنے کے بعد وہ شادے کو لے کر باہر چلا گیا۔ میں نے ڈاکٹر کو بتایا کہ مجھے کچھ نہیں ہوا' پھر جو کچھ میں حماقت کر چکی تھی' میں نے اسے بتا دی۔

"تو اسے بتا کیوں نہیں دیتی کہ تُو کون ہے اور چوہدری تجھے مروانا چاہتا ہے۔" اس نے میرے گھٹنے پر دوا لگاتے ہوئے سر جھکائے جھکائے کہا۔

"وہ سننے کو تیار کب ہوتا ہے' پھر بھی میں نے اس کو کافی کچھ بتا دیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میرے جانے کے بعد تُو اسے شروع سے آخر تک سب کچھ بتا دے۔ میرا خیال ہے کہ وہ دل کا برا نہیں ہے۔ نہ معلوم کیوں وہ یہ سب کچھ کرنے لگا ہے' اور سن آج سویرے سویرے ہی اس نے چوہدری کے پاس آدمی بھیج دیا ہے' اگر وہ ساتھ آ گیا تو سمجھ کہ آج کا دن آخری ہے' اگلی صبح وہ یہاں پہنچ جائے گا۔ جو کچھ کرنا ہے ابھی' آج ہی کر لے۔ میں ہر طرح کوشش کر چکا ہوں مگر لگتا نہیں کہ میں کچھ کر پاؤں گا۔"

وہ دھیرے دھیرے بول رہا تھا اور میری نگاہیں دروازے پر تھیں۔ وہ دونوں یہاں سے صاف نظر آ رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ملک کاما میرے ہی بارے میں بات کر رہا ہے اس لیے کہ اس دوران میں کئی بار شادے نے پلٹ کر مجھے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

دیہاتی ڈاکٹر کو میں نے بتا دیا کہ تیل سے کافی فائدہ ہے اور اب میں آرام سے کھڑی ہو سکتی ہوں جس پر اس نے مالش جاری رکھنے کو کہا اور پھر اپنا ڈبا اٹھا کر واپس چلا گیا۔ شادا ڈاکٹر کے ساتھ چلا گیا اور ملک کاما آہستہ قدم اٹھاتا ہوا پھر اندر آ گیا۔

"نام کیا ہے تیرا؟" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وہی سوال کیا۔

"زینو..... زینت نام رکھا تھا اماں نے ابا نے..... وہ دونوں مجھے زینو کہتے تھے۔ کبھی کبھی اماں اور بابا لاڈ میں آ کر مجھے زینت بھی پکارا کرتے تھے مگر اب تو زمانے ہو

گئے میں نے یہ نام نہیں سنا۔ اب تو زینو زندگی کی بدصورتی کا نام بن کر رہ گیا ہے۔" میں نے چھت کو تکتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا ہوا تھا تمھارے ساتھ' مجھے شروع سے بتاؤ۔" اس نے لکڑی کی پیٹی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

تب میں نے شروع سے لے کر آخر تک کی تمام داستان سنا دی۔ وہ اس دوران میں ایک لکڑی سے زمین پر آڑھی ترچھی لکیریں بناتا رہا۔ کبھی کبھی وہ نگاہ اٹھا کر مجھے دیکھتا پھر نگاہ جھکا لیتا تھا۔ اس کا چہرہ اس دوران میں بالکل سپاٹ رہا تھا جس کی وجہ سے میں قطعی اندازہ نہ کر سکی کہ وہ میری داستان پر یقین کر بھی رہا ہے یا نہیں؟ میں نے اپنی زندگی کا بیتا ہوا لمحہ لمحہ اسے بتا دیا' صرف ایک بات چھپا گئی کہ میں ایک قتل بھی کر چکی ہوں۔ میں نے اس بارے میں اب تک اتنے جھوٹ بولے تھے کہ اب تو خود مجھے بھی یہی لگتا تھا جیسے اس چوہدری کو میں نے قتل نہیں کیا بلکہ شاید کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا اور بس۔

میری داستان گھنٹوں میں ختم ہوئی۔ درمیان میں شادا ہمیں چائے کے پیالے بھی دے گیا تھا۔ میری چائے تو یونہی پڑی پڑی ٹھنڈی ہو گئی تھی' البتہ ملک کاما اپنی چائے پی چکا تھا۔ ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی کہ جب میں کادے کا ذکر کر رہی تھی تو اس کے چہرے پر سیاہ سائے سے لہرا گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں روشنیاں سی جل جل کر بجھ رہی تھیں۔ وہ خلاؤں میں بے چینی سے کچھ ڈھونڈنے لگتا تھا۔ میں نے بات اس وقت ختم کی جب شادے نے آ کر کھانے کے بارے ملک کاما سے پوچھا۔

"یہیں لے آؤ۔" اس نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔ شادا مجھے گھورتا ہوا واپس چلا گیا۔ پتا نہیں اسے کیوں مجھ سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے ناپسندیدگی تھی جسے وہ چھپانے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ روٹی کی چھابی اور بھاجی کی پلیٹیں بھی تھیں۔ سرسوں کا ساگ' باجرے کی روٹی' آلو مٹر کی سبزی اور مکھن روغنی روٹی دیکھ کر میرے پیٹ میں بھوک سے گولے سے اٹھنے لگے۔ ملک کاما نے کھانا میرے سامنے رکھوا دیا اور خود ایک پلیٹ میں بھاجی وغیرہ لے کر پھر پیٹی پر جا بیٹھا۔ شادا ایک طرف کھڑا مجھے خونخوار نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

"تم بھی روٹی کھالو۔" میں نے اسے یوں اچکوں کی طرح کھڑا دیکھ کر کہا۔

وہ غصے سے ہنکارا بھر کر باہر چلا گیا۔ ملک کاما نے سر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ چپ چاپ روٹی کھاتا رہا۔ میں دل کا بوجھ ہلکا کر چکی تو پیٹ بھرنے میں لگ گئی۔ اب مجھے حالات اپنے قابو میں آتے محسوس ہو رہے تھے' گو ملک کاما کے انداز سے نہیں لگتا تھا کہ وہ میری داستان سن کر متاثر ہوا' نہ ہی یہ اندازہ ہوا کہ وہ میری کہانی کو جھوٹ کا پلندہ سمجھ رہا ہے پھر بھی ایک عجیب سا اطمینان تھا جس نے میرے اندر اٹھتے طوفانوں کو ختم کر دیا تھا۔ میں روٹی کھانے کے دوران میں دیکھتی رہی اور منتظر رہی کہ وہ کوئی تبصرہ کرے مگر کمرے میں گہرے سناٹے چکراتے رہے۔ آہستہ آہستہ میرا صبر جواب دیتا رہا۔ میں اس کے ہلتے ہوئے جبڑے یا جھکی ہوئی آنکھیں دیکھتی رہی۔ اس نے کھانا ختم کر کے پانی کا گلاس بھرا اور ایک ہی گھونٹ میں پی لیا۔ پانی کا گلاس رکھ کر اس نے اپنے گیلے ہونٹوں کو آستین سے صاف کیا۔

"فیاض مر گیا یا زندہ ہے؟" اچانک اس کی بھاری آواز نے سناٹا توڑ دیا۔

"کون فیاض!" میں گڑ بڑا گئی۔

"چوہدری فیاض!"

"پتا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ شدید زخمی ہے' ممکن ہے اب تک مر چکا ہو۔ وہ کراچی میں رہتا ہے' تم چاہو تو اس کے گھر سے معلوم کر سکتے ہو۔"

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اور سنو! میں نے تمھاری داستان سن لی ہے مگر اس پر اعتبار نہیں کیا۔" اس نے یوں مجھے اطلاع دی جیسے کوئی خوشخبری سنا رہا ہو۔ اس کی بات سن کر میں دھک سے رہ گئی۔ سارا اطمینان دھواں بن کر اڑ گیا۔

"تم..... تم چاہو تو اس کی تصدیق کر سکتے ہو۔" میں چلّا اٹھی۔ "میں جھوٹ نہیں بولتی۔ چوہدری نے تمہیں غلط بتایا ہے' اس نے میرے مامے کو بھی غلط بتایا تھا۔" کہتے کہتے میری آواز رندھ گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں تو سمجھی تھی کہ اب وہ مجھے یوں آسانی سے چوہدری نیاز کے حوالے نہیں کرے گا۔ میرے بارے میں پتا کرے گا' چوہدری نیاز سے پوچھے گا۔ چوہدری نیاز کے جھوٹ پر طیش میں آ کر مجھے آزاد کر دے گا مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ میری باتوں پر یقین نہ کرنے کی اطلاع دے کر گویا اس نے میری

نجات کے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ میں ہونقوں کی طرح اسے دیکھتی رہ گئی اور وہ بھاری قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی دروازہ بھی باہر سے بند کر دیا گیا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اب جو کچھ بھی تھا مجھے ہی کرنا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے دیوار سے کمر ٹکا دی اور یہاں سے نکلنے کے امکانات پر سوچنے لگی۔ اب میری آخری آس وہ دیہاتی اور بوڑھا ڈاکٹر تھا جو دیکھنے میں ڈاکٹر کم اور کسان زیادہ لگتا تھا۔ میں نے اب تک ان لوگوں میں سے ملک کاما کے علاوہ شادے اور ان دو آدمیوں کو دیکھا تھا جو میرے دروازے کے باہر پہرہ دیتے تھے۔ مجھے وہ بھی خاصے خونخوار لگے تھے۔ ان کا رویہ تماش بینوں جیسا تھا۔ انھوں نے اب تک اپنے رویے سے ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ میری قید پر خوش ہیں یا آزردہ' آزردہ ہونے کا تو شاید کوئی جواز نہ تھا۔ میری قیمت چوہدری نیاز نے پانچ لاکھ لگائی تھی۔ انھیں یقین بھی تھا کہ وہ پیسے دے دے گا۔ اس طرح انھیں میری وجہ سے کافی موٹی رقم ملنے والی تھی تو بھلا میری قید سے خوش کیوں نہ ہوتے' اگر ان کے رویے سے ذرا سی بھی ہمدردی کا احساس ہوتا تو میں یہاں سے نکلنے کے لیے ان سے مدد لینے کی کوشش کرتی مگر اب تو لگتا تھا کہ جیسے قدرت میرے گرد گھیرا تنگ کرتی جا رہی ہے۔ پہلے چوہدری سے بھاگنے کے لیے میرے پاس کھلے رستے تھے مگر اب میں اس ایک کوٹھڑی میں بند اپنی موت کی منتظر تھی۔ ملک کاما مجھے صاف جواب دے چکا تھا اور شادے کے انداز سے میں نے بے پناہ نفرت محسوس کی تھی جس کی وجہ میں اب تک نہیں سمجھ سکی تھی۔ شادے سے میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی پھر بھی وہ مجھے بڑی کینہ توز نظروں سے دیکھتا تھا۔ دیہاتی ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا کہ ملک کاما اپنا آدمی چوہدری نیاز کے پاس بھیج چکا ہے او۔ انھیں زیادہ سے زیادہ سویرے تک یہاں پہنچ جانا چاہیے۔ شام ہو رہی تھی۔ تمام دن اسی آس میں گزر گیا تھا کہ شاید ملک کاما کے خوب صورت چہرے کے پیچھے حساس دماغ ہو گا' وہ ایک کمزور عورت کو یوں موت کے حوالے کرنے سے باز آ جائے گا مگر اب وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا آج ہی کی رات کرنا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اب نہ روؤں گی' نہ کسی سے زندگی کی بھیک مانگوں گی اور نہ کسی کی آس پر وقت ضائع کروں گی بلکہ میں خود ہی کچھ کروں گی۔ یا تو میں یہاں سے فرار ہو جاؤں گی یا اپنے ہی ہاتھوں اپنی جان دے دوں گی مگر خود کو کسی بھی قیمت پر چوہدری نیاز

کے حوالے نہیں کروں گی۔ یہ فیصلہ کرتے ہی میں کھڑی ہو گئی۔ اس بار مجھے زیادہ تکلیف نہیں ہوئی۔ میں نے قدم بڑھایا تو درد کی ایک ہلکی سی ٹیس بدن میں تیر گئی مگر وہ اب ایسی بھی نہ تھی کہ میں برداشت نہ کر پاتی۔ میں نے آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ میں رات ہونے سے پہلے پہلے خود کو چاق و چوبند کرنا چاہتی تھی۔ اتنے روز پڑے پڑے میرے بدن میں سستی آ گئی تھی۔ رفتہ رفتہ میں نے اپنی رفتار تیز کر لی اور پھر یہ دیکھ کر میں خوش ہو گئی کہ اب میں آسانی سے چل سکتی تھی۔ اٹھتے اور بیٹھتے ہوئے بھی اتنی تکلیف نہ تھی کہ زیادہ دشواری ہوتی۔ گویا اب میں یہاں سے فرار ہونے کے قابل ہو گئی تھی۔ اب مجھے صرف اتنا سوچنا تھا کہ میں یہاں سے کب اور کیسے نکلوں گی۔ اسی کمرے کے ایک کونے میں غسل خانہ تھا اس لیے یہ بہانہ بھی نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ وہاں ایک ٹین کے ڈبے میں پانی بھی تھا۔ ایک چھوٹا مٹکا تھا جس پر ایلومنیم کا گلاس رکھا تھا۔ میں نے پورے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ سب کچھ سوچا مگر کوئی بات ایسی نہ تھی جس کی آڑ لے کر میں باہر نکل سکتی۔ پھر بھی مجھے خدا پر بھروسا تھا۔ آج سردی زیادہ تھی اسی لئے میں نے غسل خانے کی سلاخ پر لٹکی چادر بھی اتار کر لپیٹ لی تھی۔ کمرے میں اتنی سردی نہ تھی کیونکہ یہاں دروازے کے سوا کوئی کھڑکی یا روزن نہ تھا کہ جہاں سے سرد ہوا اندر آتی مگر چادر تو میں نے اس لیے لپیٹ لی تھی کہ اگر میں یہاں سے نکل گئی تو باہر کی سردی ناقابلِ برداشت ہو جائے گی۔ اب تھوڑی ہی دیر میں ان دو میں سے ایک یا شادا' چائے لے کر آنے والا تھا۔ ملک کاما نے اس معاملے میں میرا خیال رکھا تھا' شروع شروع میں وہ مجھے دودھ میں ہلدی ملا کر بھی بھیجتا رہتا تھا' جس نے میرے زخموں کو ٹھیک ہونے میں بڑی مدد دی تھی۔ وہ مغرب سے پہلے ہی مجھے چائے کا گرم گرم پیالہ بھیج دیا کرتا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ میری ملاقات اس ڈاکٹر سے بھی ہو جائے تاکہ میں اسے بتا سکوں کہ میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ شاید وہ میری مدد کر سکے' کسی ایسے ٹھکانے کے بارے میں بتا سکے جہاں میں یہاں سے نکلنے کے بعد چھپ سکوں۔ اس سے ملاقات کی ایک ہی ترکیب تھی کہ میں چائے لے کر آنے والے کو اپنی کوئی تکلیف بتاؤں۔ میری کہنی کا زخم ابھی بھرا نہیں تھا۔ اس پر بندھی پٹی خون اور پیپ کی وجہ سے زخم پر چپک کر رہ گئی تھی جسے کل بھی اس نے قینچی سے کاٹ کر اتارا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے جلدی جلدی کہنی کی

پٹی کھولنا شروع کر دی۔ پھر میں نے زخم پر چپکے ہوئے حصے کو کھینچ کر اتار دیا۔ توقع کے مطابق شدید تکلیف کے بعد اس میں سے خون رسنے لگا۔ میں نے پٹی دوبارہ اس پر لپیٹ دی۔ خون جلد ہی پٹی پر دھبا بن کر پھیل گیا۔ مجھے شدید تکلیف تھی مگر میں یہ تکلیف بڑے آرام سے برداشت کر گئی۔ مجھے ایسا کرنا ہی تھا پھر میں آنے والے کا انتظار کرنے لگی۔ دروازے کی جھریوں میں سے شام کا سرمئی پن جھانک رہا تھا۔

میری توقع کے عین مطابق کچھ ہی دیر بعد دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ میں کہنی سامنے کی طرف کر کے بیٹھ گئی اور چہرے پر شدید تکلیف کے آثار پیدا کر لیے۔ آنے والا شادا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاہے کا پیالہ تھا اور چہرے پر ناگواری کا تاثر۔ اس نے چائے میرے سامنے رکھتے ہوئے اکھڑ سے انداز میں کہا۔ "چائے پی لے۔ اور سن ملک سے زیادہ بے تکلف ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور جو تُو نے یہ لمبی چوڑی اشٹوری سنائی ہے ناں۔ تو یہ کھیال اپنے دل سے نکال دے کہ وہ تجھے آزاد کر دے گا۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ جب تک ملک بالا اجازت نہیں دے گا' کچھ نہیں ہو سکتا۔ تجھے یہاں لانے والا ملک بالا کا آدمی تھا۔ ہم تو وہی کرتے ہیں جو ملک بالا کہتا ہے اور تُو بالے کا مال ہے۔ اسے نہ کوئی ہڑپ کر سکتا ہے اور نہ اِدھر اُدھر کر سکتا ہے۔ وہ رات کو آئے گا پھر فیصلہ ہو گا' سمجھی تُو.....! اگر تُو نے ملک کاما کو بہکانے کی کوشش کی' اس پر اپنی جوانی کا جادو چلانے کا سوچا تو فیر سوچ لینا....."

یہ سب سن کر میرا دماغ گھوم گیا تھا کہ وہ مجھ سے کیسی گھٹیا حرکت کی توقع کر رہا ہے مگر میں نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ "یہ ملک بالا کون ہے؟" میں نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ "ملک کاما تو....."

"ملک بالا وڈا بھاہے کاما کا۔ ابھی ملک کاما ایسے دھندوں میں کچاہے ناں اس لیے اس نے مجھے اس کی نگرانی کرنے پر رکھا ہے۔ سویرے چوہدری نیاز آئے گا' پھر ہماری تجھ سے جان چھوٹے گی۔ تیری وجہ سے یہاں ایسی حالت میں پڑے ہیں ورنہ بھوئے آصل میں آرام سے عیش کر رہے ہوتے۔" وہ باتونی تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس کی چند باتوں ہی سے ہو گیا۔ میں نے صرف ایک سوال کیا تھا اور وہ کافی کچھ بتا گیا۔

"تو تم تو ان لوگوں کے سردار ہوئے نا!" میں نے مرعوب ہونے والے انداز میں

کہا۔

اس کا سینہ چوڑا ہو گیا۔ اس نے فوراً اپنی گردن اکڑا لی۔ نتھنے پھلا لیے' ایک بھنوں اچکالی اور کندھے پر پڑی چادر کا پلو ایسے انداز میں دوبارہ اتار کر کندھے پر پھینکا جیسے وہ واقعی بہت بڑا سردار ہو۔ اس کی کمزوری میرے ہاتھ آ گئی تھی۔ میں نے چائے کا پیالہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں تو پہلے روز ہی سمجھ گئی تھی کہ تم ان کے سردار ہو گے۔ میرا بابا بتاتا تھا کہ سردار بڑا بانکا ہوتا ہے' لمبی لمبی مونچھیں' بڑی بڑی سیاہ چمک دار آنکھیں' چہرے پر رعب اور چال میں ایک عجیب طرح کی بات ہوتی ہے۔ جب میں نے تمہیں دیکھا تھا تب میں یہی سوچ رہی تھی کہ تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟ اصل سردار تو تم لگتے ہو۔"

وہ کچھ اور اکڑ گیا اور بالکل ملک کاما کے سے انداز میں اس نے لکڑی کی پیٹی پاؤں کی ٹھوکر سے الٹی اور اس پر پاؤں رکھ کر' اس پاؤں کے گھٹنے پر کہنی ٹکا کر وہ کچھ جھک گیا۔

"اصل میں ملک کاما کو سکھانا بھی تو ہے۔ اب ہمارا دھندا ہی یہی ہے۔ جو لوگ خود کو شریف کہلواتے ہیں' دشمنیاں تو ان کی بھی ہوتی ہیں ناں! بدلہ تو انھیں بھی لینا ہوتا ہے' خود تو بزدل ہوتے ہیں' ان کے کام دھندے ہم لوگ نمٹاتے ہیں۔ چوہدری نیاز سے پہلے کاما نے خود کچھ نہیں کیا۔ کتل وتل تو وہ ابھی کر ہی نہیں سکتا' اس لیے مال اِدھر اُدھر کرنے یا نیلام کرنے کا کام ہی اس سے لیا جا سکتا ہے' میں نے اس پر اس لیے چھوڑا ہوا ہے کہ وہ پکا ہو جائے۔" وہ اکڑی ہوئی گردن اور اکڑی ہوئی آواز میں بولتا رہا اور میں چائے پیتی رہی۔

"تو ملک بالا کہاں ہے؟ کیا وہ تمھارا بھی سردار ہے؟"

"ہاں..... وہ ہمارا بھی سردار ہے' بات ہے جی ساری پیسے کی۔ آج میرے پاس سرکاری نوکری ہو' زمینیں ہوں' ڈھور ڈنگر ہوں' پیسا ہو تو میں بھی سردار بن جاؤں گا۔"

"سرکاری نوکری؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "ہاں جی....." شادے نے کہا۔ ملک بالا اس علاقے کا بے تاج بادشاہ ہے۔ ساری پولیس..... سارے سرکاری محکمے اس کے نیچے کام کرتے ہیں۔" پھر اس نے آنکھ مار کر کہا۔ "یہ تو سامنے کے دھندے ہیں۔ اصل تو کام ہم کرتے ہیں۔ اب چوہدری نیاز' پانچ لاکھ دے گا۔ ایک لاکھ ہم چاروں کو ملنا

ہے اور باقی غائب۔" وہ شاید بھول گیا تھا کہ میں کون ہوں اور اسے مجھ سے کیا باتیں کرنا چاہیے۔ وہ یوں باتیں کر رہا تھا جیسے اس کے سامنے اس کے بچپن کا کوئی یار بیلی بیٹھا ہو۔

"اگر تم چاہو تو چوہدری نیاز تمہیں دس لاکھ بھی دے سکتا ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"دس لاکھ.....؟" اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"ہاں..... اس کی دشمنی صرف مجھ سے نہیں..... تین آدمی اور بھی ہیں..... میں ان تینوں کا پتا بتا سکتی ہوں۔" میں نے گردن ہلا کر جواب دیا۔

"اوہ..... مگر وہ بالا....." وہ پگھل رہا تھا۔

"بالے کو مارو گولی۔ یہ پانچ لاکھ بھی تو تم اکیلے لے سکتے ہو۔" میں نے لوہا گرم دیکھ کر کہا لیکن اس سے قبل کہ میں کوئی بات کرتی ملک کاما کی آواز سنائی دی وہ شاید اسی طرف آ رہا تھا۔ شادے نے برا سا منہ بنایا۔ میرے ہاتھ سے چائے کا خالی پیالہ لیا اور دروازے کی طرف پلٹ گیا۔

"دیکھو..... میرے خون نکل رہا ہے۔" میں نے اسے جاتا دیکھ کر جلدی سے کہا۔ "اس ڈاکٹر کو بلا دو۔ مجھے بہت درد ہو رہی ہے۔"

"اچھا اچھا۔" اس نے پھر اکڑے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ اب ملک کاما دروازے تک آ گیا تھا۔ اس کی نگاہ میری کہنی پر پڑی جہاں پٹی پر خون پھیلتا ہی جا رہا تھا۔

"یہ کیا ہو گیا؟"

میں نے اسے بتایا کہ زخم تکلیف دے رہا ہے۔ اس دوران میں شادا وہیں کھڑا رہا حالانکہ اسے فوراً چلے جانا چاہیے تھا مگر شاید وہ مجھ سے خوفزدہ تھا کہ کہیں میں کامے کو اس کی کہی ہوئی باتیں نہ بتا دوں۔ میری بات سن کر کامے نے اسے ڈاکٹر کو لانے کو کہا۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں التجا کرتا ہوا چلا گیا' وہ پلٹ پلٹ کر مجھے دیکھتا جا رہا تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے کافی معلومات حاصل ہوئی تھیں' ان میں سے ایک انتہائی اہم تھی کہ ملک کاما اس دھندے میں ابھی کچا ہے۔ پہلے میں نے سوچا کہ اسے پھر چرکے لگاؤں' شاید اس کی غیرت جاگ اٹھے مگر اب میں شادے ہی سے کافی کام لے سکتی تھی' یہ سوچ کر میں نے ملک کاما سے بات نہیں کی۔ وہ کمرے کے اندر نہیں آیا بلکہ دروازے پر ہی کھڑا رہا۔ میری

طرف اس کی پشت تھی۔ میں نے باہر جھانکا۔ اب اندھیرا آہستہ آہستہ ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ گویا اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ مجھے لمحوں ہی میں فیصلہ کرنا تھا۔ میں جلد از جلد یہاں سے نکل کر سویرا ہونے سے پہلے ہی زیادہ سے زیادہ دور چلے جانا چاہتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ اس طرح میں چوہدری نیاز کے علاوہ ان چاروں کو بھی اپنے پیچھے لگا لوں گی۔ میری زندگی مزید عذاب ہو جائے گی مگر یوں خودکشی بھی نہیں کر سکتی تھی کہ خود کو چوہدری نیاز کے حوالے کرنے دیتی۔

ذرا دیر بعد ہی دیہاتی ڈاکٹر اپنا کالا ڈبا اٹھائے آ گیا۔ شادا اس کے ساتھ ہی تھا' اور وہ آتے ہی بڑے غور سے ملک کاما کو دیکھنے لگا' شاید وہ اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ اسے کہیں میں نے سب کچھ بتا تو نہیں دیا۔ میں نے دیہاتی ڈاکٹر کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر کسی نئی خبر کی نوید نہ تھی۔ کوئی ایسی بات نہ تھی جسے میں اپنے لیے خوشی کا پیغام سمجھتی۔ وہ میرے قریب بیٹھ گیا۔

"یہ کیسے ہو گیا؟" اس نے ڈبا کھولتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں جی! بس ایک دم ہی لہو بہنے لگا۔" میں نے جواب دیا۔ میں ملک کاما اور شادے کو دیکھ رہی تھی۔ ملک کاما شادے سے سرگوشیوں میں بات کر رہا تھا۔ اس دوران میں ایک بار اس نے میری طرف دیکھا۔ مجھے لگا جیسے وہ میرے ہی بارے میں کچھ کہہ رہا ہو۔ شادے کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی تھی جو اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ اسے میرے ہی بارے میں بتا رہا تھا۔ پھر اس نے جیب سے کچھ روپے نکال کر شادے کو دیے جسے لے کر وہ جھٹکے سے آگے بڑھ گیا۔ ملک کاما دروازے میں کھڑا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر سے بات کرنا خطرناک تھا اور میں دعا مانگ رہی تھی کہ یہ ذرا دیر کو یہاں سے چلا جائے۔ ڈاکٹر میری کہنی کی پٹی کھول چکا تھا۔ اب زخم پر دوا لگا رہا تھا اور ملک کاما دونوں ہاتھ اپنی واسکوٹ کی جیبوں میں ڈالے' ہماری جانب سے منہ پھیرے کھڑا تھا۔

کھلے ہوئے دروازے سے سامنے کا جو حصہ مجھے نظر آ رہا تھا' وہ چھوٹے سے میدان جیسا تھا۔ اس میدان میں کھونٹے گڑے تھے اور وہاں دو بھینسیں بھی بندھی ہوئی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ حصہ بھینسوں کا باڑا تھا۔ مجھے ابھی تک یہاں ان چاروں کے سوا کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ نہ کوئی عورت' نہ بچہ' نہ بوڑھا' کوئی بھی تو نہیں تھا حالانکہ

اگر یہ بھینسوں کا باڑا تھا تو یہاں باڑے کے لوگوں کو ہونا چاہیے تھا۔ دائیں طرف کچی دیوار سی نظر آ رہی تھی جس پر اپلے تھوپے گئے تھے اور اپلے گاؤں میں زیادہ تر عورتیں ہی تھوپتی تھیں۔ میں نے تو اب تک آواز بھی نہ سنی تھی۔ میں یہ سب کچھ دیکھتی اور سوچتی رہی' ملک کاما یونہی کھڑا باہر دیکھتا رہا اور ڈاکٹر میرے زخم کو دھو کر' اس پر مرہم لگا کر پٹی باندھنے لگا۔

"ہاں..... ہو گیا؟" ایک دم ملک نے پلٹ کر پوچھا۔ وہ ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہاں..... ہاں جی ہو گیا۔ اس کا زخم بگڑ گیا ہے جی۔ جو کیپسول میں نے لکھے تھے وہ لانا ضروری ہیں۔"

"ہاں' ہاں پتا ہے" اس نے بیزار لہجے میں جواب دیا۔ "اب وہ کیپسول اسے چوہدری نیاز ہی منگا کر دے گا۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ ہمیں کل سویرے ہی یہاں سے نکلنا ہے۔ چوہدری کے آتے ہی ہم اسے اس کے حوالے کر دیں گے اور نکل جائیں گے' اور ہاں..... تمہارے گھر سامان پہنچا دیا گیا ہے۔ کچھ روپے بھی بھیج دیے ہیں۔ فکر نہ کرنا' کل تمہاری بھی چھٹی ہو جائے گی۔"

میں یہ سب سن کر دم بخود رہ گئی۔ ڈاکٹر اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر گڑگڑانے لگا۔

"مالک آپ مجھے جانے دیں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس بارے میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ آپ نے مجھے کوئی تکلیف نہیں دی ہے پھر میں کیوں کچھ بتاؤں گا۔ اور..... اور یہ..... یہ لڑکی آپ کا مسئلہ ہے۔ بس جی مجھے جانے دیں۔ میرے بچے بہت پریشان ہوں گے۔ بچوں کی ماں رو رو کر اندھی ہو جائے گی جی۔"

"او کوئی نئیں اندھی ہوتی۔ وہ ٹھیک ٹھاک پھر رہی ہے۔ کل چکی سے آٹا پسوا کر لے گئی ہے۔ تیرے بچے تو خوش ہیں کہ تُو شہر کے اسپتال میں کام کر رہا ہے۔ ہم نے روپیا یہی کہہ کر دیا تھا کہ تمہارے باپ نے شہر سے بھیجا ہے۔"

ڈاکٹر حیرت سے سر اٹھائے اسے دیکھ رہا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ لوگ یہاں سے چلے جائیں تاکہ میں کچھ کر سکوں۔ اب دیہاتی ڈاکٹر سے کچھ کہنے سننے کا نہ وقت تھا اور نہ موقع۔ میں الجھن کا شکار ہو چکی تھی۔ میری دعا خدا نے سن لی۔ ملک کاما نے اسے چلنے کو

کہا اور ڈاکٹر اپنی آنکھیں پونچھتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ میں کچھ نہ بولی۔ چپ چاپ یوں گدیلے پر پڑ گئی جیسے شدید تکلیف میں ہوں۔ ان دونوں کے جاتے ہی میں اٹھ بیٹھی۔ اب ساری پریشانی مجھے یہ تھی کہ میں کمرے سے باہر کیسے نکلوں۔ میں جانتی تھی کہ ملک کامے نے جاتے ہی ان دونوں بندوں کو پھر دروازے پر بھیج دیا ہو گا۔ دروازے سے نکلنا میرے لیے بڑا عذاب تھا اور نکلنے کی دوسری کوئی جگہ نہ تھی۔ سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹنے لگا۔ دروازہ حسبِ معمول باہر سے بند تھا لیکن اب مجھے اتنا یقین ضرور تھا کہ وہ لوگ میری طرف سے مطمئن ہو چکے ہیں اس لیے تالا نہیں ڈالا ہو گا۔ کل بھی یہی ہوا تھا کہ میں نے صرف کنڈی لگنے کی آواز سنی تھی۔ رات کو دونوں پہریدار بندوں میں سے ایک میرے لیے کھانا لاتا تھا۔ میں اس کا انتظار کرنے لگی۔ وہی وقت ایسا تھا کہ میں دروازہ دوبارہ بند نہ ہونے دوں۔ آنے والا بندہ اندر ہی رہ جائے اور دروازہ کھلا رہے۔ میں سوچنے لگی کہ ایسا کس طرح ممکن ہے' پھر ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی اور میں اس کا انتظار کرنے لگی۔

مقررہ وقت پر دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں نے لیٹے لیٹے ہی دیکھا۔ وہ ہاتھ میں روٹی کی چھابی اور پلیٹ پکڑے اندر آ رہا تھا۔ میں کراہنے لگی۔ اندر آتے ہوئے وہ در کا پٹ کھلا چھوڑ آیا تھا۔ میں نے باہر دیکھا' ایک جانب روشنی نظر آ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے آگ جلا رکھی ہو۔ باتیں کرنے کی آواز بھی آ رہی تھی مگر یہاں سے مجھے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ "دیکھو تو میری ٹانگ میں کیا ہوا ہے۔" میں نے پنڈلی پر سے شلوار اونچی کر کے کہا۔

اس نے چھابی اور پلیٹ رکھ کر میری پنڈلی کی طرف دیکھا۔ میری گول اور چمک دار پنڈلی لالٹین کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر جھینپی جھینپی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ میرے قریب آ کر دیکھنے لگا۔

"تمھارا دوسرا ساتھی کہاں ہے اسے بھیج کر ڈاکٹر کو بلاؤ۔"

"وہ تو روٹی لینے گیا ہے۔ میں جاتا ہوں' پر تجھے ہوا کیا ہے؟" اس نے دونوں ہاتھوں کو ملتے ہوئے جواب دیا۔ وہ بہت نروس ہو رہا تھا۔

"کسی مکوڑے نے کاٹ لیا ہے شاید۔" میں نے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "دیکھو یہ..... ادھر دیکھو یہاں..... یہاں مرچیں سی لگ رہی ہیں۔" میں نے اس کی توجہ

پھر پنڈلی کی طرف دلائی۔ وہ جھک کر میری پنڈلی کو غور سے دیکھنے لگا۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے لوہے کی وہ سلاخ اٹھالی جسے آج شام ہی کو میں اپنے گدیلے اور دیوار کے بیچ چھپا چکی تھی۔ وہ سلاخ مجھے غسل خانے کی دیوار سے یوں بندھی ہوئی ملی تھی کہ اس کا ایک سرا ایک دیوار میں موٹی ڈوری سے بندھا تھا اور دوسرا سرا دوسری دیوار میں۔ اس سلاخ کے اوپر مردانہ کپڑے اور دھوتی لٹکی ہوئی تھی۔ ابھی وہ جھکا ہوا میری پنڈلی پر کسی مکوڑے کے کاٹنے کا نشان ہی ڈھونڈ رہا تھا کہ میں نے وہ سلاخ اس کے سر پر دے ماری۔ مارتے ہوئے میں نے کسی قسم کی کوئی احتیاط نہیں کی تھی۔ نہ ہی اس وقت مجھے یہ خوف ہوا تھا کہ وہ مر بھی سکتا ہے' اگر وہ مر جاتا تو گویا میں دوسرے قتل کی مرتکب ہو جاتی مگر سچ ہے' انسان کو اپنی جان دوسری جان سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ سلاخ سر کے پچھلے حصے پر پوری قوت سے پڑی تھی۔ اس کا سر پھٹ گیا اور وہ کوئی آواز نکالے بغیر میری ٹانگوں پر گر پڑا۔ میں نے جھٹکے سے اسے پرے کیا اور بھاگ کر دروازے تک پہنچ گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس کا ساتھی پہنچ جائے اور کھلے ہوئے دروازے سے اپنے ساتھی کو اندر یوں زخمی حالت میں بکھرا دیکھے۔ میں نے دروازے کے پٹ بھیڑ دیے پھر بھاگ کر اندر آئی' کسی نہ کسی طرح اسے گھسیٹ کر اپنے گدیلے پر ڈالا اور اس پر کھیس ڈال دی جو میں اوڑھ کر سوتی تھی۔ یہ سب میں نے حیرت انگیز طور پر صرف چند لمحوں میں کر لیا۔ میں نے خود کو چادر سے اچھی طرح ڈھانپا۔ دروازے کی جھری سے باہر جھانکا۔ وہ سلاخ اب بھی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں آنے والے ہر خطرے سے ٹکرانے کو پوری طرح تیار تھی۔ مجھے آج اور اسی وقت ہر حال میں یہاں سے نکلنا تھا۔ میں فیصلہ کر چکی تھی کہ اگر اس کا دوسرا ساتھی آ گیا تو میں اسے بھی مارنے سے نہیں جھجکوں گی۔ باہر جہاں آگ جل رہی تھی وہاں ملک کاما' شادا اور کوئی اور آدمی بیٹھا تھا۔ اتفاق تھا کہ ان کی پشت اسی طرف تھی۔ ملک کاما البتہ ایسے بیٹھا تھا کہ ذرا سا نگاہ کو ترچھی کرتا تو میں یہاں کھڑی نظر آ جاتی۔ میرا دل زور' زور سے دھڑکنے لگا۔ میرے لیے خطرہ بہت زیادہ تھا مگر میں یہ خطرہ مول لئے بغیر یہاں سے نکل ہی نہیں سکتی تھی۔

دوسرا بندہ دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ باہر آگ کی وجہ سے کچھ روشنی تھی ورنہ شاید گھپ اندھیرا ہوتا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر آہستہ سے دروازہ اتنا کھول لیا

کہ میں آڑھی ہو کر باہر نکل سکوں کیونکہ دروازہ اگر زیادہ کھلتا تو اندر رکھی لالٹین کی روشنی باہر آتی۔ اس روشنی کو دیکھ کر وہ لوگ متوجہ بھی ہو سکتے تھے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر قدم باہر نکال دیا' دروازے کی جھری ہی سے میں دیکھ چکی تھی کہ دوسری جانب اندھیرا ہے۔ میں نے اسی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے میں دیر نہیں کی۔ میں نے باہر آتے ہی بڑی آہستگی سے کنڈی لگائی تاکہ دروازہ باہر سے بند دیکھ کر وہ یہی سمجھیں کہ کھانا دینے والا بندہ باہر جا چکا ہے اور وہی دروازہ بند کر کے گیا ہو گا۔ کنڈی لگاتے ہی میں دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ یہاں اندھیرا زیادہ تو نہیں تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ آگ کے لپکتے شعلوں کے قریب بیٹھنے والے لوگوں کو میں اتنی آسانی سے نظر نہیں آؤں گی۔ جونہی میں نے کمرے کی اس دیوار کو پار کیا ایک پتلی سی گلی تھی' اندھیرے میں ڈوبی اس گلی کے باہر دوسری طرف ایک ٹرک کھڑا تھا۔ اس ٹرک پر سوکھی گھاس لدی ہوئی تھی۔ میں تیزی سے اس ٹرک کی آڑ میں ہو گئی۔ اس کے بڑے بڑے پہیوں کے پاس چھپ کر بیٹھ گئی۔ میں یہاں سے چاروں طرف کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔ میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ یہ بھینسوں کا باڑا تھا۔ کمرے میں سے جو کچی دیوار نظر آتی تھی اس کے پار روشنی نظر آ رہی تھی اور اس کے آنگن سے اٹھتا ہوا دھواں صاف نظر آ رہا تھا۔ اس دیوار کے سامنے ملک کاما اور شادا بیٹھے کسی بات پر زور زور سے ہنس رہے تھے۔ میں نے پلٹ کر دوسری جانب دیکھا اور یہ دیکھ کر دھک سے رہ گئی کہ وہاں اونچی دیوار کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ ٹرک کے سامنے جو میں نے پتلی سے گلی دیکھی تھی۔ وہ بھی آگے جا کر اس اونچی دیوار پر ختم ہو جاتی تھی۔ گویا اس طرف سے باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں اس اونچی دیواروں کے اندر والے حصے میں ہوں۔ یہاں سے باہر جانے کا جو بھی راستہ تھا وہ اس طرف نہیں تھا۔ گویا اب مجھے باہر جانے کے لیے ملک کاما وغیرہ کے سونے کا انتظار کرنا تھا اور میں نہیں جانتی تھی کہ وہ لوگ کب سوئیں گے۔ مجھے ڈر تھا کہ دوسرا پہریدار بندہ آ گیا تو اپنے ساتھی کو تلاش کرے گا اور بات کاما تک پہنچے گی' یوں وہ لوگ کنڈا کھول کر میرے کمرے میں دیکھیں گے اور پھر..... پھر اس سے آگے سوچنے کو کچھ نہ تھا۔ اتنی سردی میں بھی میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں پنجرے میں قید پنچھی کی طرح لرز کر رہ گئی۔ میرا سارا کیا کرایا بیکار گیا تھا۔ میں ویسے ہی قید میں تھی اور

بے وجہ ہی ایک اور بندہ میرے ہاتھوں مارا گیا تھا' وہ اگر مرا نہیں تھا تو سخت زخمی تو ہو ہی گیا تھا۔ اب اگر اسے دیکھنے میں دیر ہو جاتی تو خون زیادہ بہنے کی وجہ سے وہ مر بھی سکتا تھا اور اگر یوں ہو جاتا تو..... تو وہ لوگ میرا وہ حشر کرتے جو شاید چوہدری نیاز بھی نہ کرتا۔ میں اب خوف سے باقاعدہ کانپنے لگی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ اس وقت میں نے کامے کے پاس بیٹھے آدمی کو اٹھتے دیکھا۔ شادا بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ کچھ باتیں کر رہے تھے۔ آواز اتنی دھیمی نہ تھی کہ مجھے سنائی نہ دیتی مگر میرے حواس ہی کام نہیں کر رہے تھے۔ میں سمجھی کہ وہ وہی دوسرا پہریدار ہے' پھر وہ تینوں میری طرف بڑھنے لگے۔ میں دھیرے دھیرے ٹرک کی آڑ لیے' زمین پر بیٹھے بیٹھے پیچھے سرکنے لگی۔ اب میں ٹرک کے پچھلے حصے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ ٹرک کا پچھلے حصے کا لوہے کا پٹ نیچے گرا ہوا تھا۔ شاید یہ سوکھی گھاس یہیں سے چڑھائی گئی تھی یا شاید اتاری جانی تھی۔ وہ لوگ میرے بالکل قریب آ چکے تھے۔ میں منہ پر ہاتھ رکھے' بے آواز قدموں سے پیچھے سرک رہی تھی۔ ٹرک کے نیچے سے جھانک کر ان لوگوں کو بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ ان تینوں کی ٹانگیں صاف نظر آ رہی تھیں کیونکہ ان کے بالکل پیچھے کچھ فاصلے پر آگ روشن تھی۔ وہ تینوں ٹرک کے انجن کی طرف رک گئے تو میں پچھلے حصے میں دبک گئی۔ اب مجھے ان کی ہنسی کی آوازیں اور باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"یار! تیرے پاس کچھ دم لگانے کو ہے تے دے۔ اتنا لمبا رستہ اکیلے کاٹنا بہت سخت ہوتا ہے۔" یہ آواز شادے یا کامے کی نہیں تھی۔ شاید یہ وہی آدمی تھا جسے میں پہریدار سمجھ رہی تھی مگر اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ یہ وہ نہیں بلکہ کامے اور شادے کا کوئی دوست ہے۔

"ہاں یہ بیڑی ہے..... بھری ہوئی ہے۔ لمبے کش لے گا تو ایک منٹ میں سٹیشن تک پہنچا دے گی۔" یہ آواز شادے کی تھی۔

"او بس بس..... جیو میرے یار' اتنے میں ہی لمبا سفر کٹ جانا ہے اور میں نے کون سا سدھا جانا ہے۔ میں تے پہلے اپنی چینیلی کے ہار جاؤں گا فیر میں نے گودام جانا ہے۔ اچھا جی میں چلیا..... بھوئے آصل میں ملاکات ہو گی۔"

"تو آنا اے بھوئے آصل؟" ملک کاما اس وقت ٹھیٹ پنجابی میں بات کر رہا تھا۔

"آہو جی۔ اتھوں کاٹھی کڈھنی اے..... اوتے بھاری دھندہ اے گا۔" اجنبی نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ لوگ یہاں تک میرے کمرے کے دروازے کے سامنے سے گزر کر آئے تھے۔ شاید ان میں سے کسی کو ان دونوں بندوں کا خیال نہیں آیا تھا۔ میں جان گئی کہ وہ اجنبی یہ ٹرک لے کر جا رہا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے ایک اور فیصلہ کیا اور فیصلہ کرتے ہی دھیرے سے کھڑی ہو گئی' پھر میں بڑی دشواری کے بعد اس ٹرک پر چڑھنے میں کامیاب ہوئی۔ میں نے اوپر چڑھتے ہوئے سنا کہ وہ شخص شادے کو ٹرک کا پچھلا حصہ بند کرنے کے لیے مدد کو کہہ رہا تھا' پھر شاید وہ تینوں ہی ہنستے' باتیں کرتے ہوئے پچھلے حصے کی طرف بڑھے تھے۔ گھاس کی گٹھیاں بہت تھیں۔ میں بڑی مشکل سے اور بڑی تیزی سے اوپر چڑھتی چلی گئی۔ میں نے چاہا تھا کہ مجھے کہیں ایسی جگہ مل جائے کہ میں درمیان میں گھس جاؤں پر وہ گٹھیاں مشین سے بنائی گئی تھیں اور رکھنے والے نے اس طرح رکھی تھیں کہ زیادہ سے زیادہ گٹھیاں آ جائیں۔ اوپر چڑھنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے اوپر چڑھنے میں دیر نہ کی۔ ابھی میں ایک گٹھی کے پیچھے ٹکی ہی تھی کہ وہ لوگ پچھلی طرف آ گئے' اگر مجھے چڑھنے اور چھپنے میں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو میں پکڑی جاتی۔ میرا سانس تو بری طرح پھول ہی چکا تھا' دل بھی بڑے زور زور سے دھڑک رہا تھا اور پورا بدن پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ اس وقت تو مجھے خدا نے بچا لیا تھا ورنہ جانے کیا ہو جاتا۔ پھر میں لوہے کا در بند ہوتے اور کنڈیاں چڑھتے سنتی رہی۔ شادا ملک کاما اور وہ شخص باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ یہ ساری باتیں کسی عورت کے بارے میں تھیں۔ شادا مُصر تھا کہ اسے بھی چنبیلی سے ملوایا جائے اور وہ شخص کہتا تھا کہ تم لوگ حرامی ہو۔ میرا پتا صاف کاٹ دو گے۔

اب میرا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ٹرک والا فوراً ہی چل دے۔ مجھے خوف تھا کہ اگر ٹرک نکلنے سے پہلے میرے فرار کا راز کھل گیا تو غضب ہو جائے گا۔ ملک کاما کو یہ خیال بھی آ سکتا ہے کہ وہ ٹرک کی تلاشی لے ورنہ تو فرار ہونا ناممکن تھا۔ وہ لوگ اس وقت سے اب تک آگ روشن کیے بیٹھے تھے اور جانے والا ان کی نگاہوں میں آئے بنا نکل ہی نہیں سکتا تھا۔ شادے کو نہ جانے کیا ضروری بات یاد آ گئی اس نے اسے ٹرک پر چڑھتے چڑھتے روک دیا۔ میں نے ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا۔ اب میں محفوظ تھی۔ پچھلے حصے کا لوہے کا در

بند ہو چکا تھا اور یوں بھی میں سب سے اوپر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ اوپر آئے بغیر مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے جبکہ میں اگر ہمت کرتی تو جھانک کر انھیں دیکھ سکتی تھی۔ میں آہستہ آہستہ کونے میں رکھی گٹھی کے اوپر آ گئی۔ اب میں نے اپنی بائیں جانب جھانکا۔ وہ شخص یعنی ٹرک کا ڈرائیور ٹرک کا دروازہ کھولے کھڑا تھا اور شادا اور ملک کاما اس سے پوچھ رہے تھے کہ وہ بھوئے آصل کتنے روز میں آئے گا۔ اس شخص نے بتایا کہ وہ ایک ہفتے میں وہاں پہنچ جائے گا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ شادے کا منہ نوچ لوں اور اس ٹرک ڈرائیور کے گلے میں رسی کا پھندا ڈال کر کہوں کہ وہ فوراً ٹرک چلا دے۔ تب ہی اس نے خدا حافظ کہا' ان دونوں کے گلے لگا اور اچھل کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں فوراً ہی اوندھی ہو کر لیٹ گئی۔ میرا منہ پچھلے حصے کی طرف تھا تاکہ میں جہاں تک ہو سکے ملک کاما اور شادے کو دیکھ سکوں۔ اب میں دعا مانگ رہی تھی کہ وہ پہریدار کچھ اور دیر سے آئے تاکہ ہم یہاں سے دور نکل جائیں۔ ٹرک کا انجن زور کی آواز کے ساتھ اسٹارٹ ہو گیا پھر ٹرک رینگتا ہوا آگے بڑھا تو میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا محسوس ہوا۔ کچھ آگے جا کر مجھے ملک کاما اور شادا صاف نظر آنے لگے۔ دونوں اسی جانب منہ کیے کھڑے تھے۔ ٹرک آہستہ رفتار سے چلتا رہا۔ میں چاروں طرف دیکھتی رہی' میری نگاہیں دوسرے پہریدار کو ڈھونڈ رہی تھیں جو نظر نہیں آ رہا تھا اور یہی میرے لیے غنیمت تھا پھر اچانک ٹرک رک گیا۔ میرا دل دھڑکنا بھول گیا مگر اسی وقت میں نے بڑا لوہے کا گیٹ کھلنے کی آواز سنی۔ ذرا سا جھانک کر دیکھا تو ایک بوڑھا گیٹ کا پٹ کھول رہا تھا۔ گیٹ کے کھلتے ہی ٹرک پھر چل پڑا۔ ابھی ہم اس گیٹ سے نکلنے بھی نہ پائے تھے کہ میری نگاہ اس کچی دیوار کے پاس آگ کے بالکل سامنے والے دروازے پر پڑی جس پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا۔ وہاں سے وہی پہریدار روٹی لے کر نکل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں روٹی کی چھابی اور پلیٹیں تھیں۔ اس نے شاید پکار کر کچھ کہا تھا۔ میں نے شادے کو اپنے اسی کمرے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ میرا رواں رواں کانپنے لگا۔ ٹرک جھٹکے لے رہا تھا۔ شاید نیچے بڑے بڑے پتھر تھے یا جانے کیا بات تھی۔ میرا جی چاہا کہ چیخ کر ڈرائیور سے ٹرک تیز چلانے کو کہوں۔ شادا ابھی کمرے کے دروازے پر پہنچا بھی نہیں تھا کہ ایک زور کا جھٹکا لگا اور ٹرک پکی سڑک پر نکل آیا۔ اب وہ سیدھے ہاتھ کو مڑ چکا تھا۔ اب شادا اور ملک کاما میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ ٹرک کی رفتار تیز

نہیں ہوئی تھی مگر پھر بھی اب وہ بغیر جھٹکے لیے آہستہ رفتار سے چل رہا تھا۔ ٹرک کے چلتے ہی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میرے پسینے سے شرابور بدن سے ٹکرائی تو میری پسلیوں میں بڑی زور کا درد اٹھا اور میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔

میں نہیں جانتی کہ میں کتنی دیر تک بے ہوش رہی۔ دھوپ کی تیزی کی وجہ سے میری آنکھ کھلی۔ جسم میں توانائی اترنے کی وجہ سے میں نے خود کو بہت بہتر محسوس کیا۔ چند لمحے تو میں سمجھ ہی نہ سکی کہ میں کہاں ہوں مگر جلد ہی احساس ہوا کہ میرا بدن ہچکولے کھا رہا ہے۔ میں سمجھ گئی کہ میں اب بھی ٹرک میں ہوں اور ٹرک درمیانی رفتار سے چل رہا ہے۔ خود کو آزاد محسوس کرتے ہی مجھ میں حوصلہ پیدا ہو گیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ملک کاما اور ان کے آدمیوں نے میرا پیچھا کیوں نہیں کیا جب کہ میرے فرار کی کہانی زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہی ہو گی۔ میں نے دوسرے پہریدار کو روٹی لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے دیکھ لیا تھا۔ یقیناً اس نے وہاں جاتے ہی دروازے کی کنڈی کھولی ہو گی۔ وہ میرے ہی لیے کھانا لے کر گیا تھا پھر میری جگہ اپنے زخمی ساتھی کو پا کر وہ اچھل پڑے ہوں گے' وہاں تو بھگدڑ مچ گئی ہو گی۔ اتنے دن تک انھوں نے میری خدمت کی تھی۔ چوہدری نیاز کو بلانے کے لیے آدمی بھی بھیج دیا تھا۔ انھیں تو پاگل ہو جانا چاہیے تھا کہ پورے پانچ لاکھ روپے ان کی آنکھوں میں گویا دھول جھونک کر نکل گئے تھے۔ انھیں یقیناً پتا چل چکا ہو گا کہ میں نے فرار ہونے کے لیے اسی ٹرک کو استعمال کیا ہو گا کیونکہ دوسری صورت میں ان لوگوں کی ناک کے نیچے سے نکلنے کا کوئی طریقہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوگ گاڑی نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا پیچھا نہیں کر سکے ہوں گے۔ جیپ تو پہلے ہی وہ چوہدری نیاز کی طرف بھیج چکے تھے۔ میں نے جو کچھ سنا تھا اس سے اتنا ضرور پتا چل گیا تھا کہ ٹرک والے شخص کو کسی اسٹیشن تک جانا ہے مگر وہ پہلے کسی عورت چنبیلی کے پاس جانے کا ارادہ رکھتا ہے اور باوجود ان لوگوں کے پوچھنے کے اس نے اس کا پتا نہیں بتایا تھا۔ گویا میں صرف اس وقت تک محفوظ تھی جب تک وہ اسٹیشن نہیں پہنچتا۔ مجھے ہر حال میں اسٹیشن تک پہنچنے سے پہلے ہی اس ٹرک سے اتر جانا تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر ہو گئی تھی۔ پتا نہیں وہ اس عورت کے پاس سے ہو آیا تھا یا نہیں' میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ میرے بدن میں اور خاص طور پر پسلیوں میں شدید تکلیف تھی۔ شاید ٹھنڈ لگ جانے کی

وجہ سے میری پسلیاں درد کر رہی تھیں۔ میں نے ذرا سا سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔ دن کا وقت تھا' سورج سر پر چمک رہا تھا اور اس وقت میرے دیکھے جانے کا امکان زیادہ تھا اس لیے میں نے بڑی احتیاط سے اوپر ہو کر جھانکا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس ٹرک کے پیچھے اگر کوئی گاڑی ٹرک یا کوئی اور سواری ہوئی تو میں اس میں بیٹھے لوگوں کو نظر بھی آ سکتی ہوں۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ ٹرک کے پیچھے سڑک سنسان تھی۔ یہ کافی چوڑی اور پکی سڑک تھی۔ اس کے دونوں جانب اونچے اونچے درخت تھے۔ آگے چند کاریں اور ایک جیپ جا رہی تھی مگر ان کی رفتار کافی تیز تھی جب کہ ٹرک والا بڑے مزے میں' درمیانی رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا اور زور زور سے ایک پنجابی گیت گا رہا تھا۔ سجناں نے بوے اُتے چِک تان لیئی' چِک تان لیئی۔

میں دھیرے دھیرے سرکتی ہوئی ٹرک کے پچھلے حصے سے قریب آ گئی۔ میں ان راستوں یا اس جگہ سے بالکل لاعلم تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ یہ کون سا علاقہ ہے یا یہاں کس طرف اور کتنی دور کوئی اسٹیشن موجود ہے جہاں اس ٹرک والے کو جانا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ ملک کاما وغیرہ وہاں پہلے ہی سے موجود ہوں گے۔ میرے لیے یہی بہتر تھا کہ میں یہیں کہیں راستے میں اتر جاؤں۔ ٹرک ڈرائیور کو بھی پتا نہ چلے کہ میں نے وہاں سے فرار ہونے کے لیے اس کا ٹرک استعمال کیا ہے' اگر وہ مجھے دیکھ لیتا تو یقیناً جان جاتا کہ میں کہاں سے سوار ہوئی ہوں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ملک کاما وغیرہ نے اسے میرے قید ہونے کے بارے میں کچھ بتایا بھی ہو' اگر ایسا تھا تو وہ مجھے پکڑ کر پھر ان کے حوالے کر دیتا۔ میں کسی بھی قسم کا کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھی۔ میں موت کے منہ سے نکل کر آ رہی تھی۔ دوبارہ موت کے منہ میں جانا میرے بس سے باہر تھا۔ اب تو دوپہر ہو چکی تھی' یقیناً چوہدری نیاز بھی وہاں پہنچ گیا ہو گا۔ وہ ایسی بہت سی جگہوں کے بارے میں جانتا تھا جہاں میں جا سکتی تھی۔ وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ مل کر میری تلاش میں نکل سکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میرے لیے خطرہ بڑھ چکا تھا۔ یہ سب کچھ سوچ سوچ کر میری حالت خراب ہو رہی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب دور دور تک کوئی آبادی نہ تھی۔ ورنہ میں نے سوچا تھا کہ شاید درمیان میں کہیں کوئی آبادی ہو اور وہاں ٹرک کی رفتار بھی کم ہو تو میں اس میں سے چھلانگ لگا کر اپنی جان بچا لوں مگر آبادی کے کوئی آثار نہ تھے۔ میں گھاس

کے گٹھڑوں پر اوندھی لیٹی ہوئی تھی اور ایک گٹھی کے پیچھے سے باہر سڑک پر جھانکتی جا رہی تھی۔ جب آبادی کے آثار نظر نہ آئے تو میں سیدھی ہو کر لیٹ گئی۔ دھوپ کی تمازت اتنی نہ تھی کہ برداشت نہ ہوتی مگر دھوپ آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ میں گھاس پر لیٹی تھی۔ میرا بدن ہچکولے کھا رہا تھا۔ مجھے وہ لمحہ' وہ دن یاد آ گیا جب میں پہلی بار' بالکل اسی طرح کادے اور بابا کے ساتھ بیل گاڑی پر جا رہی تھی۔ یوں ہی گھاس پر لیٹی تھی۔ ایسی ہی نرم دھوپ کی گدگداتی ہوئی کرنوں نے مجھے جگایا تھا۔ ٹرک ڈرائیور کی طرح کادا اونچی لے میں ماہیا گا رہا تھا اور یوں ہی میرا بدن ہچکولے لے رہا تھا۔ میں خوفزدہ اس وقت بھی تھی مگر ماہیا کی اونچی تان' نرم کرنوں اور بابا کی پر شفیق باتوں نے مجھے سارا خوف بھلا دیا تھا۔ مجھے لگا تھا جیسے میں گھنی چھایا میں آ گئی ہوں' جیسے میرے گرد آن دیکھی سی مضبوط دیواریں کھڑی ہو گئی ہیں مگر اب..... اب میں بے یار و مددگار تھی۔ ڈرائیور کے گانے کی آواز سے میرے دل پر بوندیں نہیں گر رہی تھیں بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے الفاظ دل میں تیر بن کر گھستے جا رہے ہوں۔ دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔ اس ڈرائیور کا وجود میرے لیے بہت بڑا خطرہ بن چکا تھا اور میں اس شخص کے رحم و کرم پر تھی۔ خدا کے سوا نہ کوئی مددگار تھا نہ آسرا' میں دعا مانگ رہی تھی کہ وہ کسی جگہ رک جائے۔ کسی ایسی جگہ جہاں کوئی مجھے اترتا نہ دیکھے۔

ایک جگہ ٹرک کی رفتار ذرا کم ہو گئی۔ میں نے ذرا سا سر اٹھایا تو سامنے ایک موڑ پر نگاہ پڑی۔ اس موڑ پر ایک طرف ایک چٹان سی تھی' جس کے کٹاؤ سے ٹرک دائیں جانب مڑ رہا تھا۔ یہاں رفتار بہت حد تک کم ہو چکی تھی۔ میں نے تیزی سے پچھلی طرف سرکنا شروع کر دیا۔ یوں لگا تھا جیسے مجھ میں بجلی بھر گئی ہو۔ میں نہیں جانتی کہ میں چلتے ہوئے ٹرک سے کس طرح لٹکی۔ میں نے اس کے آدھے دروازے کے ایک جانب سے کنڈے کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور بہت بڑا خطرہ مول لے کر اپنے بدن کو نیچے کی طرف لٹکا دیا۔ میرے پاؤں اب بھی زمین سے بہت بلند تھے۔ میں رفتار کے مزید کم ہونے کی منتظر تھی۔ میں آہستہ آہستہ نیچے کی طرف سرکتی جا رہی تھی۔ پھر موڑ کاٹتے ہوئے ٹرک کی رفتار اور کم ہو گئی۔ میرے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر ہاتھ سے کنڈا چھوڑ دیا' پیروں کے زمین سے ٹکراتے ہی میرے حلق میں چیخ کا گولا سا پھنس گیا۔ میں جانتی تھی

کہ اس وقت اگر میں چیخ اٹھی تو میری آواز ڈرائیور تک پہنچ جائے گی۔ اس لیے میں نے چیخ کو بڑی مشکل سے روکا تھا۔ میرے گھٹنوں اور کولھے کی چوٹ ابھی مکمل طور پر ٹھیک بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں نے ایک بار پھر چھلانگ لگا دی تھی۔ چھلانگ لگا کر میں اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکی اور ایک جانب لڑھک گئی۔ دوسرا غضب یہ ہوا کہ وہ چادر جو میں نے اس گدیلے پر سے اٹھا کر اپنے گرد لپیٹ لی تھی' لوہے کے کنڈے میں اٹک گئی تھی جس کی وجہ سے میرے بدن کو زور کا جھٹکا لگا تھا۔ میں گر پڑی تھی اور وہ چادر ویسے ہی ٹرک کے پیچھے لٹکی رہ گئی تھی۔ میں گرتے ہی تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ایک بڑے پتھر کے پیچھے چھپ گئی۔ بدن میں شدید تکلیف اور ٹانگوں میں اٹھنے والی ٹیسوں کی وجہ سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ کولھے کا پٹھا پھر جیسے اکڑ کر رہ گیا تھا۔ اذیت اتنی شدید تھی کہ میں نے اپنا نچلا ہونٹ کاٹ لیا مگر آواز نہ نکلنے دی۔ ٹرک کی رفتار کم تھی اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں ٹرک ڈرائیور کو کچھ شبہ نہ ہو گیا ہو۔ میں جاتے ہوئے ٹرک کو دیکھتی رہی۔ ٹرک کے پیچھے کنڈے سے اٹکی میری چادر ہوا میں اڑ رہی تھی' ٹرک موڑ مڑتے ہی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ ٹرک کے نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی میں نے سر کو پتھر سے ٹیک دیا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں شدید درد کی لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔ میں چند لمحے آنکھیں بند کیے تکلیف کو برداشت کرتی رہی مگر میں یوں کب تک بیٹھی رہتی۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہ تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ یہاں کہیں آبادی ہے بھی یا نہیں! جہاں تک نگاہ جاتی تھی وہاں تک تو کھیت تھے' خود رو جھاڑیاں تھیں یا سپاٹ' سنسان میدان۔ ابھی تو دن کا وقت تھا مگر شام ہوتے بھی دیر نہ لگتی' سردیوں کے دن تھے اس لیے جلد ہی شام کا ملگجا پن چھا جاتا تھا اور ہوا میں خنکی بڑھ جاتی تھی۔ اس بات کا احساس ہوتے ہی میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ مجھے دن کی روشنی ہی میں ایسی پناہ گاہ تلاش کرنا تھی جہاں میں کم از کم رات گزار سکوں۔ میں اس سنسان علاقے میں ایسی بے خوفی سے کچھ سوچے سمجھے بغیر اتر گئی تھی جس جگہ کے بارے میں مجھے کچھ پتا نہ تھا۔ یہ میری بے وقوفی سمجھ لیں مگر میں اس کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ میری کیفیت اس شخص کی سی تھی جس کے آگے کنواں ہو اور پیچھے کھائی۔ اس قید سے اور چوہدری نیاز کے حوالے کیے جانے سے تو یہ صورتِ حال لاکھ درجے بہتر تھی۔ کم از کم میں آزاد تو تھی۔

اپنی مرضی سے کہیں آ جا تو سکتی تھی۔ کسی نہ کسی طرح کادے' ماما اور بابا تک پہنچنے کی سبیل تو نکال ہی سکتی تھی۔ اس سوچ نے مجھ میں کافی حوصلہ پیدا کر دیا۔ میں نے کھڑے ہو کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ میرے سامنے لمبی سیاہ سڑک تھی۔ اس طرف سے میرے لیے خطرہ ہی خطرہ تھا۔ پتا نہیں یہ سڑک کہاں سے آتی اور کہاں جاتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ لوگ میری تلاش میں نکلے ہوں اور اسی سڑک سے گزریں۔ میں نے دوسری طرف دیکھا' اس طرف کچھ حصے میں خود رو جھاڑیاں تھیں پھر کچھ حصے میں گندا پانی جمع تھا۔ اس کے بعد میدان سا تھا جس میں کہیں کہیں گھاس اگی ہوئی تھی اور کہیں جنگلی پودے۔ میں نے فوری طور پر اس طرف جانے کا ارادہ کر لیا۔ میں کھڑی ہوئی تو ایک بے ساختہ قسم کی چیخ حلق سے آزاد ہو گئی۔ یہاں مجھے کسی کا ڈر نہ تھا اس لیے چیخ گونج کر رہ گئی۔ میری کمر کے نچلے حصے میں شدید درد تھا۔ پیروں کے جوڑ بھی دکھ رہے تھے۔ میں ذرا دیر کو پھر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ اگر مجھ سے چلا بھی نہ گیا تو یہاں ویرانے میں میرا کیا حشر ہو گا۔

چوہدری نیاز اور ملک کاما کے آدمیوں کا ڈر نہ ہوتا تو میں سڑک کے کنارے کھڑی ہو کر آتی جاتی گاڑیوں سے مدد کی درخواست کر سکتی تھی مگر ان حالات میں تو یہ بھی ممکن نہ تھا لیکن میں یہاں بیٹھ کر بھی دن نہیں گزار سکتی تھی۔ کم از کم ایسی جگہ تو مجھے تلاش کرنا ہی تھی جہاں میں رات کی تاریکی میں سرد ہواؤں اور جنگلی جانوروں سے بچ سکوں۔ میں نے پھر چاروں طرف دیکھا اور پھر سڑک کی مخالف سمت چل پڑی۔ میں سڑک سے جلد از جلد دور ہو جانا چاہتی تھی۔ مجھے چلنے میں خاصی دشواری ہو رہی تھی لیکن آنے والے وقت کی ہولناکی نے مجھے اتنی ہمت دے دی تھی کہ میں تکلیف کو برداشت کر کے چلتی رہی۔ خودرو جھاڑیوں کے درمیان اتنا راستہ بھی نہ تھا کہ میں باآسانی انھیں عبور کر سکتی اس لیے کہ جگہ جگہ کانٹے اور باریک سوکھی شاخیں میرا راستہ روک رہی تھیں۔ ایک طویل اور تکلیف دہ سفر کے بعد بالآخر میں نے وہ حصہ عبور کر لیا۔ اب میں ایسے علاقے میں تھی جہاں خودرو جھاڑیاں نہیں تھیں بلکہ کچھ فاصلے پر مکئی کا چھوٹا سا کھیت نظر آ رہا تھا۔ میں نے کھیت کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہاں قریب یا دور' ضرور کوئی نہ کوئی ہو گا ورنہ چھوٹی موٹی آبادی تو ضرور ہی ہو گی' ہر کھیت کھلیان کے قریب کوئی

گھر یا آبادی ضرور ہوتی ہے ورنہ بھلا میلوں کا سفر کر کے کون کھیت کی رکھوالی کو آتا ہے! میں چلتی رہی۔ اب میرے پیر شل ہو چکے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ گر پڑوں' زمین پر لیٹ جاؤں۔ پیاس سے حلق خشک ہو رہا تھا۔ تھکن نے بری حالت کر دی تھی۔ میں پتا نہیں کتنا لمبا سفر طے کر آئی تھی مگر نرم پڑتی دھوپ اور ہوا میں بڑھتی خنکی مجھے خوفزدہ کر رہی تھی۔ میں نے پھر خود کو سنبھالا اور کھیت میں داخل ہو گئی۔ کھیت اتنا بڑا نہیں تھا جسے عبور کرنے میں گھنٹوں لگتے۔ بہت جلد میں کھیت کے آخری سرے پر پہنچ گئی۔ وہاں سے پانی کی نالی گزرتی تھی۔ اس میں صاف پانی دیکھ کر میں برداشت نہ کر سکی اور میری ٹانگوں نے بالکل جواب دے دیا۔ میں گھٹنوں کے بل بیٹھتی چلی گئی۔

میں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا تو مجھے چکر آنے لگے۔ پیٹ میں بل پڑ گئے۔ میں نڈھال ہو کر وہیں گر گئی۔ اب اتنی سکت نہ تھی کہ مزید آگے بڑھ سکتی' اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا کہ کم از کم آدھا گھنٹہ مجھے ضرور آرام کر لینا چاہیے۔ یہی سوچ کر میں زمین پر اوندھے منہ پڑی رہی۔ اب مجھے بھوک بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے کل سے کھانا نہیں کھایا تھا اور پتا نہیں کب تک مزید بھوکا رہنا تھا۔ مکئی کے کھیت میں صرف ڈنٹھل کھڑے تھے یا کچے پودے' ورنہ میں یہاں مکئی کی تلاش کرتی۔ یہ مکئی کی فصل کا موسم بھی نہ تھا اس لیے میری تلاش یوں بھی بیکار تھی۔ میں آدھا گھنٹا وہیں پڑی رہی۔ اس آدھے گھنٹے کے آرام نے مجھے کافی حد تک بہتر کر دیا تھا۔ اب میں خود میں کچھ قوت محسوس کر رہی تھی۔ میں نے پھر آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی میں زمین سے اٹھنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ یہ کسی کے چلنے کی آواز تھی جسے محسوس کرتے ہی میں چوکنی ہو گئی۔ آنے والا پتا نہیں کس طرح چل رہا تھا کہ کافی آواز ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے جھاڑیاں آپس میں ٹکرا رہی ہوں۔ میں نے آواز کی سمت کا اندازہ لگانا چاہا تو پتا چلا کہ یہ آواز مکئی کے کھیتوں ہی میں سے آ رہی ہے۔ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک اپنے سامنے ایک بچے کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس بچے کے ہاتھ میں ایک موٹی سی شاخ تھی جو وہ چاروں طرف گھماتا ہوا کھیتوں میں سے باہر آ رہا تھا۔ اب میں سمجھ گئی کہ اتنی آواز کیوں محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی نگاہ جونہی مجھ پر پڑی' اس کا منہ کھل گیا۔ وہ حیران کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اس کی عمر بہ مشکل آٹھ نو برس ہو گی۔ اسے دیکھ کر تو جیسے مجھے

زندگی مل گئی تھی۔ میرے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی' شاید اسی مسکراہٹ نے اسے کچھ حوصلہ دیا اور وہ میرے قریب آ گیا۔

"کون اے توں؟" وہ اب میرے قریب کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔

"میں..... میں مسافر ہوں۔ یہاں سے گزر رہی تھی۔"

"کدھر جانا ہے؟" اس نے گردن کو جھٹکا دے کر پوچھا۔

"یہاں قریب ہی آبادی ہے ناں..... وہاں تک جانا ہے۔"

"پر ادھر تو..... اوتے بہت دور ہے گی۔"

"تو تم کیا..... بہت دور سے آئے ہو؟" میں نے پوچھا تو پہلے تو اس نے حیران کر مجھے دیکھا پھر پلٹ کر کسی کو آواز دی۔ "آؤ..... آ۔"

اس کے پکارنے پر میں دھک سے رہ گئی۔ نہ جانے وہ کسے بلا رہا تھا۔ میں جلدی سے اپنی چادر کو اچھی طرح لپیٹ لیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ٹانگوں کے درد مجھے لڑکھڑا دیا مگر میں فوراً ہی سنبھل گئی۔

"کون ہے توں کنوں واجاں ماردا پیا ایں؟"

"پیو اے مرا..... توں کتھوں آئی ایں۔؟"

وہ بچہ خاصا تیز لگ رہا تھا۔ شاید مجھے یہاں پا کر حیران تھا۔ ابھی میں اسے جواب بھی نہ دے پائی تھی کہ اچانک پودوں میں سرسراہٹ ہوئی اور ایک مضبوط بدن کا سانولا سالم تڑنگا آدمی باہر نکل آیا۔ اس کی نگاہ جونہی مجھ پر پڑی وہ چونک اٹھا۔ پھر اس نے چاروں طرف یوں نگاہ دوڑائی جیسے میرے کسی ساتھی کو ڈھونڈ رہا ہو۔ جب اسے دور دور تک کوئی نظر نہ آیا تو اس نے حیرت بھری نگاہیں مجھ پر گاڑ دیں۔

"سلام جی!" میں نے ہی بات کرنے میں پہل کی۔ میرے سلام کرنے پر اس کی آنکھوں میں خجالت پھیل گئی۔ پھر اس نے میرے سلام کا جواب دیا۔

"توں ادھر کیسے آ گئی.....؟" اس نے پھر چاروں طرف دیکھا۔

"میں جی..... میں....." میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اسے کیا بتاؤں' مجھے یقین ہی نہ تھا کہ کوئی اچانک یوں سامنے آ کر یہ سوال کر بیٹھے گا' اگر ذرا سا بھی یقین ہوتا تو میں اب تک جواب سوچ چکی ہوتی۔ ہاں اگر کوئی آبادی نظر آ جاتی تو میں ضرور پہلے ہی

کچھ سوچ لیتی۔

"توں..... توں کلی ایں کیا؟ ترا مرد کوئی نئیں؟" اس نے پھر حیرت سے پوچھا۔

"ہاں جی..... میں اس ویلے تے کلی آں..... میں گڈی اتوں ڈگ پئی سی۔"

"گڈی اُتوں .....؟" اس کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔ وہ میری بات شاید سمجھا نہیں تھا۔ بھلا سمجھتا بھی کیسے' میں تو خود ہی نہیں سمجھی تھی کہ میں کیا کہنے لگی ہوں۔

"پر اجی میرا حلق خشک ہو گیا اے گا۔ میں ڈگ پئی سی اس لیے میں چل وی نہیں سکدی..... میں..... میں۔" میں نے یوں کہا جیسے میں کسی شدید تکلیف میں مبتلا ہوں۔ تکلیف تو مجھے تھی مگر اتنی نہیں جتنی میں ظاہر کر رہی تھی۔ میں صرف اتنا وقت لینا چاہتی تھی جتنے وقت میں کوئی اچھا سا بہانا ہاتھ آ جائے۔ اسے شاید میری تکلیف کا احساس ہو گیا تھا۔

"اوہ..... شیدے توں اینوں پھڑ' کار لے جا۔ میں لسی لے آنا آں۔" وہ تیزی سے پلٹ گیا۔ میں نے شکر بھیجا اور اس بچے کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام کر آگے بڑھ گئی۔

وہ بچہ مجھے لے کر دائیں جانب چل پڑا۔ اس طرف پھر خودرو بڑی بڑی جھاڑیاں تھیں جن کی جڑوں میں گندا پانی کھڑا تھا۔ ہم دونوں پتھروں پر پیر رکھتے' جھاڑیوں سے بچتے بچاتے دوسری طرف پہنچ گئے۔ سامنے ہی چار پانچ چھوٹے چھوٹے کچے گھر بنے ہوئے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی میں نے آسمان پر نگاہ کی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے رات ہونے سے پہلے پہلے میری پناہ گاہ کا انتظام کر دیا تھا۔ وہ بچہ بار بار سر اٹھا کر مجھے دیکھتا تھا پھر آگے بڑھ جاتا تھا۔ کچے گھر ہونے کے باوجود وہاں آبادی کے آثار محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

"تیری ماں کتھے اے؟" میں نے بچے سے پوچھا۔

"ماں..... نانے کول اے۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

نہ معلوم کیوں مجھے لگا جیسے ایسا کہتے ہوئے وہ دکھی ہو گیا ہو۔ "اور تیرا پیو ہے گا؟"

"آہو....." اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"اتھے ہور بندے بھی رہندے نیں؟" میں نے سامنے گھروں کی ویرانی کو محسوس

کر کے پوچھا۔

"نئیں..... اتھے ہور کوئی نہیں اے گا۔ کسی میں دم ہی نہیں اے گا اتھے رین دا۔ میرا پیو تے ٹارزن ہے ٹارزن' تینوں پتا اے کہ ٹارزن کون ہے گا؟"

"ہاں....." میں بے ساختہ مسکرا اٹھی۔ اب ہم سامنے والے گھر کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ دروازے پر کنڈی یا تالا نہیں تھا۔ اس بچے نے ہاتھ بڑھا کر اسے کھول دیا۔ اندر پورا گھر اجاڑ پڑا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا حالانکہ دروازہ کھلا دیکھ کر میں سمجھی تھی کہ شاید اندر کوئی ہو گا۔ اندر کی حالت بتا رہی تھی کہ یہاں کم از کم کسی عورت کا وجود نہیں ہے۔ وہاں سے یہاں تک چلنے میں میری چولیں ہل گئی تھیں۔ ٹانگوں کی تکلیف ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ چکی تھی۔ ریڑھ کی ہڈی تو لگتا تھا جیسے گل کر گر جائے گی۔ میں وہاں پڑی منجھی پر ڈھے گئی۔ بچہ بہت ذہین تھا۔ وہ میری حالت دیکھ کر سمجھ گیا کہ میں ٹھیک نہیں ہوں۔ اس کا باپ جو لسی لینے رکا تھا' لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ میرے بستر پر گرتے ہی بچے نے موٹا کھیس لا کر میری ٹانگوں پر ڈال دیا۔ میں بستر پر لیٹی تو مجھے چکر آنے لگے' پورا گھر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ بچہ کچھ کہہ رہا تھا مگر مجھے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں بے ہوش تو نہیں ہوئی تھی مگر مجھ پر غشی سی طاری تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ شخص بھی آ گیا ہے۔ اس نے مجھے بٹھانے کی کوشش کی' میرے منہ میں پانی ٹپکایا۔ میرے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور میرے پیروں کو سہلاتا رہا۔

کئی گھنٹے آرام کے بعد میری حالت درست ہوئی۔ میں پوری طرح ہوش میں آئی تو گھر میں چراغ جل چکا تھا۔ شیدا میرے قریب بیٹھا تھا جب کہ اس کا باپ کچھ پکا رہا تھا۔ مجھے سخت شرمندگی ہوئی کہ میں اس قابل بھی نہ تھی کہ کچھ کر سکتی پھر بھی میں نے کہا کہ وہ چھوڑ دے میں پکا دوں گی تو پتا چلا کہ وہ کھانا تیار کر چکا ہے۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر اس نے کھانا نکال لیا۔ میری بھوک سے حالت بہت خراب تھی۔ روٹی پکنے کی سوندھی سوندھی خوشبو نے مجھے ہر چیز سے بیگانہ کر دیا تھا۔ وہ کھانا لے کر منجھی پر ہی آ گیا۔ ہم نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور یہاں تک کیسے پہنچی۔ میں سوچ چکی تھی کہ مجھے کیا کہنا ہے۔ میں نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جھوٹ بول بول کر بھی تو میں

نڈھال ہو چکی تھی۔ اس لیے میں نے اسے شروع سے لے کر آخر تک ساری داستان سنا دی۔ ملک کاما کا نام سن کر وہ تقریباً اچھل پڑا۔ میں نے اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار محسوس کیے۔ "کیا تم اسے جانتے ہو؟" میں نے اس کی یہ کیفیت دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں..... میرا گھر اجاڑنے والا شخص اس کا بھائی بالا ہے۔ شیدے کی ماں فاطمہ' بچپن ہی سے میری منگ تھی۔ بالا' کاما اور ہم ایک ہی گاؤں کے ہیں۔ بالا گاؤں کا بدمعاش تھا۔ گاؤں کی ہر لڑکی پر اس کی نظر تھی۔ اس نے فاطمہ پر بھی اپنا حق جتانے کی کوشش کی۔ ہماری دشمنی وہیں سے شروع ہو گئی تھی۔ فاطمہ بہت دلیر اور سوہنی تھی۔ اسے مجھ سے پیار تھا۔ اس نے بھی بالے کو جھڑک دیا۔ وہ زخمی شیر کی طرح بپھر گیا۔ فاطمہ کا باپ شریف آدمی تھا۔ اسے ڈر ہوا کہ بالا اس کی عزت مٹی میں ملا دے گا۔ اس نے ہماری شادی کر کے ہمیں شہر بھیج دیا۔ میں اکیلا تھا۔ میرا باپ چھوٹا سا زمیندار تھا جو میری شادی سے پہلے ہی مر گیا۔ ماں اس کے پیچھے ہی چل بسی تھی۔ میں اسی لیے گاؤں چھوڑ کر شہر چلا آیا۔ ہم شہر لاہور میں رہتے تھے۔ وہیں شیدا پیدا ہوا۔ اس وقت تک فاطمہ کا باپ میری زمین کی آمدنی مجھے بھیجتا رہا پھر اس کی حالت خراب ہو گئی۔ وہ بیمار پڑ گیا۔ فاطمہ کی ماں لالچی عورت تھی اور بالے سے فاطمہ کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ بالا ہماری شادی کے بعد لکیر پیٹتا رہ گیا تھا۔ اس کے دل میں میرے خلاف زہر بھرا ہوا تھا جسے فاطمہ کی ماں نے مزید بڑھا دیا۔ فاطمہ کا باپ فوت ہوا تو بالے نے میری زمین کا وہ ٹکڑا ہتھیا لیا۔ میں شیدے اور فاطمہ کی وجہ سے مجبور ہو گیا ورنہ تو میں گاؤں جا کر اس سے اپنا وہ ٹکڑا چھیننا چاہتا تھا۔ اب ہماری آمدنی بند ہو گئی تھی۔ میں نے لاہور میں کام ڈھونڈنا شروع کر دیا' پڑھا لکھا تو تھا نہیں کہ نوکری مل جاتی' آخر پیٹ کی خاطر تانگا چلانے لگا۔ فاطمہ پر مصیبتیں آئیں' کم آمدنی نے اس کے خواب چکنا چور کر دیے تو وہ بجھ کر رہ گئی پھر اس کی ماں کا آنا جانا بڑھ گیا۔ ماں نے اسے دھیرے دھیرے میرے خلاف کرنا شروع کر دیا۔ میں یہ بات جانتا تھا مگر اس کی ماں کو آنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ کاش میں نے پہلے ہی روز اس خبیث عورت کو گھر سے نکال دیا ہوتا۔ اس نے فاطمہ کے دل میں میری ہی نہیں اس کے بچے کی محبت بھی کھرچ کر پھینک دی اور....." وہ لمحہ بھر کر چپ ہو کر کچھ دیر کو شیدے کے چہرے پر نگاہیں جمائے رہا پھر اس کے چہرے پر پھیلے دکھ کو محسوس کر کے اس نے اسے اپنے سینے

ہیں بھینچ لیا۔

"پھر..... پھر کیا ہوا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"پھر وہ ہر بات پر لڑنے لگی' اس کی ان آنکھوں میں ہمارے لیے نفرت بھر گئی جہاں پیار کے جگنو سے جلا کرتے تھے۔ وہ بات بات پر شیدے کو مارنے لگی۔ یہ تو معصوم تھا' حیرت سے اسے دیکھتا اور رونے لگتا تھا مگر میں..... میں سمجھ رہا تھا کہ اس نفرت اور غصے کے پیچھے وہ چنگاری دہک رہی ہے جو اس کی ماں سلگا گئی ہے۔ آج سے پانچ برس پہلے' جب شیدا صرف چار برس کا تھا' وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔ میں نے لاہور شہر کو چھوڑ دیا۔ مجھے انسانوں سے نفرت ہو گئی تھی۔ میں صرف اپنے بچے سے پیار کرتا تھا اور کرتا ہوں۔ تبھی میں یہاں آ کر بس گیا۔ سیلاب سے پہلے یہاں کچھ اور لوگ بھی آباد تھے۔ ہم سب نے مل کر زمین کے اس اجاڑ ٹکڑے کو زندہ کر دیا تھا۔ سب نے اپنے چھوٹے چھوٹے کھیت بنا لیے تھے۔ ہم یہاں سکون سے سوتے تھے اور دو وقت کی روٹی کھا لیتے تھے۔ میں نے مکئی کے اس کھیت کے دوسری طرف سبزی ساگ بھی بو رکھا ہے جو ہمارا پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہے۔ مکئی بھی اتنی ہو جاتی ہے کہ میں اسے شہر میں بیچ کر اپنی ضرورت کی دو چار چیزیں خرید لیتا ہوں۔ پچھلے برس کا سیلاب سب کچھ بہا کر لے گیا تھا۔ لوگ مایوس ہو گئے اور یہ جگہ ہی چھوڑ گئے مگر میں تو مایوسی کی حدود کو چھو کر لوٹا ہوں۔ میری طرح میرا بچہ بھی صابر اور محنتی ہے' ہم نے پھر تنکا تنکا جوڑ کر یہ گھر بنایا اور پھر فصل اگا دی۔ آج ہم باپ بیٹے یہاں خوش ہیں۔ مگر تُو..... تو ہم سے بھی زیادہ دکھی ہے۔ تُو عورت ہو کر اس دنیا کے بھیڑیوں سے مقابلہ کر رہی ہے اور میں مرد ہو کر بھی یہاں اس ویرانے میں آ بیٹھا ہوں۔ شاباش ہے تجھ پر۔" اس نے ستائشی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"ابا! اس کو اس کے ابے تک پہنچا دے۔ وہ تو بہت پریشان ہو گا۔" شیدے نے اپنے باپ سے کہا۔

"ہاں پتر! یہ ٹھیک ہو جائے پھر ہم اسے لے کر اس کے گاؤں چلیں گے۔"

"نہیں....." میں نے ایک دم کہا۔ "میں وہاں نہیں جا سکتی' ان لوگوں کو بھنک بھی مل گئی تو..... تم بس فاطمہ خالہ تک میرا پیغام پہنچا دینا یا کادے کو مل کر بتا دینا کہ میں یہاں ہوں۔ انھیں یہاں لے آنا۔ لیکن دیکھو..... یہ خیال رکھنا کہ انھیں تم پر شبہ

نہ ہو سکے۔"

"ٹھیک ہے۔ تیرا گاؤں یہاں سے دور نہیں ہے۔ میں صبح نکلا تو رات تک وہاں پہنچ جاؤں گا۔ تُو اب فکر نہ کر' سو جا۔ سویرے دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے اس مکان کے اکلوتے کمرے میں منجھی ڈال کر میرا بستر لگا دیا۔ شیدا اپنے باپ کے پاس ہی سوتا تھا مگر آج اس نے میرے پاس سونے کی ضد کی۔

"تُو اسے پریشان کرے گا۔ اتنی زور کی لاتیں چلاتا ہے کہ....."

"نہیں چلاؤں گا اب!" اس نے فوراً سر ہلا کر کہا۔

"رہنے دے۔ یہ میرے پاس سو جائے گا۔" میں نے یوں بھی جلدی سے کہا کہ میرے دل میں ایک خوف سا تھا۔ میں دلوں کے اندر تو نہیں جھانک سکتی تھی' کیا پتا اس کے دل میں کیا تھا۔ یہاں ویرانے میں کوئی بھی میری مدد کرنے والا نہ تھا۔ اس نو برس کے بچے کی بھی بھلا کیا حیثیت تھی۔ میں جانتی تھی کہ انسان کتنی جلدی بہک جاتا ہے مگر میں خدا پر بھروسا کرتی تھی۔ اس وقت بھی یہاں اجنبی لوگوں میں بس خدا ہی میرا مددگار تھا۔ شیدے نے بستر لگا کر مجھے سہارا دیا۔ میں اب بہتر تھی اس لیے میں نے اس سے کہا کہ میں ٹھیک ہوں۔ میری پنڈلیاں اینٹھی ہوئی تھیں اور بدن میں درد بھی تھا مگر میں اب پہلے سے بہت بہتر تھی۔ شیدا میرے ساتھ ہی کمرے میں آ گیا۔ شیدے کا باپ آنگن میں ہی منجھی پر لیٹ گیا تھا۔ اس کمرے کا دروازہ نہیں تھا جسے بند کر کے میں مطمئن ہو جاتی اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ میں ساری رات جاگ کر گزاروں گی۔ شیدے کو میں نے اپنے پاس ہی لٹا لیا تھا۔ وہ بہت دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ میرے بابا اور اماں کے بارے میں پوچھتا رہا اور میں اسے یوں ان دونوں کی باتیں سناتی رہی جیسے اسے پریوں کی کہانی سنا رہی ہوں' پھر کافی رات گئے وہ میری باتیں سنتے سنتے سو گیا۔

شیدے کے باپ کی منجھی مجھے یہاں سے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس لیے میری تمام قوتیں' میری سماعت میں سمٹ آئی تھیں۔ میں کسی آہٹ کی منتظر تھی مگر جلد ہی گونجتے ہوئے خراٹوں نے مجھے پُرسکون کر دیا۔ میں نے آنکھیں موند لیں' اب ذرا کچھ سکون ملا تھا تو گزرے وقت کی دھول جیسے آنکھوں کی پتلیوں پر جم گئی۔ ملک کاما کا چہرہ آنکھوں میں گھوم گیا۔ تپتا ہوا' انگارے کی طرح دہکتا ہوا چہرہ۔ میں جانتی تھی کہ میرے

فرار نے اسے پاگل کر دیا ہو گا۔ مجھے فکر اس پہریدار کی تھی جسے میں زخمی کر آئی تھی۔ خدا کرے وہ بچ گیا ہو۔ میں نے صدقِ دل سے دعا مانگی۔ پھر میں کادے اور بابا کے بارے میں سوچنے لگی۔ جانے ان لوگوں کے ساتھ کیا ہوا ہو گا۔ جانو' دینو اور ماجا کس حال میں ہوں گے۔ کرم دین تو تھانے سے فرار ہو گیا تھا۔ شاید اس نے باقی لوگوں کو بھی چھڑا لیا ہو۔ میں تو شیدے کے باپ سے یہ سنتے ہی خوش ہو گئی تھی کہ یہاں سے میرا گاؤں زیادہ دور نہیں ہے۔ میں نے سوچ لیا کہ سویرے ہی اسے بھیج دوں گی۔ یہاں میں زیادہ محفوظ تھی' میرا گاؤں جانا اب کسی بھی حالت میں ٹھیک نہیں تھا۔

میں یہ ساری باتیں سوچتی' پروگرام بناتی اور بگاڑتی رہی۔ سویرے میری آنکھ لگ گئی۔ ساری رات کی جاگی ہوئی تھی اس لئے سوتی رہ گئی۔ مجھے شیدے نے چھوا تو میں ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔

"ابا کہتا ہے دھوپ سر پر آ گئی ہے۔ تجھے گاؤں چلنا ہے کہ نئیں؟"

"اوہ ہاں....." میں جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ واقعی سورج اوپر چڑھ آیا تھا۔ شیدے کا باپ چائے بھی بنا چکا تھا۔ مجھے پھر شرمندگی ہوئی۔ "پرا جی! مجھے اٹھا دیا ہوتا۔ میں بنا دیتی چائے اور روٹی۔"

"خود ہی کام کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ اب عورت کے ہاتھ کا پکا ہوا کچھ اچھا بھی نہیں لگے گا۔ تُو بتا کیا کرنا ہے۔"

تب میں نے اسے کہا کہ وہ گاؤں چلا جائے۔ خالہ فاطمہ سے ملے اور اسے بتائے کہ میں ٹھیک ہوں اور یہ بھی بتائے کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میں نے اسے کہہ دیا کہ اگر ہو سکے اور کادا مل جائے تو وہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ وہ مجھے شیدے کا خیال رکھنے کا کہہ کر نکل گیا۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ رات کی فکر نہ کرے۔ اللہ بیلی ہے مگر صبح سویرے ہی وہاں سے چل پڑے تاکہ دوسرے روز شام تک پہنچ جائے۔ خدا میرے ساتھ تھا کہ مجھے ایسا آدمی مل گیا تھا جو میری مدد کو تیار تھا ورنہ یہاں ویرانے میں اگر وہ میری عزت لوٹ کر مجھے دفنا بھی دیتا تو کسی کو پتا نہ چلتا۔ وہ چلا گیا۔ اس کی تاکید کے مطابق میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور شیدے کو بھی باہر نہ جانے دیا حالانکہ وہ ضد کرتا رہا کہ بس کھیت کا ایک چکر لگا کر واپس آ جائے گا۔ شیدے کا باپ مجھے بتا چکا تھا کہ آٹا کہاں ہے

اور مجھے کیا پکانا ہے۔ میں نے سب سے پہلے گھر کو سمیٹا' صفائی کی' ہر چیز ترتیب سے رکھی پھر برتن دھو کر کھانا پکانے میں لگ گئی۔ شیدا مجھے حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں جلتی بجھتی روشنی سی دیکھ کر میرے دل میں ہوک سی اٹھتی رہی۔ وہ معصوم بچہ اپنی ماں کے لمس کو ترستا ہو گا۔ باپ کے چلے جانے کے بعد تنہا ہو جاتا ہو گا۔ آج مجھے اپنے گھر میں کام کرتے دیکھ کر اسے یقیناً اپنی ماں یاد آ رہی ہو گی۔ میں یہ سب سوچتی رہی پھر میں نے اسے نہانے کو کہا' کپڑے بدلائے اس کے سر میں تیل ڈال کر اور آڑھی مانگ نکال کر کنگھی کی۔ وہ چپ چاپ میرے چہرے کو تکتا رہا۔

"کیا دیکھ رہا ہے شیدے؟" میں نے کنگھا کر کے اس کے ہاتھوں پر اپنی ہتھیلیاں ملتے ہوئے کہا۔ میری ہتھیلیوں پر لگے تیل نے اس کے ہاتھوں کی خشکی دور کر دی۔

"دیکھتا ہوں کہ ابا کہتا ہے عورت میں پیار نہیں ہوتا مگر تو....تو' تو...."

"نہیں شیدے' عورت میں تو بڑا پیار ہوتا ہے۔ تیری ماں کے دل میں بھی تیری محبت کے سوتے پھوٹتے ہوں گے۔ کوئی بھی ماں اپنے بچے سے نفرت نہیں کر سکتی۔ تیری ماں بھی تجھے یاد کرتی ہو گی۔ تُو اس سے کبھی ملا ہے؟ میرا مطلب ہے بعد میں..... اس کے چلے جانے کے بعد' یہاں یا کہیں اور....."

"نہیں۔ مجھے تو اس کی صورت بھی بھول گئی ہے۔ ابا سے کہتا ہوں کہ ایک بار اسے دکھا دے۔ اس سے پوچھوں گا کہ کیا بالا میرے ابے سے زیادہ اچھا ہے؟ کیا پیار بچے سے زیادہ اپنا ہوتا ہے۔"

اس کی یہ گہری گہری باتیں سن کر میری آنکھیں چھلک اٹھیں۔ "کہاں رہتی ہے وہ' مجھے بتا..... میں جاؤں گی اس کے پاس' اسے بتاؤں گی کہ تیرا بیٹا تو شہزادے جیسا ہے۔ تجھے یاد کرتا ہے۔ تجھ سے پیار کرتا ہے پھر تُو کیوں اسے چھوڑ آئی ہے۔" میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں....." اس نے تڑپ کر اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔ "ابا کہتا ہے جو عورت اپنا خاوند' اپنا گھر اور اپنا بچہ چھوڑ کر کسی اور مرد کے پاس جا سکتی ہے وہ اچھی نہیں ہوتی' وہ کبھی بھی' کسی کے لیے بھی دوبارہ سب کچھ چھوڑ سکتی ہے۔"

"کیا..... کیا اس نے بالے سے شادی کر لی ہے؟"

"نہیں..... وہ اپنی ماں کے پاس ہے۔ بالے نے اس سے شادی نہیں کی۔ وہ اس سے کبھی شادی نہیں کرے گا۔ اس نے تو بس مجھے اس سے چھیننا تھا۔" شیدے نے اتنے دکھ سے کہا کہ میں دل مسوس کر رہ گئی۔ "ابا کہتا ہے کہ عورت بہت خراب ہوتی ہے۔ ابا عورت سے نفرت کرتا ہے' پتا نہیں تم کو کیوں اس نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے بھی عورت اچھی نہیں لگتی پر تم..... تم تو مجھے بھی اچھی لگی ہو"

میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ "عورت بری نہیں ہوتی شیدے حالات اسے برا بنا دیتے ہیں۔ حالات تو مرد کو بھی برا بنا دیتے ہیں' اب دیکھ ناں' بالا تو مرد ہے ناں پھر بھی اتنا برا ہے کہ تجھ سے تیری ماں کو چھین لیا۔ عورت سے نفرت نہیں کرنا چاہیئے' ہر عورت بری نہیں ہوتی۔ جس کو تُو وہٹی بنا کر لائے گا' وہ بھی تو عورت ہی ہو گی ناں!" میں نے اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"میں وہٹی نہیں لاؤں گا ورنہ وہ بھی میرے بچے کو چھوڑ کر چلی جائے گی۔ پھر میرا بچہ بھی راتوں کو اکیلا لیٹ کر روئے گا' اسے سردی لگے تو وہ کانپے گا۔ اسے بھوک لگے گی تو وہ تڑپے گا"

میرا حلق آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ شیدے سے مجھے ایسی باتوں کی توقع نہیں تھی اس کی عمر ہی کیا تھی کہ وہ ایسی باتیں کرتا وہ اس ویرانے میں رہ رہا تھا پھر بھی ایسی پکی اور پختہ باتیں کر رہا تھا جیسے اس نے زندگی کے ہر لمحے کو پڑھا ہو' پرکھا ہو' اس معصوم سے بچے میں اتنی حس تھی کہ وہ اپنے محسوسات کو الفاظ دے سکے۔ یہ میرے لیے حیرت کے ساتھ ساتھ دکھ کا باعث بھی تھا۔ وہ روشن اور چمکتی ہوئی معصوم نگاہوں سے مجھے تک رہا تھا۔ تبھی ایک عجیب و غریب خیال میرے دماغ میں رینگ گیا۔ شیدے کو اپنے ساتھ رکھنے کا خیال۔ "شیدے! تُو..... تُو میرے ساتھ رہے گا؟"

"تیرے پاس تو خود رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ تُو' تو خود اس دنیا میں کلی پھر رہی ہے۔ تُو ابا کو بتا رہی تھی ناں کہ تجھے کچھ لوگوں نے اپنے گھر میں نہیں رہنے دیا۔ مجھے کہاں رکھے گی؟"

اب میں اپنے آنسو نہ روک سکی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں تو خود گھر سے بے گھر ہو چکی تھی' میری زندگی تو مسلسل موت کی سمت سفر کر رہی تھی۔ میں اسے اپنے ساتھ

کیسے رکھ سکتی تھی۔ اب مجھے اندازہ ہو گیا کہ شیدے کا باپ ہر بات اس سے کر دیا کرتا ہو گا' اس کے ساتھ کھیلنے والا کوئی بچہ تو تھا نہیں کہ اس کی معصومیت برقرار رہتی' اتنی سی عمر میں اتنے دکھوں سے شناسائی نے اسے ویسے ہی حساس بنا دیا تھا' پھر ہر وقت بات کا قرب اس میں پختگی بھی لے آیا تھا۔ میں نے اس موضوع کو ختم کر دیا اور اس سے پوچھا کہ اسے کھانے میں کیا چیز پسند ہے۔ پھر میں دوسری باتیں کرتی رہی۔ اس نے گھر کے کاموں میں میرا کافی ہاتھ بٹایا تھا۔ وہ مجھے اپنے کھیت میں لگی سبزیاں دکھانا چاہتا تھا جو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بوئی تھیں مگر اس کے باپ نے باہر جانے سے منع کر دیا تھا اس لیے میں نے کہہ دیا کہ ہم کل وہاں چلیں گے۔ اس نے ایک غلیل بنائی ہوئی تھی جس سے وہ آنگن میں بیٹھ کر باہر لگے پیڑ پر بیٹھی چڑیاں شکار کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اپنی ہر کوشش میں ناکام ہونے کے بعد وہ نئے عزم سے نشانہ باندھنے لگتا۔ میں اس کی حرکتوں کو دیکھ رہی تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا تھا جیسے میرے سامنے نو برس کے بچے کی بجائے کوئی پچیس چھبیس برس کا نوجوان اور پختہ آدمی بیٹھا ہو۔

☆==========☆==========☆

وقت دھیمی رفتار سے بڑھتا رہا۔ میں نے دروازے کی کنڈی میں لکڑی کے کئی پتلے پتلے ٹکڑے پھنسا کر اسے مضبوطی سے بند کر دیا تھا۔ آئے والی رات کا خیال طوفان مجھے ہیجان میں مبتلا کر رہا تھا۔ شیدا چپ چاپ میری حرکتوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے کوٹھری کے اندر منجھی پر بستر لگا دیا اور شیدے کے باپ کی منجھی کو کوٹھری کے دروازے پر کھڑا کر کے دروازہ سا بنا دیا تھا۔ ابھی سورج ڈوبا بھی نہ تھا کہ میں نے روٹی بنا لی۔ بھاجی میں سویرے ہی تیار کر چکی تھی۔ میں نے کھانا کھا کر اپنے لیے چائے بنا لی۔ مجھے چائے پیتا دیکھ کر شیدے کا بھی دل چاہا۔ میں نے اسے چائے کا پیالہ دے کر آگ بجھا دی۔ ہم سرشام ہی کوٹھری میں آ گئے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب شیدے کا باپ میرے گاؤں پہنچنے ہی والا ہو گا۔ اس سے میرے بارے میں سن کر خالہ فاطمہ کا کیا حال ہو گا؟ کادے کو کتنا دکھ ہو گا کہ اس کی موجودگی میں ہی مجھے یوں اٹھا لیا گیا۔ پتا نہیں ماما کی طبیعت کیسی ہو گی؟ وہ تو اس وقت بھی بہت بیمار تھا' بہت لاغر تھا' خدا کرے وہ سب خیریت سے ہوں۔ میں بڑی دیر تک دعائیں مانگتی رہی۔ شیدا چپ چاپ لیٹا چھت کو تک رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ وہ باپ

کے نہ ہونے سے اداس ہے۔ میں نے پوچھا تو وہ بولا۔ "عورت بہت بری ہوتی ہے۔" اس کے لہجے میں نفرت تھی۔ بلا کی نفرت۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ "کیوں.....؟ شیدے! میں نے کہا تھا ناں کہ ہر عورت بُری نہیں ہوتی۔" میں نے اس کے رخسار کو تھپتھپا کر کہا۔

"جھوٹ بولتی ہو تم۔ ہر عورت بری ہوتی ہے۔ آج تم نے..... آج ابا پہلی مرتبہ مجھے چھوڑ کر گیا ہے۔" وہ اس لمحے مجھے بالکل چھوٹا سا' معصوم سا بچہ لگا۔ اس کی کٹورا سی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

"اوہ..... مجھے معاف کر دے شیدے۔ میں..... میں تو تجھ سے بھی زیادہ دکھی ہوں۔ تیرا ابا تو ہے ناں مگر..... مگر میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ نہ ماں نہ ابا' نہ..... نہ کوئی اور بس تیرا ابا تھا جس نے مجھ سے ہمدردی کی اور میرے مامے کو بتانے چلا گیا اور تُو اس بات پر ناراض ہو رہا ہے۔ وہ آ جائے گا شیدے۔"

اس نے میری بات سنتے ہی اپنی ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ "پھر تُو..... تُو اپنے مامے کے ساتھ چلی جائے گی؟"

"ہاں..... تجھے عورت بری لگتی ہے ناں اس لیے..... اس لیے میں یہاں پھر نہیں رہوں گی۔"

اس نے اپنا رخ پھیر لیا۔ میں اسے تھپکنے لگی تاکہ وہ سو جائے۔ وہ رات بہت دیر سے سویا تھا اور سویرے عادت کے مطابق جلدی اٹھ گیا تھا اس لیے اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ جلد سو جائے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بے خبر ہو گیا۔ میں منجھی پر لیٹ گئی۔ انتظار کی اذیت ناک کیفیت تو جیسے میری پوری زندگی کو اپنے شکنجے میں کسے ہوئے تھی۔ میری زندگی میں سوائے انتظار کے لمحات کے اور کچھ رہا ہی نہیں تھا۔ اب اس زندگی سے اکتاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ سکون ہو جائے۔ ایک ایسی زندگی ہو جس میں کوئی جذبہ شدت کے ساتھ نہ ابھرے۔ نہ پیار' نہ انتقام' نہ دکھ' نہ انتظار۔ بہت لمبی لمبی راتیں ہوں' گھر میں مضبوط بازوؤں کا حصار ہو کہ میں بے پروا اور بے فکری پڑی سوتی رہوں مگر زندگی کا یہ رنگ میرے لیے کسی خواب سے کم نہ تھا۔ ذہن میں خوف' طبیعت میں اضطراب' بدن میں درد بس یہی کچھ رہ گیا تھا میری زندگی

میں۔

اس رات تک میں بہت دیر تک سوچتی رہی۔ تھکاوٹ نے میری سوچ بدل کر رکھ دی تھی۔ میں چوہدری نیاز کے معاملے کو اللہ پر چھوڑ دینا چاہتی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب کادا مل گیا تو اس کی منت کروں گی کہ وہ چوہدری نیاز سے بدلہ لینے کا خیال دل سے نکال دے۔ یہاں صرف اسی کی سنی جاتی ہے جس کے پاس دولت ہو' زمینیں ہوں' ڈھور ڈنگر ہوں' جس نے غنڈے پال رکھے ہوں۔ یہاں ان لوگوں کی نہیں سنی جاتی جن کے لیے اپنے پیٹ پالنا بھی عذاب ہو چکا ہو۔ میں نے سوچ لیا کہ کادے سے کہوں گی کہ وہ میرے ساتھ کراچی چلے۔ ہم وہاں محنت مزدوری کر کے گزارا کر لیں گے۔ بابا بھی اس بڑھاپے میں میری وجہ سے عذابوں کا شکار بن چکا تھا۔ اسے اب آرام کی ضرورت تھی اور ماما۔ وہ تو دھیرے دھیرے گلتا ہی جا رہا تھا۔ اسے میں مامی اور کاکے کے پاس چھوڑ آؤں گی۔ اس سے کہوں گی کہ بس اپنی آپاں کے لئے دعا کیا کرے اور خدا کے قہر کا تماشا دیکھے۔ خدا ایک نہ ایک دن چوہدری جیسے جابر انسان کو ضرور عبرت کا نشان بنا دے گا۔ میں مستقبل کے وہ خواب بنتی رہی جن کی تعبیر کے احساس سے ہی دل دھڑک اٹھتا تھا۔ میں خاک کے ذروں کو ستارے بناتی رہی اور دعائیں کرتی رہی کہ میرے ان خوابوں کو تعبیر مل جائے۔

☆=========☆=========☆

رات کب بیتی؟ کب سورج کی کچی کرنیں تاریکی کا سینہ چیر کر باہر آئیں؟ کب ہوائیں کھیت کی نمی کو سینے سے لگا کر آنگن میں داخل ہوئیں پتا ہی نہ چلا۔ میری آنکھوں میں تو دور اپنے گاؤں کا منظر گھومتا رہا۔ میں دیکھتی رہی کہ خالہ فاطمہ شیدے کے باپ کے سامنے بیٹھی اپنا سینہ کوٹ رہی ہے' ماما شعلے کی طرح بھڑک کر بل کھا رہا ہے۔ کادے کی آنکھوں سے آگ کی لپٹیں نکل رہی ہیں اور بابا اپنی بوڑھی آنکھوں کو اپنی میلی آستین سے پونچھ رہا ہے۔ میں جانتی تھی کہ کادا اس کے ساتھ ضرور آئے گا۔ بابا اور ماما بھی اس کے ساتھ ہوں گے۔ اس کا خیال آتے ہی مجھے احساس ہوا کہ اب ان لوگوں کے آنے میں وقت کم رہ گیا ہے۔ میں نے جلدی سے شیدے کو اٹھایا۔ جلدی جلدی بستر لپیٹ کر رکھا۔ آنگن میں پانی ڈال کر جھاڑو نکالی' میرے کپڑے بہت میلے ہو چکے تھے۔ میں اس

حالت میں کادے کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ تو مجھے اتنے رنگوں میں لپٹا دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اگر یوں مجھے ان کپڑوں میں دیکھ لیتا تو... تو اس کا کیا حشر ہوتا۔ میں نے شیدے کے باپ کی دھوتی لپیٹ کر اور اسی کی قمیض پہن کر اپنے کپڑے اچھی طرح رگڑ رگڑ کر دھوئے اور دھوپ میں ڈال دیے پھر نہا کر بالوں میں تیل ڈالا۔ میرا خیال تھا کہ اتنے بہت سے کاموں سے فارغ ہوتے ہوتے وہ لوگ یہاں پہنچ جائیں گے مگر تھوڑی ہی دیر میں میرا سارا کام ختم ہو گیا۔ میں نے آگ جلا کر بھاجی بھی چڑھا دی۔ گھر میں سبزیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ میں نے ساری سبزیاں ملا کر پکالی تھیں۔ شیدا اس دوران میں اپنے محبوب مشغلے میں مصروف رہا۔ اس نے آج بھی کئی چڑیوں کا نشانہ باندھا اور ناکام رہا۔ میں نے روٹی پکا کر آگ بجھا دی۔ کپڑے سکھا کر پہن لیے۔ بالوں کی چٹیا باندھ کر پراندہ ڈال لیا۔ یہ وہی پراندہ تھا جو کادے نے مجھے پہلی بار کپڑے کے جوڑے کے ساتھ دیا تھا۔ وہ ابھی گیلا تھا مگر میں نے اسے بالوں میں ڈال لیا۔ دھل کر تو اس پراندے کا رنگ نکل آیا تھا۔ میں بال بنا کر' آئینہ دیکھ کر اٹھی تو میری نگاہ شیدے کی گہری نظروں سے ٹکرا گئی۔

"کیا ہے۔ تُو ایسے کیوں دیکھتا ہے؟" میں نے اس کے سر پر چپت ماری۔

"تُو جانے کے لیے تیار ہوئی ہے ناں!" اس نے سر ہلا کر پوچھا۔

"ہاں..... آج کادا آئے گا ناں.....بابا اور ماما بھی' میں ان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ شیدے تُو میرے ساتھ چل۔ اب ہم گاؤں نہیں جائے گے۔ شہر جائیں گے۔ تُو نے شہر دیکھا ہے؟" میں خوشی سے سرشار لہجے میں بولتی چلی گئی۔ وہ ویسے ہی سنجیدگی سے مجھے دیکھتا رہا۔

"کیا بات ہے۔ کیا ہو گیا ہے تجھے۔ جواب کیوں نہیں دیتا ہے؟" میں اس کے انداز سے الجھن میں پڑ گئی۔

"اگر..... وہ لوگ نہ آئے تو.....؟"

"شیدے۔" میں چیخ اٹھی۔ مجھ میں دم نہیں تھا کہ ایسا بھی سوچتی۔ میں نے تو ایسا سوچا ہی نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ ضرور آئیں گے۔

"میں نے پوچھا ہے اگر وہ لوگ نہیں آئے تو..... تو پھر تُو کہاں جائے گی؟" وہ اب بھی اسی انداز میں مجھے گھور رہا تھا۔

"آئیں گے وہ لوگ۔" میں نے تڑپ کر جواب دیا۔ "کیوں بدفال نکالتا ہے منہ سے۔ کیوں بددعا دیتا ہے مجھے!" میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں کتنی خوش تھی اور شیدے نے میرے دل میں بھالا اتار دیا تھا۔

"نہیں۔ بددعا نہیں دیتا تجھے' پر اتنا تو جانتا ہوں کہ سب کچھ پورا نہیں ہوتا۔ میں بھی ایسے ہی اماں کا انتظار کرتا رہا ہوں مگر وہ کبھی بھی نہیں آئی۔ تُو بھی بالکل میری طرح ہی انتظار کر رہی ہے اور سمجھ رہی ہے کہ وہ آجائیں گے۔"

"وہ تیری ماں جیسے نہیں ہیں۔" میں بے ساختہ غصے میں کہہ بیٹھی' دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں تو اس سے ایسے لڑ پڑی تھی جیسے وہ میرے برابر کا ہو۔ وہ تو وہی کہہ رہا تھا جو دیکھ اور محسوس کر چکا تھا۔ اس کے چہرے پر سایہ سا آکر گزر گیا۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی میں نے لپک کر اسے سینے سے لگا لیا۔ "شیدے' کیوں میرا کلیجہ چھلنی کر رہا ہے؟" میں رو پڑی۔

"جب میں انتظار کرتا تھا تو ابا بھی یہی کہتا تھا کہ وہ نہیں آئے گی۔ تُو کیوں اس کا انتظار کر رہا ہے۔" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا تو مجھے اس کے باپ پر غصہ آگیا۔ اس نے اس معصوم سے بچے کے دماغ میں زہر بھر دیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ وہ میرے سامنے ہو تو میں اسے اتنی سناؤں کہ ساری زندگی یاد کرے۔ شیدے کی حالت دیکھ کر میں اپنی خوشی بھول گئی۔ میں جان گئی کہ وہ دکھوں کے بھنور میں چکر کھا رہا ہے۔ میرے اپنوں کے پاس جانے کی خوشی نے اس کے ننھے سے سینے میں آتش فشاں جگا دیا ہے۔ "شیدے تُو میرے ساتھ چل۔ میں تجھے تیری ماں کے پاس لے کر چلوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی پیاسی آنکھوں میں اب تک تیری صورت جمی ہو گی۔ وہ اب بھی راتوں کو لیٹ کر تجھے یاد کرتی ہو گی۔"

لمحہ بھر کو اس کی آنکھوں میں کرن سی چمکی مگر وہ دوسرے ہی لمحے وہاں گھور اندھیرا چھا گیا۔ "ابا نہیں جانے دے گا۔" اس کے لہجے میں حسرت تھی۔

"میں کروں گی بات اس سے۔ تُو بس میرے ساتھ چلنے کو تیار تو ہو۔" میں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

"تُو نہیں جانتی۔ ابا اکیلا نہیں رہ سکتا۔ اسے ہر وقت بولنے کی عادت ہے' کوئی اس

کی بات سننے والا نہ ہو تو.....تو وہ جھلا ہو جاتا ہے۔" اس نے یوں کہا جیسے وہ اپنے ابے کا کوئی بزرگ بول رہا ہو۔

"پھر تو ایک کام کرتے ہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ میں اب تک اپنی جھینپ مٹا رہی تھی۔ "تیرے ابے کی شادی کرا دیتے ہیں۔"

یہ بات سن کر اس نے منہ بنا کر مجھے دیکھا' پھر اٹھ کر دوسری منجھی پر جا بیٹھا۔ میں آئینہ اور کنگھا لے کر کھڑی ہو گئی۔ ان دونوں چیزوں کو لکڑی کے پھٹے پر رکھتے ہوئے میں نے پلٹ کر آنگن میں پھیلی دھوپ کو دیکھا۔ آنگن ابھی تک دھوپ سے بھرا ہوا تھا۔ لگتا تھا وقت رک گیا ہے۔ ٹھہر گیا ہے' جیسے وقت کے پاؤں میں کسی نے بھاری بیڑیاں پہنا دی ہیں۔ میں بے دلی سے پھر شیدے کے پاس جا بیٹھی۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ اس سے باتیں کرنے میں ڈھیر سارا وقت گزر گیا ہے اور جیسے سورج ایک دم ہی کسی گہری کھائی میں جا گرے گا اور تاریکی جیسے دھواں بن کر تیزی سے پھیل جائے گی مگر....

"ابا رات کو ہی واپس آئے گا۔ یہاں سے ایک لاری صبح گزرتی ہے اور دوسری رات کو۔ تُو خوامخواہ' بے فضول میں ہی انتظار کر رہی ہے۔"

میں نے چپ چاپ سنا اور منجھی پر لیٹ گئی۔ "تجھے بھوک لگی ہے تو کھانا کھا لے۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ یونہی اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لیے ٹانگیں جھلاتا رہا۔ میرے لیے وقت عذاب بن گیا تھا۔ ایسا ہی ایک جان لیوا دن میں نے فیضو کے گھر میں اس کے انتظار میں گزارا تھا' اور بالکل ایسا ہی شادو کے گھر میں پھوپا اور کمالے جب بابا اور کادے کی تلاش کرنے گئے تھے' تب گزارا تھا اور آج کا دن تو جیسے ان دونوں دنوں سے زیادہ بھاری تھا۔ وہاں فیضو کی ماں' اس کی بیوی یا دوسری جگہ شادو تو تھی مگر یہاں تو صرف نو برس کا ایک بچہ تھا جو اپنے دکھ سے تو واقف تھا مگر میرے دکھ کو نہیں جانتا تھا۔ میں اسے اپنا دکھ بتا بھی تو نہیں سکتی تھی۔ میں چپ چاپ لیٹی رہی اور وہ یونہی بیٹھا رہا۔ اچانک ہی مجھے احساس ہوا جیسے باہر کوئی آواز ہوئی ہے۔ جیسے کوئی آ رہا ہے۔ جیسے پیروں تلے آنے والے سوکھے پتوں کی چیخیں ہوا کے دوش پر دروازے سے سر ٹکرا رہی ہوں۔ میں چونک اٹھ بیٹھی۔ ابھی تو شام بھی نہیں ہوئی تھی۔

اتنی جلدی شیدے کا باپ کیسے آ سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے سوچا کہ یہ میرا وہم ہو گا۔ ابھی شیدے نے بھی بتایا تھا کہ ایک لاری صبح اور رات صرف دو مرتبہ یہاں سے گزرتی ہے۔

شیدے نے مجھے چونک کر اٹھتے دیکھا تھا مگر کچھ بولا نہیں تھا بلکہ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر منجھی پر لیٹ گیا تھا۔ میں بھی مایوس سی لیٹ گئی۔ اب تو پل پل واقعی صدی بن گیا تھا۔ دوران خون بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ کنپٹیاں یوں دھڑک رہی تھیں جیسے دل وہاں آ گیا ہو۔ ابھی لیٹی ہی تھی کہ کسی نے دروازہ بجا دیا۔ میں اور شیدا دونوں اچھل کر اٹھ گئے۔ میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ شیدے نے جھٹکے سے میری چادر پکڑ لی۔

"نہیں.... پہلے پوچھ لے کون ہے؟"

وہ واقعی بہت عقل مند تھا۔ اپنی عمر سے بڑا لگتا تھا۔ میں جذبات میں عقل کھو بیٹھی تھی۔ اگر وہ مجھے نہ روک لیتا تو میں اب تک کنڈی کھول چکی تھی۔ میرے رکتے ہی وہ آگے بڑھا اور دروازے کے قریب جا کر بولا۔ "کون اے؟"

"پُتر! در..... دروازہ کھول۔" باہر سے اس کے باپ کی آواز آئی۔ "جلدی کر.... دروازہ کھول۔" اس کی آواز گھبرائی ہوئی سی تھی۔

میں اور شیدا دونوں کنڈی میں پھنسی وہ لکڑی کی ٹکڑیاں نکال رہے تھے' جو میں نے اس خوف سے اس میں لگا دی تھیں کہ کوئی دھکا دے کر اسے کھول نہ دے۔

"جج.... جلدی کر پُتر!" باہر سے بے چین سی آواز آئی۔ نہ معلوم کیوں اس آواز نے میرے دل میں ہلچل سی مچا دی۔ میں گھبرا گئی۔ چند ہی لمحے بعد میں نے دروازہ کھولا تو میرے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی' پھر میں اس کے ساتھ ماما اور بابا کو دیکھ کر خوش بھی ہو گئی مگر میری خوشی چند ثانئے کی تھی' اس لیے کہ شیدے کا باپ بہت زخمی تھا۔ اس کے دائیں کندھے سے لہو بہہ رہا تھا۔ ایک طرف سے ماما اور دوسری طرف سے بابا اسے سہارا دیئے ہوئے تھے۔ شیدا ساکت کھڑا اسے دیکھے جا رہا تھا اچانک وہ چیخ کر اس سے لپٹ گیا۔

میں نے دروازہ کھول کر جلدی سے انھیں اندر آنے کی جگہ دی۔ ماما نے اسے منجھی پر لٹا دیا۔ اسے شاید گولی لگی تھی۔ ساری قمیض اور دھوتی لہو سے رنگی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ

پیلا پڑ چکا تھا۔ بابا اور ماما کی بوڑھی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر روشنی سی پھیل گئی تھی مگر یہ وقت نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کچھ پوچھتے یا میں ہی ان سے کوئی سوال کرتی۔ ان کے ساتھ کادے کو نہ دیکھ کر میں بھی بے چین تھی مگر وہی بات کہ اس وقت ہم سب کی توجہ شیدے کے باپ کی طرف تھی۔

"زینو! بیٹا جلدی سے پانی پکا کر لے آ۔" بابا نے شیدے کے باپ کی قمیض کو گریبان سے پھاڑتے ہوئے کہا۔ میں لپک کر چولھے میں لکڑیاں رکھنے لگی۔ گو میں آگ بجھا چکی تھی مگر راکھ میں دبے کچھ انگارے کریدتے ہی چمک اٹھے تھے۔ میں نے جلدی سے اپنا دوپٹا پھاڑا' تیل کے کپے میں بھگو کر اسے انگاروں پر رکھ دیا' اور لکڑیاں رکھ کر پھونکیں مارنے لگی۔ بہت جلد لکڑیوں نے آگ پکڑلی۔ میں پانی کی دیگچی اوپر رکھ کر پھر شیدے کے پاس آگئی جو اب سہما ہوا اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا اور پوچھ رہا تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔

"کک..... کچھ نہیں ہوا مجھے۔" شیدے کے باپ نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ "ایک جنگل سے گزرا تھا ناں..... وہاں ایک کاٹھی گھس گئی۔" اس نے شیدے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کاٹھی.....!" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں پُتر! جا تُو جا کر آرام کر..... ہم ابھی پٹی باندھ دیں گے تو یہ ٹھیک ہو جائے گا۔" بابا نے مجھے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ میں اسے وہاں سے لے جاؤں۔ میں اسے لے کر چولھے کے پاس آ بیٹھی مگر میرا اپنا دھیان بھی اسی کی طرف تھا۔

"کاٹھی لگنے سے اتنا لہو تو نہیں بہتا ناں.....؟" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ "اسے..... ضرور بالے نے مارا ہو گا۔ یہ جب بھی گھر سے نکلتا ہے۔ اپنے گاؤں ضرور جاتا ہے۔ ضرور اس سے جھگڑا کر کے آتا ہے۔ میں..... میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔" وہ بڑبڑا رہا تھا۔ "پہلے بھی اس نے ابا کی ٹانگ پر کلہاڑی ماری تھی۔ بڑی مشکل سے ٹھیک ہوا تھا یہ۔"

"نہیں شیدے..... وہ گاؤں نہیں گیا ہو گا۔ دیکھ ناں اتنی جلدی تو آگیا واپس۔ میرا ماما اور بابا بھی ساتھ ہے۔ اسے وقت ہی نہیں ملا ہو گا۔ ویسے وہ ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے اس منجھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پانی کھول گیا تھا' میں پتیلی لیے اس طرف

بڑھ گئی۔ "تُو یہیں بیٹھنا۔ میں آتی ہوں۔" میں نے شیدے سے کہا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ زخم دیکھے۔ مجھے تو لگتا تھا جیسے اسے گولی لگی ہے ورنہ اتنا لہو نہ بہتا۔

بابا نے میرے ہاتھ سے گرم پانی لے لیا پھر وہ اس کا زخم صاف کرنے لگا۔ ماما بھی اس کی مدد کر رہا تھا۔ شیدے کے باپ پر اب غشی سی طاری ہونے لگی تھی۔ بابا کو تقریباً آدھا گھنٹا لگ گیا۔ شیدا سہما ہوا سا اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ میں بابا سے ساری باتیں معلوم کرنے کے لیے بے چین تھی۔ جاننا چاہتی تھی کہ شیدے کے باپ کو کیا ہوا؟ کادا کیوں نہیں آیا' باقی لوگ کیسے ہیں' کہاں ہیں مگر یہاں تو نئی مصیبت کھڑی ہو گئی تھی۔ یہ میری خود غرضی تھی کہ میں ایسے حالات میں بھی سوچ رہی تھی کہ وہ جلد از جلد صرف اس لیے ٹھیک ہو جائے کہ میں ساری باتیں جان سکوں۔

بابا نے اسے پٹی باندھ دی۔ میں نے گرم گرم دودھ پینے کو دیا اور اس میں ڈھیر سی ہلدی ڈال دی۔ بابا کوئی پتا لے کر آگیا اس نے اس پتے کو کچل کر اس کا پانی شیدے کے باپ کو پلا دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس سے زخم میں پیپ نہیں پڑے گی۔ ماما اور بابا اسے اسپتال لے جانے کی باتیں کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ آخر تو اسے اسپتال لے جانا ہی ہو گا۔ میں یہ سن کر پریشان ہو گئی۔ شیدے کا باپ سو گیا۔ شیدا یونہی بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے بابا اور ماما کے ساتھ اسے بھی روٹی ڈال دی مگر اس نے ایک نوالہ بھی نہ لیا۔ بابا نے زبردستی کھلانے کی کوشش کی تو وہ اٹھ کر دور جا بیٹھا۔

"شیدے تُو روٹی کیوں نہیں کھاتا؟" میں نے پیار سے پوچھا۔

"میں روٹی ابے کے ساتھ کھاؤں گا۔" اس نے غصے سے جواب دیا۔

تیرے ابے نے دودھ پی لیا ہے اور وہ سو گیا ہے اٹھے گا تو روٹی بھی کھا لے گا۔" بابا نے بھی اسے پیار کیا۔

میں اسی لمحے کی منتظر تھی۔ وہ اندر جا چکا تھا۔ اس کا باپ بے خبر سو رہا تھا۔ میں نے بابا سے پوچھا کہ کادا کہاں ہے؟ اس نے بتایا کہ وہ میری تلاش میں نکلا ہوا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس روز جب وہ میری ماں کے گھر کے دروازے پر پہنچا تو خالہ فاطمہ اور اس نے مجھے آوازیں دیں۔ میں نے در نہ کھولا' تو اس نے در بجایا پھر بھی کوئی آواز نہ ہوئی تو کادا سمجھا کہ میں دیر سے سوئی ہوں گی اس لیے نیند گہری ہے' تب وہ لوگ گلی کے پچھلے حصے

کی طرف گئے۔ خالہ فاطمہ نے اسے بتایا تھا کہ اس طرف ایک کھڑکی ہے جسے آسانی سے کھولا جا سکتا ہے۔ وہ لوگ اس طرف گئے تو اسے ٹوٹا دیکھ کر گھبرا گئے۔ جلدی سے اندر داخل ہوئے۔ وہاں میں نہ تھی۔ میری چپلیں وہیں پڑی تھیں جس سے وہ سمجھ گیا کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ پہلا خیال اسے یہی آیا تھا کہ مجھے چوہدری کے آدمی اٹھا کر لے گئے ہیں۔

"مگر تم لوگ کہاں تھے.....؟" میں نے اسے ٹوک دیا۔

"ہم ٹھکانا تلاش کر رہے تھے۔ ریلوے کے پاس جو گورنامنٹ کے کوارٹر ہیں ہم وہاں تھے۔"

یہ سن کر میں اچھل پڑی۔ "وہیں تو اس نے مجھے رکھا ہوا تھا۔"

"ہیں.....؟" ماما اور بابا دونوں چونک اٹھے۔

"ہاں....." میں نے سر ہلایا اور پھر اسے ساری کہانی سنا دی۔

"اوہ..... ہم محض اسی لیے باہر نہ نکلے کہ کادا ہم سے کہہ گیا تھا کہ ہم باہر نہ نکلیں' وہ تجھے لے کر آ رہا ہے۔" بابا نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"دیکھا..... میں نہ کہتا تھا کہ جیپ رکنے اور دوبارہ اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی ہے۔" ماما نے جوش سے کہا پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "جیپ کی آواز ہمیں آئی تھی پر ہم سمجھے کہ یہ چوہدری کے آدمی ہوں گے جو ہمیں تلاش کر رہے ہیں۔ جیپ جانے کے آدھے گھنٹے بعد کادا لوٹ آیا تھا۔ وہ بہت پریشان تھا۔"

"پھر وہ..... وہ اب کہاں گیا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہ میرے منع کرنے کے باوجود چوہدری نیاز کی حویلی کی طرف چلا گیا۔" بابا نے اپنی بھیگی آنکھوں کو پونچھ کر کہا۔

یہ سن کر تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ "اوہ..... پھر..... پھر لوٹا نہیں؟"

"نہیں..... کرم دین تھانے سے باہر آ گیا تھا۔ وہ اسے مل گیا تھا۔ وہ دونوں ہی چلے گئے۔ بعد میں ہمیں فاطمہ سے پتا چلا کہ ان دونوں نے جانو' دینو اور ماجے کو بھی تھانے سے چھڑا لیا ہے اور کہیں روپوش ہو گئے۔ چوہدری نیاز کو فاطمہ پر شک نہیں ہوا تھا۔ پھر

وہ تیرے گم ہو جانے سے اتنی پریشان تھی کہ اس نے ہم دونوں کو وہیں روک لیا۔ بیچاری ہر وقت خود کو الزام دیتی رہتی ہے کہ تُو اس کی وجہ سے گم ہو گئی۔ سارا سارا دن روتی ہے۔ اس کا' کاکا پل پل کی باتیں آ کر بتاتا رہتا ہے۔ اسی نے بتایا تھا کہ کادے نے دینو وغیرہ کو بھی فرار کروا دیا ہے۔ ہم تو اس کے انتظار میں وہاں ٹکے ہوئے تھے کہ شاید کسی وقت اس کی کوئی خبر آ جائے مگر کچھ پتا نہ چلا۔ اتنا میں جانتا ہوں کہ وہ ہر لمحہ تجھے تلاش کر رہا ہو گا۔ وہ اس گاؤں سے باہر نہیں گیا ہو گا۔" بابا دھیمے لہجے میں بتاتا رہا اور ماما دکھ سے مجھے دیکھتا رہا۔

"یہ کب پہنچا تھا بابا اور.....اور اسے کیا ہوا ہے؟" میں نے شیدے کے باپ کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کل رات کو پہنچا۔ پہلے تو ماسی نے اسے جھاڑ دیا کہ تُو کون ہے اور کس کادے کو پوچھ رہا ہے۔ وہ اسے چوہدری نیاز ہی کا آدمی سمجھی تھی مگر جب اس نے بتایا کہ وہ بہت دور سے آیا ہے اور تُو اس کے گھر پر ہے' تو میں نے اسے اندر بلا لیا۔ اس نے ساری بات بتائی تو ہم نے صبح کا انتظار کرنے کی بجائے اسی وقت نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم اسی وقت روٹی کھا کر نکل گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم بڑی سڑک سے کسی ٹرک کے ذریعے یہاں تک پہنچ جائیں گے۔ ہمیں ٹرک مل تو گیا پر یہاں تک کا نہیں' بلکہ راستے میں شیدے کے باپ کا گاؤں پڑتا تھا۔ وہ ٹرک وہیں کی منڈی جا رہا تھا۔ ہم نے سوچا چلو آدھا راستہ تو کٹ ہی جائے گا۔ ہم اس کے گاؤں پہنچے۔ وہاں سے لاری پکڑ لیتے اس لیے لاری اڈے پر اتر گئے۔ لاری اڈے پر کچھ لوگ جمع تھے۔ ہم نے انتظار کرنا تھا کیونکہ لاری چلنے میں ابھی دیر تھی۔ اتنے میں وہاں جمع لوگ اچانک زور زور سے بولنے لگے۔ وہ ایک ٹرک والے سے لڑ رہے تھے۔ زور سے بولے تو پتا چلا کہ وہ اس ٹرک والے سے اس لیے لڑ رہے ہیں کہ وہ تجھے اپنے ٹرک میں چھپا کر لے گیا ہے۔ ٹرک والا اس سے انکار کر رہا تھا کہ اس کے ٹرک پر کسی لڑکی نے سفر کیا ہے مگر وہ لوگ اسے کسی بالے کی دھمکی دینے لگے' وہ بپھر گیا۔ میں' تیرا ماما اور یہ چوکنا ہو گیا کیونکہ بات تیری ہو رہی تھی۔ ہم جاننا چاہتے تھے کہ انھیں تیرے بارے میں کس حد تک پتا ہے۔ اسی دوران شیدے کا باپ ان لوگوں سے کچھ قریب ہو گیا تھا تاکہ آسانی سے سب کچھ سن سکے' اتنے میں وہ بالا نام کا آدمی آ گیا۔ اسے

دیکھ کر شیدے کے باپ کا چہرہ لال ہو گیا۔ میں سمجھا تھا کہ اسے تیری وجہ سے غصہ آیا ہے' کہیں یہ کچھ بول نہ پڑے اور وہ لوگ سمجھ نہ جائیں کہ تو اس کے پاس ہے۔ میں نے اسے واپس لانا چاہا تب اس بالے کی نگاہ اس پر پڑی۔ اس نے اسے دیکھ کر زمین پر تھوک دیا۔ بس یہ تو پاگل ہی ہو گیا۔ اس نے کسی کی کچھ نہ سنی اور اس پر پل پڑا۔" بابا کچھ دیر کو رک گیا۔ میں نے جھپٹ کر پانی کا کٹورا اسے پکڑا دیا۔ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ اس نے گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پیا پھر اپنی ہتھیلی کی پشت سے منہ صاف کر کے بولا۔ "وہ ٹرک ڈرائیور بھی ان لوگوں کی باتوں سے بپھر گیا تھا' اس نے ہمارا ساتھ دیا۔ وہ پانچ آدمی تھے اور یہ دو..... اس نے بالے کو تو بہت مارا مگر اس نے لوہے کی سلاخ سے اس پر حملہ کر دیا۔ سلاخ کا کونا اس کے کندھے کے نیچے گھس گیا۔ لہو بہنے لگا تو لوگوں نے بیچ بچاؤ کرایا۔ ہم نے اسے پکڑ لیا۔ ٹرک ڈرائیور بھلا آدمی تھا' اس نے اسے اپنے ٹرک میں ڈالا۔ ہم دونوں بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اسی نے ہمیں یہاں تک پہنچایا۔" بابا اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"اوہ بابا! کیا..... کیا اس نے یہ گھر دیکھ لیا ہے۔" میں گھبرا کر بولی۔

"نہیں گھر تو نہیں دیکھا۔ ہاں یہ جگہ دیکھ لی ہے۔ وہ تو اسے اسپتال لے جانا چاہتا تھا مگر یہ نہ مانا۔ پکی سڑک پر اتارتے ہوئے وہ حیران ضرور ہوا تھا کہ اس ویرانے میں کیوں اتر رہے ہو۔ اس نے بتایا کہ اس کے پاس اس کا مکان ہے۔ کیوں..... تو کیوں پوچھ رہی ہے؟"

"اگر اس نے ان لوگوں کو بتا دیا۔" میں نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"نہیں..... پہلی بات تو یہ کہ وہ واقعی نہیں جانتا کہ تو اس کے ٹرک پر چھپ کر یہاں تک پہنچی ہے۔ پھر شاید اس نے تجھے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس کی باتوں سے ہمیں پتا چلتا تھا۔ اگر وہ آ بھی گیا تو یہ نہ جان پائے گا کہ تو وہی ہے جسے وہ لوگ تلاش کر رہے ہیں۔"

بابا ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا ہی کب تھا کہ پہچان پاتا۔ میں اس طرف سے مطمئن ہو گئی اور بابا سے کادے کے بارے میں سوال کرنے ہی والی تھی کہ شیدا کوٹھڑی سے نکل کر سامنے آ گیا۔

"دیکھا..... میں نہ کہتا تھا کہ اسے زخمی کرنے والا بالا ہی ہو گا۔" اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی اُڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"اوہ..... تو..... تو سویا نہیں؟" میں اسے دیکھ کر بوکھلا گئی۔

"نہیں سویا میں..... اور میں نے ساری بات سن لی ہے۔ مجھے پتا ہے ابا کو بالے کو گالیاں دیے بغیر چین نہیں آتا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے وہاں پہنچ جاتا ہے۔"

"شیدے..... میں نہیں جانتی تھی کہ وہ....." میں جھینپ گئی۔

"اب تو اپنے بابا اور ماما کے ساتھ چلی جا۔ ہم دونوں یہاں ٹھیک ہیں۔ ابے کو میں دیکھ لوں گا۔" وہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اپنے باپ کے قریب آ گیا۔

"شیدے' یہ زخمی ہے' اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہم اسے یوں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔" میں نے قریب جا کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

"میں ہوں ناں اسے دیکھنے کے لیے۔ بھلا اب سے پہلے کیا تم لوگ دیکھ بھال کرتے تھے اس کی؟" وہ جانے کیوں ہم سے اکھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے اثرات واضح تھے۔

"ٹھیک ہے مگر شیدے ہم نے ایسا کیا کیا ہے جو تو ہمیں یہاں سے جانے کو کہہ رہا ہے۔" میں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا ہے تم نے۔" اس نے میرا ہاتھ جھٹک کر اپنے باپ کی طرف اشارہ کیا۔

اسی وقت اس کے باپ کی آنکھ کھل گئی۔ بابا اور ماما حیرت اور دکھ سے شیدے کو دیکھ رہے تھے۔ میں انھیں اس کے بارے میں مختصراً بتا چکی تھی اور شاید خود اس کے باپ نے بھی بتا دیا تھا۔

"شیدے!!!" اس کے باپ نے اسے غصے سے دیکھا۔ "کیا بات ہے' تو کیوں لڑتا ہے؟"

"ابا! اس سے کہہ اب چلی جائے۔ اس کا بابا آ گیا ہے۔ تو اسے لے آیا ہے اور اتنا زخمی ہو گیا ہے۔ اب کیا یہ تیری جان لے کر یہاں سے جائے گی!"

"شیدے!" وہ چیخ اٹھا۔ "میں اس کی وجہ سے زخمی نہیں ہوا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں مگر تو یہاں سے گیا تو اسی کی وجہ سے تھا ناں۔"

"بک بک نہ کر۔" وہ سسکاری لیتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

"اسے کیوں جھڑکتا ہے۔ تُو نے ہی تو اس کے اندر نفرت بھری ہے۔" میں غصے میں بول اٹھی۔

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "میں نے؟"

"ہاں تُو نے۔" میں نے شیدے کو سینے سے لگا لیا۔ "تُو نے اسے ہر عورت سے نفرت دلا دی ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ ہر عورت خراب ہے' نقصان پہنچانے کے سوا عورت کچھ نہیں کرتی۔"

"میں نے ایسا نہیں کہا۔" اس نے احتجاج کیا۔

"تیری بیوی نے اگر تجھے چھوڑ دیا۔ تجھے نقصان پہنچایا تو' تُو نے اپنے اندر کی ساری نفرت اس معصوم کے دل و دماغ میں بھر دی۔ تُو نے اسے اپنی ماں کے قصے کیوں نہیں سنائے جس نے تجھے پل پل پیار دیا ہو گا۔ بالے نے کچھ کیا تھا تو' تُو اس کا بدلہ لیتا مگر اٹھتے بیٹھتے اپنے سلگتے ہوئے الفاظ اس کے کانوں میں کیوں انڈیلتا رہا۔ اس سے اس کی معصومیت کیوں چھین لی تُو نے.....؟" میں نے اسے کھری کھری سنائیں تُو اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ اسے شاید اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ شیدے کو اپنے پاس بلا کر اسے سینے سے لگا کر بیٹھ گیا۔

"اسے لے کر یہاں ویرانے میں آ بسا' تاکہ اسے ساری عمر صرف اپنی ماں کی برائیاں یاد رہیں۔ وہ کسی اچھی عورت کو نہ دیکھے' وہ کسی ماں کو اپنی اولاد کے لیے سلگتے نہ دیکھ پائے۔ اس کے دماغ میں عمر بھر ماں کا وہی تصور جما رہے' عورت کا وہی روپ یاد رہے جو اس نے دیکھا اور تجھ سے سنا ہے۔ تجھے کیا حق ہے کہ تُو اس سے دنیا کی ہر رنگینی اور ہر جذبہ چھین لے!" میں بے قابو ہو چکی تھی۔ بابا اور ماما بھی مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ "یہ.... یہ میرے ساتھ جائے گا یا پھر.... پھر تُو اسے لے کر شہر یا گاؤں چلا جا۔ میں تم لوگوں کو یہاں ویرانے میں نہیں رہنے دوں گی۔ تُو اسے صرف دو وقت کی روٹی دے کر سمجھتا ہے کہ تُو نے اپنے باپ ہونے کا حق ادا کر دیا۔ اگر تُو مر گیا تو یہ کیا کرے گا؟ اسے دنیا والوں کے ساتھ رہنا آتا ہی کب ہے کہ ان کے ساتھ رہ سکے۔ ارے یہ کیا ساری زندگی ویرانے میں گزارے گا۔ تُو نے اگر کسی غلط عورت کا انتخاب کیا تھا تو اس میں اس کا

کیا قصور ہے.... بول.... کیا قصور ہے اس کا....؟"

"بس کر.... بس کر زینو؟" وہ تڑپ اٹھا۔ "میں.... میں غلطی پر تھا۔ مجھے معاف کر دے شیدے...." وہ بے اختیار رو پڑا۔ گھر میں گہرا سناٹا چھا گیا۔ صرف اس کی دبی دبی سسکیاں تھیں جو اس سناٹے کو مجروح کر رہی تھی۔ ہم سب چپ چاپ اسے روتا دیکھ رہے تھے۔ مجھے واقعی اس پر غصہ تھا۔ اس نے شیدے کو دنیا بھر سے کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ شیدے کو سینے سے لگائے روتا رہا پھر اسے پیار کرنے لگا اور بولا۔ "شیدے! پُتر..... یہ سچ ہے کہ ساری عورتیں بری نہیں ہوتیں اور.....اور تیری ماں بھی تو بری نہیں تھی۔ اسے تو بالے نے بہکا دیا تھا۔ تیری نانی نے درغلایا تھا۔ وہ تو..... تیری ماں ہے شیدے۔ میں نے جھوٹ بولا تھا تجھ سے کہ..... کہ وہ تجھ سے پیار نہیں کرتی۔ وہ تو تیری صورت دیکھنے کو ترستی ہے شیدے۔ میں نے اسے منع کر دیا تھا کہ یہاں قدم نہ رکھے۔ میں اسے تیری صورت کبھی نہیں دکھاؤں گا۔ وہ کئی بار لاہور والے گھر آئی تھی شیدے..... تجھے دیکھنا چاہتی تھی۔ تجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی' پر میں..... میں اسے سزا دینا چاہتا تھا۔ اسے ساری عمر تڑپانا چاہتا تھا کیونکہ..... کیونکہ اس نے میرا دل دکھایا تھا۔ مجھے معاف کر دے شیدے..... معاف کر دے۔" وہ اتنا کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ شیدا حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی خوب صورت کٹورا سی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ دکھ بھی تھا اور بے یقینی بھی۔

"ہاں پتر.....ہاں..... وہ تو تیرے لیے زندہ لاش بن کر رہ گئی ہے۔ میں ہی پتھر دل تھا کہ اسے روتا بلکتا دیکھ کر بھی کبھی تیری صورت نہیں دیکھنے دی۔ اسے صرف اس بات کی سزا دی کہ وہ اپنی ماں کے کہنے میں آ کر' مجھ سے لڑ کر کیوں گئی۔ اسے تو بالے سے نفرت تھی شیدے' وہ میرے سوا کسی سے پیار کر ہی نہیں سکتی۔ بس ایک تُو ہی ہے جسے وہ میرے علاوہ پیار کرتی ہے۔ میں..... شیدے! میں تجھے اس کے پاس لے چلوں گا پتر! بس تُو مجھے معاف کر دے۔" وہ پھر رونے لگا تھا۔

"بس کر فضل..... بس کر۔" بابا نے آگے بڑھ کر اس کے آنسو صاف کیے۔ "غلطی انسان سے ہو جاتی ہے' وہ جب بھی صحیح راستے پر لوٹ آئے اچھا ہے' خدا معاف کر دیتا ہے۔ تُو اسے..... اس کی ماں کے پاس چھوڑ دے فضل یا اپنا دل بھی نرم کر

لے۔ لے آ..... لے آ....." بابا نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر کہا۔ فضل نے لمحہ بھر کو سر اٹھایا کر بابا کی طرف دیکھا پھر آنسو صاف کر کے لیٹ گیا۔

"اٹھ زینو! اسے روٹی دے۔ شیدا بھی تو بھوکا ہے۔" میں جلدی سے اٹھ کر روٹی بھاجی نکالنے لگی۔ میں نے شیدے کو اپنے ہاتھ سے نوالے کھلائے۔ فضل نے بھی پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ "یہ..... یہ تُو نے پکایا ہے؟" فضل نے منہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں شیدے نے پکایا ہے۔" میں نے ہنس کر شیدے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ تیر رہی تھی۔ "اور کون پکائے گا؟"

"ہاں..... اور کون پکائے گا۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

اس رات ہم بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شیدا اب جن نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا ان میں غصہ نہیں تھا بلکہ نرمی تھی' ایک انجانی سی خوشی جھلک رہی تھی جیسے میں نے اس کا مان بڑھا دیا ہو' یا اسے پیار کا بے بہا خزانہ دے دیا ہو۔ اسے خوش دیکھ کر میں واقعی خوش ہو گئی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اسے اس کی ماں کا پیار ضرور دلواؤں گی۔ میں اس کے باپ کو مجبور کروں گی کہ وہ اپنی بیوی کو لے آئے۔ وہ وہیں سب کے درمیان میں سکڑ کر لیٹ گیا اور پھر وہیں سو گیا۔ بابا' فضل کو میرے دکھوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ یہ سن کر کہ اس کا اور میرا دشمن مشترکہ ہے وہ جوش سے بھر گیا تھا۔ "بالے کو تو میں اس قابل نہ چھوڑوں گا کہ وہ گھر سے باہر نکل سکے۔" اس نے بپھر کر کہا۔

"بیکار باتیں نہ کر' بالے نے مجھے اٹھوایا ضرور تھا مگر اس کی میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ وہ تو چوہدری نیاز کے کہنے میں آ کر....."

"کیوں..... کیوں؟" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "وہ کون ہوتا ہے کسی کے کہنے میں آ کر کسی کی ماں' بہن' بیٹی یا بہو کو اٹھانے والا' اس لیے کہ وہ کسی بہن کا بھائی نہیں' اس لیے کہ اس نے اپنی ماں کو نہیں دیکھا..... یا اس لیے کہ کوئی عورت ابھی تک اس کی بیوی نہیں بنی۔ وہ فاطمہ کی نفرت کا انتقام دنیا بھر کی عورتوں سے لے رہا ہے زینو..... اس نے اسے ٹھکرا دیا تھا اس لیے وہ ہر عورت کو اپنی نفرت کا نشانہ بنا رہا ہے۔" وہ غصے سے لال بھبھوکا ہو گیا۔

"کوئی بھی وجہ ہو فضل! تُو خود کو قابو میں رکھ..... شیدے کا تیرے سوا کوئی نہیں

ہے۔ تُو بھی اکیلا ہے اور بالا..... بالا تو پورے گروہ کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ وہ خطرناک آدمی ہے۔ تُو..... تُو چپ کر کے شیدے کی ماں کو لے آ اور شہر بس جا۔ اپنے گھر اور اپنے بچے کی خوشیوں کی دیکھ' یہ تو اندھیر نگری ہے' یہاں مظلوم کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہے۔" ماما نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ہاں فضل! یہ ٹھیک کہتا ہے۔ یہاں کوئی کسی کا نہیں۔ ہمیں دیکھ لے ایک درندے کی خاطر ہم کتنے عرصے سے یوں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اسے دیکھ۔" بابا نے میری طرف اشارہ کیا۔ "ایک لمحہ بھی سکون کا نہیں مل پایا ہے اسے۔ کادا' جانو' دینو' ماجا' کرم دین اور..... اور ہم تینوں' سب دربدر ہو گئے مگر اس درندے کے انتقام کی پیاس نہیں بجھی۔ خدا ایسے لوگوں کو موت بھی نہیں دیتا۔ ان کی رسی دراز کرتا چلا جاتا ہے۔" بابا نے اپنی آنکھوں کے بھیگے کونوں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اب تم لوگ کہاں جاؤ گے؟" فضل نے ایک دم پوچھ لیا۔

"ہم..... ہم کادے کو تلاش کریں گے۔ گاؤں جائیں گے اپنے۔" میں نے عزم سے کہا۔

"نہیں..... نہیں زینو! تُو وہاں نہیں جائے گی۔" بابا نے تڑپ کر کہا۔ "فاطمہ کو بتا کر آیا ہوں کہ میں اور تیرا ماما واپس جائیں گے مگر تُو..... تو یہیں رہ جا۔ تُو یہاں زیادہ محفوظ ہے۔" پھر وہ فضل کی طرف متوجہ ہوا۔ "کیوں فضل..... کچھ روز کے لیے اسے تو یہاں رکھ لے پھر..... پھر میں لے جاؤں گا۔" اس کا لہجہ ملتجی تھا۔

"میں نے انکار تو نہیں کیا ہے بابا! اس نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں ورنہ..... ورنہ میں تو شیدے کو ساری زندگی اپنی نفرت کی آگ میں سلگاتا رہتا۔ یہ اسے تو ہمیشہ یہیں رہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ تم لوگ بھی ابھی یہیں رہ جاؤ۔"

"بھلا ہے تُو..... کادا میری زندگی ہے' میں اس کے بنا جیوں گا کیسے فضلو؟" بابا کی آواز میں' اس کے لہجے میں جیسے کانٹے بھرے تھے کہ سارے کے سارے کانٹے میرے دل میں کھب گئے۔ اندر اتنا لہو بہا کہ میں تڑپ اٹھی۔

"بابا! اور..... اور میں..... میں کیسے جیوں گی؟" میں رو پڑی۔ "میری ہی وجہ سے تو وہ ان دکھوں میں گھرا ہے۔ میں جب تک اس کی زندگی میں سکھ نہیں بھروں گی' مر

بھی نہیں سکتی۔"

"پُتر! رب سے دعا کر' دعا کر کہ وہ ہمیں ہماری زندگی لوٹا دے۔" بابا یہ کہتے کہتے رو پڑا۔ مجھے اس کے بوڑھے چہرے کی جھریوں میں دکھ لرزتے محسوس ہوئے۔ میرا کلیجہ پھٹنے لگا۔ "شادو انتظار کر رہی ہو گی پُتر! اس نے قسم دی تھی کہ میں لوٹ کر نہ آیا تو..... تو وہ....."

"چل بابا! ہم گاؤں چلیں..... میں لاؤں گی کادے کو ڈھونڈ کر..... میں..... میں تجھے اور کادے کو شادو کے در تک لے کر جاؤں گی بابا۔ اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں نے مجھے بھی مار ڈالا ہے۔"

ہم نے بیٹھے بیٹھے ہی گاؤں جانے کا پروگرام بنا لیا۔ فضلو ہمیں روکتا رہ گیا مگر جب اپنی اس کوشش میں ناکام ہوا تو ہمارے ساتھ جانے کی ضد کرنے لگا مگر میں نے اسے شیدے کی قسم دے دی۔ اسے کہا کہ وہ شیدے کے لیے خوشیاں تلاش کرے' ہم اپنی زندگی خود ہی ڈھونڈ لیں گے۔ میں نے اپنی مدد کرنے پر اس کا شکریہ ادا کیا' بابا نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ چل کر گاؤں میں بسے گا' یہ ویرانہ چھوڑ دے گا۔ اس نے وعدہ کر لیا۔ میں نے شیدے کو تاکید کی کہ سویرے ہی والی لاری سے اسے لے کر شہر چلا جائے۔ اس کا علاج بہت ضروری تھا۔ ہم نے اسے ساتھ چلنے کو کہا کہ راستے میں اسے اسپتال میں چھوڑ دیں گے مگر اس نے انکار کر دیا۔ وہ کہتا تھا کہ اب وہ ٹھیک ہے مگر میں نے شیدے کو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ اسے بتا دیا تھا کہ اسے اسپتال لے جانا ضروری ہے۔ ہم نے اگلی صبح یہاں سے جانے کا ارادہ پکا کر لیا۔ شیدا جہاں ماں سے ملنے کا سن کر خوش تھا' وہاں میرے جانے کا سن کر اداس بھی تھا۔ اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔ "تُو پھر آئے گی ناں؟"

"تُو بلائے گا؟" میں نے اس کے رخسار پر چپت مار کر کہا۔

"پہلے میں نے تجھے بلایا تھا جو تُو آئی تھی؟"

"وہ تو قسمت لے آئی تھی۔ دعا کر قسمت پھر لے آئے۔"

"یعنی تُو خود نہیں آئے گی۔" اس نے منہ پھلا کر کہا۔

"آؤں گی بابا' آؤں گی' پر شیدے' تیری ماں نے مجھے نکال دیا تو.... تو میں اس

ویرانے میں کہاں جاؤں گی؟"

"وہ نہیں نکالے گی..... وہ ایسی نہیں ہے۔ میں اسے بتاؤں گا کہ تُو نے..... تُو نے ہی تو مجھے....." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"چل اب سو جا۔ کیوں اسے تنگ کرتا ہے۔" فضلو نے آواز دے کر کہا تو وہ اٹھ گیا۔

"میرے پاس نہیں سوئے گا؟" میں نے اسے اٹھتے دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں..... تُو کل چلی جائے گی تو..... تو مجھے نیند نہیں آئے گی۔" اس نے کہا اور اپنے باپ کے پاس چلا گیا۔

بابا اور ماما بھی اپنی اپنی منجھی پر لیٹ گئے تھے۔ میں اندر کوٹھڑی میں لیٹی ہوئی تھی۔ ذرا بھی تنہا ہوتی تھی تو آنسو حلق میں پھنسنے لگتے تھے اور اس وقت تو کادے کے سوا اور کچھ یاد ہی نہ تھا۔ حتیٰ کہ میں اپنی تکلیف تک بھول گئی تھی۔ میرے کولھے کی تکلیف ختم نہیں ہوئی تھی۔ ایک گھٹنے میں بھی اٹھتے بیٹھتے درد ہوتا تھا مگر بابا اور ماما کو دیکھ کر ہی میں سب کچھ بھول گئی تھی۔ اب تو کادے کی فکر تھی کہ جانے وہ کہاں ہو گا۔ پتا نہیں وہ خالہ فاطمہ تک پہنچا بھی ہو گا کہ نہیں! کاش وہ خالہ تک پہنچ جائے تاکہ اسے میرے بارے میں پتا چل جائے۔ اسے یہ بھی پتا چل جائے کہ بابا مجھے لینے نکل چکا ہے پھر وہ یقیناً میرا انتظار کرے گا۔ میں نے پختہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے پاتے ہی میں وہاں سے نکل جاؤں گی۔ ایک پل بھی اپنے گاؤں میں نہیں رکوں گی۔ چوہدری سے انتقام لینا میرا مقصد تھا' بابا یا کادے کا نہیں' پھر میں انھیں انتقام کی بھٹی میں کیوں جھونکوں۔ میں شہر جا کر چوہدری فیاض کا پتا کروں گی پھر اسے اور اس کے بیٹے کو سب کچھ بتا دوں گی۔ وہ خود ہی اس سے نمٹ لے گا۔ میں رات بھر نئے نئے خواب دیکھتی رہی پھر جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

سویرے بابا نے مجھے اٹھا دیا۔ وہ کہتا تھا کہ سویرے پکی سڑک سے صرف ایک ہی لاری گزرتی ہے' یہ نکل گئی تو پھر ہمیں رات تک انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ لاری ہمیں رات کے اندھیرے میں گاؤں پہنچائے گی' جبکہ رات والی دن کے اجالے میں وہاں پہنچے گی۔ دن میں میرا وہاں جانا خطرناک تھا۔ اسے یہ باتیں فضلو نے بتائی ہوں گی۔ میں جلدی سے اٹھ گئی۔ بابا اور ماما تیار تھے۔ میں نے جلدی جلدی منہ دھویا۔ چائے بنا کر سب کو دی۔

شیدے کو رات کی روٹی اور بھاجی دے کر ناشتا کرایا اور اسے اپنا اور اپنے ابے کا خیال رکھنے کا کہہ کر کھڑی ہو گئی۔ فضلو نے اپنی کالی موٹی سی چادر لا کر مجھے دی' اس موٹی چادر میں نقاب بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے اس کا ایک بار پھر شکریہ ادا کیا اور اسپتال جا کر علاج کرانے کو کہا۔ پھر دوبارہ آنے اور اس کے ساتھ ہی اس کی بیوی سے بھی ملنے کا وعدہ کر کے ہم وہاں سے نکل آئے۔

☆=========☆=========☆

ہم لمبا راستہ پیدل عبور کر کے پکی سڑک پر پہنچ گئے۔ ابھی سورج نکلنے میں ذرا دیر تھی۔ ہوا ٹھنڈی تھی' بابا ہولے ہولے کانپ رہا تھا حالانکہ اس نے صدری بھی پہنی ہوئی تھی مگر اس کی بوڑھی ہڈیوں میں اب حرارت ہی کہاں تھی کہ سردی کا مقابلہ کر سکتا۔ میں کالی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے اندر اوڑھی ہوئی چادر نکال کر بابا کو دے دی۔

"نہ پُتر..... نہ! تجھے سردی لگے گی۔"

"بابا سردی مجھے نہیں..... تجھے لگ رہی ہے۔ دیکھ تو کانپ رہا ہے۔"

"یہ سردی نہیں ہے پتر! لگتا ہے اب ہاتھ پاؤں میں دم نہیں رہا۔ اندر رعشہ اتر گیا ہے۔"

"رب نہ کرے بابا.... ابھی تو ان ہاتھ پیروں میں بڑی قوت ہے۔ یہ ہاتھ پیر ہی تو ہمارے سہارے ہیں بابا۔" میں نے چادر کو اچھی طرح اس کے بدن پر لپیٹتے ہوئے کہا۔

"لاری آ گئی ہے۔ زینو! تو چہرہ نہ کھولنا۔" ماما نے جلدی سے کہا۔

میں نے دیکھا دور سے دھواں اگلتی لاری نظر آ رہی تھی۔ ہم سڑک کے کنارے آ گئے۔ ماما نے ہاتھ اٹھا دیا۔ لاری کی رفتار قریب آتے آتے کم ہو گئی تھی۔ ہم لاری میں بیٹھ گئے۔ مسافر بہت زیادہ تھے۔ اکثر اونگھ رہے تھے اور اکثر باقاعدہ خراٹے لے رہے تھے۔ بابا نے کسی نہ کسی طرح مجھے ایک سیٹ پر بٹھا دیا۔ خود وہ اور ماما لاری کے فرش پہ سکڑ کر بیٹھ گئے۔ ہمیں بالکل آخر میں جگہ ملی تھی۔ پھر راستے بھر مسافر اترتے اور چڑھتے رہے' لاری رکتی' چلتی' بھاگتی رہی۔ سورج کی کرنیں ابھریں' تیز ہوئیں اور دھیرے دھیرے نرم ہونے لگیں۔ میں تمام راستے کھڑکی سے باہر تیزی سے پیچھے کی سمت بھاگتے مناظر کو دیکھتی رہی جو بالکل اسی طرح ایک چھب دکھا کر گزر جاتے تھے جیسے میری زندگی میں آنے والے خوشی کے لمحات گزر گئے تھے۔ اتنی ہی تیزی سے کہ میں ہاتھ ملتی رہ گئی

تھی۔ میں تمام راستے کادے کی خیریت کی دعائیں مانگتی رہی۔ میں کھڑکی سے سر ٹکائے بیٹھی تھی کہ اچانک ایک عورت کی آواز آئی۔ وہ کسی سے کہہ رہی تھی کہ اسے جگہ دے..... اس آواز میں جانے کیا تھا کہ میرے پورے بدن میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے جلدی سے سر گھما کر دیکھا اور پھر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ سونیا تھی' چوہدری نیاز کی بیوی سونیا.... وہی سونیا جس نے مجھے بال پکڑ پکڑ کر مارا تھا۔ وہی سونیا جس نے میری ماں کو بھوکا رکھ رکھ کر موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ وہی سونیا جس نے بڑی زمینداری کا گلا دبا کر اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا اور الزام میرے سر تھوپ دیا تھا۔ میرے اندر بھنور سے پڑنے لگے' کنپٹیاں سلگنے لگیں' اور کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ وہ تنہا تھی۔ سرخ و سفید چمکتی ہوئی رنگت' سونے کی چوڑیوں سے بھری کلائیاں' زندگی سے بھرپور آنکھیں' کانوں میں لٹکے سونے کے جھالے۔

میرا جی چاہا کہ اپنے ناخنوں سے اس کا چمکتا ہوا چہرہ نوچ لوں۔ اسے لاتیں مارتی ہوئی لاری کے دروازے تک لے جاؤں اور چلتی لاری سے نیچے سڑک پر پھینک دوں تاکہ وہ لاری کے موٹے موٹے پہیوں میں آ کر کچلی جائے۔ مجھے خود پر قابو پانا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ بابا اور ماما میری حالت سے بے خبر' سر جھکائے کسی گہری سوچ میں تھے۔ میں نے گھبرا کر اپنا رخ کھڑکی کی طرف کر لیا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی مگر وہاں بھی چوہدرانی سونیا کی خبیث شکل جم کر رہ گئی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ جب اماں کی دوا کے لیے میں نے چوہدری نیاز کو کہا تھا تو اس نے کیسے مجھے جھڑک دیا تھا اور جب وہ بیماری کی پروا کیے بغیر اماں کو کام پر لگا رہی تھی' جب میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ اماں کام کرنے کے قابل نہیں ہے تو اسی نے چوہدری سے شکایت کر کے مجھے کتنا پٹوایا تھا۔ کیسے میرے بال کھینچے تھے۔ مجھے کیسی بری بری گالیاں دیتی تھی۔ مجھے بیتی ہوئی ایک ایک بات یاد آ کر دہکا رہی تھی۔ میرے دانت ایک دوسرے پر جم کر رہ گئے تھے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی اور اسی وقت اماں کی موت کا بدلہ لے لوں۔ اسی نے تو اماں کو موت کے منہ میں دھکیلا تھا۔ اسی نے تو مجھے اس دنیا میں تنہا کر دیا تھا' پہلے میرے بابا کو ان لوگوں نے مجھ سے چھینا پھر اماں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مجھے بابا کا خون میں لتھڑا بدن یاد آیا جو تھانے کے ٹھنڈے فرش پر پڑا

تھا اور اماں روتی بلکتی اس کے زخمی سینے پر سر رکھے اپنا آپ پیٹ رہی تھی۔ اسے بیوہ اور مجھے یتیم کرنے والے سونیا اور چوہدری نیاز ہی تو تھے۔ اگر اس نے اماں کو پیٹ بھر روٹی دی ہوتی' اس کا علاج کرایا ہوتا تو.... تو وہ کبھی نہ مرتی۔ میں بڑی مشکل سے خود کو اٹھنے سے باز رکھے ہوئے تھی۔ کوئی میرے اندر زور زور سے بول رہا تھا کہ زینو! یہ موقع پھر نہیں آئے گا۔ اسے مار دے..... اسے دھکا دے دے۔ اس کا گلا دبا دے۔ اپنے اندر لگی ہوئی آگ کو اس کے خون سے بجھا لے زینو! بجھا لے' عین اسی لمحے اس کے ہنسنے کی آواز نے میرے اندر دھماکے کر دیے۔ مجھے لگا جیسے میرا پورا وجود ٹوٹ پھوٹ کر فضاؤں میں بکھر رہا ہے۔ وہ اپنے برابر بیٹھی عورت سے سرائیکی زبان میں بات کر رہی تھی۔ وہ اسے بتا رہی تھی کہ اس کا بھائی باہر سے آ رہا ہے۔ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ وہ اپنے میکے میں تھی' گاڑی خراب ہونے کی وجہ سے اسے لاری میں سفر کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ بڑے فخر سے بتا رہی تھی کہ اس نے پہلی بار لاری میں قدم رکھا ہے۔ وہ گاؤں کے چوہدری کی بیوی ہے' اس نے بتایا کہ وہ اپنے گاؤں جا رہی ہے تاکہ وہاں سے پیسا لا کر شہر سے اپنے زیور اور کپڑے خرید سکے۔ اس کے انداز میں گھمنڈ اور لہجے میں غرور تھا' تکبر تھا۔ میرے دماغ میں چنگاریاں سی اڑتی رہیں۔ مجھے اپنا اجڑا ہوا گھر یاد آتا رہا۔ اماں کی خالی کلائیاں اور سونے کے کان یاد آتے رہے۔ وہ ساری عمر سونے کی بالیوں کو ترستی رہی اور اس سونیا نے ہمیں دو وقت کی روٹی بھی پوری نہ پڑنے دی۔ اس کی آواز پگھلے ہوئے سیسے کی طرح میرے کانوں میں ٹپکتی رہی' اور میں تڑپتی رہی۔ میں نے اپنے چہرے کو نقاب سے اچھی طرح ڈھانپا ہوا تھا۔ اپنے ہاتھ چادر میں چھپا رکھے تھے۔

سونیا جس سیٹ پر بیٹھی تھی وہ بالکل دروازے کے قریب تھی۔ میرا جی چاہا کہ کاش میں اس کے ساتھ بیٹھی ہوتی' ایک ہی دھکے میں وہ نیچے جا پڑتی۔ میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو جاتا شاید خدا اس وقت میری ہی طرف متوجہ تھا۔ ایک گاؤں کے اڈے پر لاری رکی تو اس کے ساتھ بیٹھی عورت اتر گئی۔ اب اس سیٹ پر اکیلی سونیا رہ گئی تھی۔ میں نے کچھ بھی نہ سوچا اور فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا.... کیا ہوا پتر؟" بابا میرے کھڑے ہونے پر چونک اٹھا۔

"میں وہاں بیٹھتی ہوں بابا! تو یہاں بیٹھ جا...." میں نے آہستہ سے کہا مگر شاید سونیا

نے سن لیا تھا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ بابا نے ماما سے کہا کہ وہ اوپر بیٹھ جائے مگر اس نے بابا کو بٹھا دیا۔ میں سونیا کے برابر جا بیٹھی۔ اس کا لمس محسوس ہوا تو میرے رخسار جلنے لگے۔ اس کے تھپڑ یاد آ گئے۔ میری سر کی کھال یوں دکھنے لگی جیسے اس نے پھر میرے بال پکڑ کر کھینچ لیے ہوں۔

میرے بیٹھنے کے بعد وہ بابا وغیرہ کی طرف دیکھتی رہی۔ تب میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ مجھے لگا جیسے وہ ماما کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ مجھے خیال آیا کہ شاید وہ ماما کو دیکھ چکی ہے۔ مامی نے بتایا تھا کہ چوہدری نیاز اسے گاؤں لے گیا ہے۔ گو ماما اُس وقت جیسا نہیں رہا تھا۔ اس کے بھرے بھرے گال پچک کر رہ گئے تھے۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر کر خوفناک سی ہو گئی تھیں۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ اس کا تانبے کی طرح چمکتا ہوا رنگ جھلس کر سیاہ ہو گیا تھا۔ پہلوانوں جیسا بدن سوکھ کر کانٹا سا بن گیا تھا۔ چوڑے شانے سکڑ گئے تھے اور کندھوں کی ہڈیاں کانوں سے قریب ہو گئی تھیں۔ وہ اتنے کم عرصے میں بہت زیادہ بدل گیا تھا اس لیے مجھے یقین تو نہیں تھا کہ وہ اسے پہچان پائے گی مگر پھر بھی ایک خوف تھا کہ اگر پہچان لیا تو.... تو کیا ہو گا؟ میں نے ماما کی طرف دیکھا' وہ سر کو گھٹنوں پر ٹکائے اونگھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا اس لیے بھی وہ اسے صاف طور پر دیکھ کر اندازہ نہیں لگا سکتی تھی کہ یہ وہی ہے یا نہیں۔ نہ ماما نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا ورنہ شاید وہ اسے پہچان لیتا۔

میں نے کن انکھیوں سے سونیا کی طرف دیکھا۔ وہ اب سیدھی ہو گئی تھی۔ اب اس کا رخ ماما کی طرف نہیں تھا' نہ چہرے پر ایسے تاثرات تھے کہ وہ اسے پہچان گئی ہے' البتہ اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار ضرور تھے۔ اس نے ایک مرتبہ میری طرف دیکھا اور پھر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ میں سیدھی بیٹھی تھی۔ اچانک وہ میری طرف مڑی اور بولی۔ "تُسی کتھے چلے اوَ؟"

"میں....." میں نے آواز کو ذرا حلق میں پھنسا کر کہا۔ میں خوف زدہ ہو گئی تھی کہ کہیں وہ میری آواز سے نہ پہچان لے۔ اگر اسے ماما پر ذرا بھی شک ہوا ہو گا اور میری آواز بھی پہچانی ہوئی لگی تو وہ ضرور چوکنی ہو جائے گی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ پہلے ہی سے کچھ کر سکے۔

"ہاں جی! میں پوچھیا اے کہ تُسی کتھے چلے او۔ کیڑے پنڈ جانا ہے گا؟" اس نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔

"اسی سعید آباد چلے آں۔ میرے دادے دے کول۔" میں نے اسی پھنسی آواز میں جواب دیا۔ اس طرح بولنے سے میرے حلق میں خراش سی پڑ گئی اور کھانسی زوروں کی اٹھی۔ میرے کھانسنے پر ماما اور بابا دونوں ہی نے مجھے چونک کر دیکھا۔ میں نے جلدی سے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ میں ڈر گئی تھی کہ کہیں ان میں سے کوئی میرا نام لے کر نہ پوچھ لے۔ مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ مجھے بابا کو کہہ دینا چاہیے تھا کہ وہ لاری میں مجھے نام لے کر نہ پکارے یا بات کرے۔ میں کھڑکی کی طرف مڑ گئی۔ دور کسی آبادی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ سونیا میرے کھانسنے کی وجہ سے چپ ہو گئی تھی ورنہ شاید وہ کچھ اور بھی پوچھتی۔ میں جانتی تھی کہ وہ بہت باتونی ہے۔ صرف باتیں کرنے کے لیے ہی اس نے بیگم کو نوکر رکھا ہوا تھا ورنہ وہ کام وام تو کوئی نہیں کرتی تھی۔ سونیا کی غیر موجودگی میں سونیا ہی کی طرح حکم چلایا کرتی تھی۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ وہ اس وقت اس کے ساتھ نہیں تھی۔

"سعید آباد آنے لگا اے۔" وہ زیر لب بڑبڑائی مگر آواز اتنی تھی کہ مجھے صاف سنائی دے گئی۔

میں گھبرائی۔ میں نے اسے یہی کہا تھا کہ ہم سعید آباد جا رہے ہیں' اس لئے اسے یوں کہا تھا کہ میں اپنے گاؤں کا نام نہیں لینا چاہتی تھی۔ یہاں مجھ سے بے وقوفی ہو گئی۔ مجھے اپنے گاؤں سے بھی آگے کسی گاؤں کا نام لینا چاہیے تھا۔ اب بابا کو بھی بتانا ضروری تھا کہ اسے سعید آباد پر کوئی ایسی بات کہنا ہے کہ وہ مطمئن ہو جائے مگر بابا بے خبر سو رہا تھا۔ ماما بھی اونگھ میں تھا۔ میں نے جھانک کر بابا کی طرف دیکھا تو سونیا نے بھی میری نگاہوں کا تعاقب کیا۔

"او بڈھا تیرے نال اے؟"

میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں اور کہوں کہ اسے یوں بدتمیزی سے بابا کو بڈھا کہنے کی ہمت کیسے ہوئی' وہ بزرگ بھی تو کہہ سکتی تھی مگر ان لوگوں نے غریبوں کو اس قابل سمجھا ہی کب تھا کہ انھیں احترام سے مخاطب کرتے۔ مگر میں نے خود پر قابو پائے

رکھا اور بولی۔ ”او میرا ابا ہے۔ بیمار اے جی! آکھ دا سی پہلوں چاچا کول چل....؟ ہن پتا نہیں کتھے چلیا اے' دادے کول کہ چاچے کول....؟ چاچا دا پنڈ تے بہت دور ہے گا۔ مینوں تو اس پنڈ دا ناں بھی نئی ملوم۔“ میں نے اپنی طرف سے بات سنبھال لی۔ پتا نہیں بابا سے بات کرنے کا موقع ملتا بھی کہ نہیں۔

”او جیہڑا تھلے بیٹھا ہے گا' او کون اے؟“ وہ مجھے کرید رہی تھی۔ میرا جی گھبرانے لگا۔ لگتا تھا جیسے اسے شک ہو گیا ہے مگر میں نے بابا کو اپنا باپ بنا کر اچھا ہی کیا تھا۔ اس طرح میرے بارے میں تو اس کا شک ختم ہو جاتا۔

”او..... میرے ابے دے چاچے دا پتر ہے۔“ میں نے کہا اور منہ کھڑکی کی طرف کر لیا۔ اس خوف سے کہ جانے اب وہ کیا پوچھ لے۔

”تیرا ناں کی اے؟“ اس نے پھر سوال کر لیا۔

”صغراں..... صغراں بی بی!“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

”کیہڑے پنڈ دے او؟“ وہ جونک بن کر چمٹ گئی تھی۔ میرے اعصاب اکڑ کر رہ گئے تھے۔ میں تو اسے اذیت دینا چاہتی تھی مگر وہ پھر مجھے اذیت میں مبتلا کر رہی تھی۔

”سید سیال دے۔“ میں نے فاطمہ کے گاؤں کا نام لیا۔ یہ فاطمہ دینو کی بہن تھی۔ یہ وہی فاطمہ تھی جس کے خاوند کو اس چوہدری نے مارا تھا جسے میں موت کے گھاٹ اتار چکی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ سونیا خاموش رہے۔ میں سوچنا چاہتی تھی کہ اس سے کیسے بدلہ لوں' کیسے اسے لاری سے نیچے پھینکوں' کیسے اس کی کچلی ہوئی لاش دیکھوں مگر وہ مجھے لمحہ بھر بھی سکون سے سوچنے نہیں دے رہی تھی۔ میں نے سوچا کاش اس وقت میرے ساتھ کادا ہوتا۔ میں اسے بتاتی کہ یہ وہی سونیا ہے جس نے میرے بال کھینچے تھے' میرے رخساروں پر طمانچے مارے تھے۔ اسی نے میری ماں کو بھوکا رکھ رکھ کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اسی نے جرم کا طوق میرے گلے میں ڈال دیا تھا' تو وہ اسے اٹھا کر چلتی گاڑی سے نیچے پھینک دیتا۔ یا اس کے بال پکڑ کر اسے لاری سے نیچے اتارتا اور اس کے رخساروں پر بھی اتنے طمانچے مارتا کہ وہ ساری عمر تکلیف سے تڑپتی رہتی مگر..... اس وقت میرے ساتھ بوڑھا بابا تھا یا لاغر اور بیمار ماما۔ دونوں کے بازوؤں میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ سکتے۔ پیروں میں اتنا دم نہ تھا کہ کسی سہارے کے بغیر کھڑے ہو

سکتے۔

اچانک گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ بابا اور ماما اس جھٹکے کی وجہ سے چونک کر سیدھے ہو گئے۔ ”تہاڈے کول پانی نہیں اے گا؟ سخت پیاس لگی اے۔“ سونیا نے مجھ سے پوچھا۔

”میں ابے نوں آکھنی آں' او تھلے جا کے لیا دے گا۔“ میں جلدی سے بابا کے پاس پہنچ گئی۔ میں نے بابا سے کہا کہ مجھے پیاس لگی ہے۔ لاری جس جگہ رکی تھی' وہاں ایک چھوٹا سا ہوٹل بھی تھا۔ وہ اور ماما دونوں کھڑے ہو گئے۔ ماما نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے بھوک لگی ہے یا نہیں ہمیں سارا دن ہو گیا تھا۔ سویرے بھی ہم نے صرف چائے پی تھی۔ بابا نے پچھلے اڈے پر روٹی کھالی تھی مگر مجھے اس وقت بھوک نہیں تھی۔ اب بھوک سے پیٹ میں گولے سے اٹھ رہے تھے۔ میں نے بابا سے کھانے کو بھی کہا اور اس کے ساتھ ہی لاری سے نیچے اتر آئی۔

”توں بیٹھ' میں ادھر ہی روٹی لے کے دینا۔“ ماما نے کہا تو میں نے اس کا ہاتھ دبا دیا۔

”نئی میں نے بھی چلنا اے۔“

”آجا..... آ پتر۔“ بابا نے فوراً کہا۔ میں چاہتی تھی کہ ہم جلد از جلد لاری سے دور ہو جائیں' کہیں بابا یا ماما میرا نام نہ لے لے۔ میں جلدی جلدی آگے بڑھ گئی۔ ماما ہوٹل کی طرف چلا گیا۔ میں بابا کے ساتھ ایک درخت کے نیچے جا بیٹھی۔ یہ درخت لاری سے اتنی دور تھا کہ ہماری آواز سونیا تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ لاری کے بہت سے لوگ اتر کر ہوٹل کے سامنے پڑی منجھیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ سونیا سیب کھا رہی تھی۔ وہ یہاں سے صاف نظر آ رہی تھی۔ میں بابا کو لے کر ایسی جگہ آ بیٹھی تھی جہاں سے میں بابا کو اس کی شکل دکھا سکوں پھر میں نے دھیمی آواز میں بابا کو بتایا کہ وہ سونیا ہے۔ وہ یہ سن کر اچھل پڑا۔

”توں..... توں پھر اس کے نزدیک کیوں بیٹھی اے۔ وہ پہچان گئی پتر تو..... تو وہ تو جاتے ہی چوہدری کو بتا دے گی۔ تُو نے کچھ کہا تو نئیں؟“

”میں پاگل تو نئیں ہوں بابا! میں نے تو اس سے بدلی ہوئی آواز میں بات کی ہے۔ بس مجھے تو مامے کی فکر ہے' وہ اسے نہ پہچان لے۔“ میں نے کہا اور پھر اسے وہ ساری

باتیں بتا دیں کہ جو میں نے اس سے کی تھیں۔ میں نے اسے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ گاؤں کے لاری اڈے پر نہ اترے بلکہ ہم گاؤں کے آخری سرے پر اتریں گے۔ وہ یقیناً لاری اڈے پر اترے گی۔ اتنے میں ماما بھی روٹی لے آیا۔ میں نے ماما کو اس طرح بٹھایا کہ لاری کی طرف اس کی پشت رہے۔ پھر اسے بھی سب کچھ بتا دیا۔ یہ سنتے ہی کہ میرے ساتھ بیٹھی وہ گوری اور موٹی سی عورت چوہدرانی سونیا ہے وہ تپ کر انگارہ جیسا ہو گیا۔

"ماما کیا وہ تجھے پہچانتی ہے؟" میں نے پوچھا تو وہ چونک اٹھا۔

"پتا نہیں پتر! میں آیا تو تھا۔ جب چوہدری نے مجھے بلا کر آپاں کی موت کی خبر دی تھی اور تیرے خلاف میرے کان بھرے تھے' اس وقت وہ بھی آ گئی تھی۔ اسی نے بتایا تھا کہ بھا غلام حسین آپاں سے اور پھر تجھ سے دھندا کرانا چاہتا تھا۔ یہ اذیت ناک جھوٹ اسی حرامزادی نے بولا تھا۔ میں..... میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔"

"سن..... سن تُو کچھ نہیں کرے گا۔" ایک دم بابا بول اٹھا۔

"نہ ماما..... کچھ کرنا نہیں ہے۔ ہمیں پہلے کادے کو تلاش کرنا ہے۔ اگر ہم نے اسے ابھی نقصان پہنچایا تو ہم گاؤں نہیں جا سکیں گے' کادے کو تلاش نہیں کر سکیں گے۔ خدا ہمیں پھر یہ موقع دے گا ماما۔ تجھے کیا پتا کہ اسے یہاں دیکھ کر میرے دل پر کیسے تیر چلے ہیں۔ اس نے مجھے اور اماں کو کیسی کیسی اذیتیں دی ہیں۔ اسے تو دیکھتے ہی میرا جی چاہتا تھا کہ چلتی لاری سے نیچے پھینک دوں۔ مگر..... مگر یہ عقل مندی نہیں ہے۔ بس تُو اب ایسے بیٹھنا کہ اس کی نگاہ تیرے چہرے پر نہ پڑے اور ہاں سن! بابا تُو بھی سن' میرا نام بھولے سے بھی نہ لینا' میں نے اسے اپنا نام صغراں بی بی بتایا ہے۔ اگر اس نے میرا نام سن لیا تو شاید وہ میری شکل دیکھے بغیر ہی پہچان لے۔"

باتوں کے دوران میں ہم روٹی بھی کھاتے رہے۔ اس دوران میں' میں نے بابا کے ہاتھ اسے پانی بھی بھجوا دیا تھا۔ کافی لوگ کھانے پینے سے فارغ ہو کر لاری میں جا بیٹھے تھے۔ البتہ لاری کا ڈرائیور' کلینر اور کنڈیکٹر منجھی پر لیٹے بیڑی کے لمبے لمبے کش لے رہے تھے۔ ماما نے چائے کا بھی کہہ دیا تھا۔ ہوٹل والا لڑکا چائے لے آیا۔ ہم چائے پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ ڈرائیور اٹھ کھڑا ہوا تو کنڈیکٹر نے آواز لگائی کہ لاری چلنے کو تیار ہے۔

"زینو! اس کے نزدیک نہ بیٹھ۔ وہ ڈائن تجھے کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔" ماما نے مجھ

سے کہا۔

"نہیں ماما' وہ مجھے نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ اس نے تو جو نقصان پہنچانا تھا' پہنچا لیا۔ اب..... اب میری باری ہے۔" میں نے کھڑے ہوئے ہوئے کہا اور بابا کو پھر یاد دلایا کہ گاؤں کے لاری اڈے پر نہیں اترنا ہے۔

ہم لاری میں جا بیٹھے۔ بابا خوف زدہ تھا۔ اس بار اسے اونگھ نہیں آئی بلکہ وہ چوکنا بیٹھا رہا۔ سونیا پھر مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ وہ اب مجھے بتا رہی تھی کہ وہ چوہدری کی بیوی ہے۔ اس نے پہلی بار لاری پر سفر کیا ہے۔ اس کا باپ اپنے گاؤں کا نمبردار ہے۔ اس کا بھائی سعودی عرب سے آ رہا ہے۔ وہ اس کی شادی کے لیے خریداری کرنے شہر جائے گی وغیرہ وغیرہ۔ میں سب کچھ سنتی رہی۔ میں تو صرف اتنا جاننا چاہتی تھی کہ وہ شہر کب' کیسے اور کس کے ساتھ جائے گی۔ میں نے بہانے بہانے سے اس سے کئی باتیں اگلوا لیں۔ جن سے پتا چلا کہ وہ اگلے ہفتے ہی ڈرائیور کے ساتھ میکے جائے گی۔ اس نے بتایا کہ اس کا شوہر شکار پر گیا ہوا ہے' اسی لیے اسے اکیلا جانا پڑے گا۔ بچے وہ میکے ہی میں چھوڑ آئی تھی۔ گویا اس ہفتے میں وہ حویلی میں تنہا ہو گی۔ چوہدری نیاز اکثر شکار پر جایا کرتا تھا اور ہفتے دس روز بعد ہی لوٹتا تھا۔ اس سے بہترین موقع کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں یہ بھی پوچھ لیا کہ وہ اکیلی شہر جا کر خریداری کرنے کی بجائے اپنے کسی نوکر یا نوکرانی کو کیوں نہیں لے جا رہی۔ زمانہ بہت خراب ہے اور شہر میں تو سنا ہے کہ قدم قدم پر لٹیرے ملتے ہیں۔ یہ سن کر اس نے بتایا کہ اس کی نوکرانی ہے بیگم' مگر پچھلے دنوں حویلی میں آگ لگ جانے کی وجہ سے اس کی دونوں ٹانگیں بری طرح جھلس چکی ہیں۔ وہ چلنے کے قابل نہیں رہی' ورنہ وہ ہمیشہ اسی کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ اب میں اس سے مکمل معلومات حاصل کر چکی تھی۔ میرا سارا خوف ہوا ہو چکا تھا۔ میں خود کو بہت خوش محسوس کر رہی تھی۔ میں سوچ چکی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اب رات ہو چکی تھی۔ ہمارا گاؤں آنے ہی والا تھا۔ لاری کے مسافر کم ہو چکے تھے۔ ماما اور بابا دونوں چوکنے انداز میں بیٹھے تھے۔ البتہ ماما ایسے رخ پر بیٹھا تھا کہ اس کا چہرہ سونیا کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔

لاری کی رفتار تیز تھی۔ دور سے روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ میرے گاؤں کی روشنیاں تھیں۔ میں بڑے اشتیاق سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ میں جانتی تھی کہ اب

لاری گاؤں کے اندر والی کچی سڑک پر مڑ جائے گی جو آگے سے گول گھوم کر پھر پکی سڑک سے جا ملتی ہے۔ اس سڑک پر چاچا موہن لال کا ہوٹل اور سرائے ہے' یہ بچپن میں ہمیں کھٹی میٹھی گولیاں دیا کرتا تھا۔ پھر موچی شاہ کا کا' کا کھوکھا آئے گا۔ وہی شاہ کا کا جو عرصہ پہلے مر چکا تھا اور جس کو میں نے چوہدری فیاض کے بیٹے کے سامنے اپنا ماما بتایا تھا۔ آگے چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں' انھی میں ایک ہوٹل چاچے گل محمد کا بھی ہے جہاں بابا بلانا غہ جایا کرتا تھا اور اونچے اونچے قہقہے لگایا کرتا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات تھی جب بڑا زمیندار زندہ تھا اور بابا کے چہرے پر خون چھلکتا تھا۔ آنکھیں چمکتی تھیں اور وہ چائے کا گھونٹ لے کر بیڑی کا لمبا کش لگا کر دھوئیں کے گول گول لچھے بنایا کرتا تھا۔ میں اس کے منہ سے یہ گول گول دھویں کے دائرے نکلتے ہوئے بڑی حیرانی سے دیکھا کرتی تھی۔ میں یہ سب سوچ رہی تھی کہ لاری کچی سڑک پر مڑ گئی۔ جھٹکے لگنے لگے تو سونیا بڑبڑانے لگی۔ اس بے چاری کو بھلا جھٹکے لگے ہی کب تھے کہ برداشت کرتی' اس نے تو ہمیشہ کار کی نرم ملائم اور اچھلنے والی سیٹوں پر سفر کیا تھا جو اچھلتی بھی تھیں تو لگتا تھا دریا کی بہتی موجیں ہیں۔ یہاں لاری میں لگنے والے جھٹکے تو اس کا دم الٹے دے رہے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سیٹ کے سامنے والے ڈنڈے کو پکڑے بیٹھی تھی۔ اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا جیسے اس کے پیٹ میں سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا ہو۔ بڑی دیر بعد یہ جھٹکے رکے اور لاری اڈے پر رک گئی۔ لاری کے رکتے ہی میں نے کرمو کو آگے بڑھتے دیکھا' یہ چوہدری نیاز کا نوکر تھا جو حویلی کے چھوٹے موٹے کام کیا کرتا تھا۔ وہ ذرا بھی نہ بدلا تھا' حتیٰ کہ اس کا قد بھی اتنا کا اتنا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور سونیا کو دیکھتے ہی سلام کیا۔

"اے چک۔ اُتے ٹپچی کیس اے گا۔ اے لے۔ پھڑ۔" وہ مختلف تھیلے اور ٹوکریاں اسے پکڑا رہی تھی جنہیں وہ لاری سے نیچے رکھتا جا رہا تھا سامان اتروا کر وہ بھی اپنی چادر سنبھالتی ہوئی اتر گئی۔ میں نے دور کھڑی اس کی گاڑی دیکھ لی تھی۔ میں نے بابا سے کہا کہ وہ بھی یہیں اتر جائے کیونکہ وہ تو کار میں چلی جائے گی۔ میرا خیال تھا کہ اسے ہم پر ذرا بھی شک نہیں ہوا تھا۔ اس کی گاڑی کے جاتے ہی ہم لوگ اتر گئے۔ ماما نے تانگا لے لیا اور اسے نہر والے پل سے ہو کر خالہ فاطمہ کے گھر جانے کی ہدایت کی۔

تانگے میں بیٹھتے ہی مجھے پھر کادے کا خیال آ گیا ورنہ سونیا کی قربت نے تو مجھے سب

کچھ بھلا ہی دیا تھا۔ میں دعا کرنے لگی کہ کادا مل جائے یا خالہ فاطمہ یہی بتائے کہ وہ آیا تھا اور پھر آئے گا۔ تانگا جوں جوں میری گلی کی طرف بڑھ رہا تھا' خوشی سے میرا دل بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ گاؤں میں لوگ سر شام ہی گھروں میں دبک جاتے ہیں اور آج کل تو سردیاں بھی شروع ہو چکی تھیں۔ ہم پُل پر پہنچے تو چار پانچ کتے ہمارے تانگے کے ساتھ بھاگنے لگے۔ وہ بری طرح بھونک رہے تھے۔ تانگے والا کبھی کبھی ان کی طرف بھی چابک گھما دیتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ پیچھے رہ گئے۔

ہم اپنی گلی کی نکڑ پر ہی اتر گئے۔ ماما نے تانگے والے کو کرایہ دیا اور ہم تیز قدم اٹھاتے ہوئے اگلی گلی میں داخل ہو گئے' ایسا ہم نے احتیاطاً کیا تھا تاکہ اگر کوئی خالہ فاطمہ کے گھر کی نگرانی کر رہا ہو تو ہم اسے دیکھ سکیں مگر گلی سنسان پڑی تھی۔ ہم دوسری طرف سے گھوم کر پھر اسی گلی میں داخل ہو گئے۔ فاطمہ خالہ کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ میں بابا کے کہنے پر دیوار کی آڑ میں کھڑی رہی۔ بابا نے آگے بڑھ کر در بجایا۔ تھوڑی ہی دیر میں خالہ کی آواز آئی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ در پر کون ہے۔ بابا کی آواز سن کر اس نے جلدی سے در کھول دیا۔ بابا نے مجھے اشارہ کیا اور میں جھپاک سے اندر داخل ہو گئی۔ میرے پیچھے ماما اور بابا بھی اندر آ گئے اور بابا نے جلدی سے کنڈی چڑھا دی۔

فاطمہ خالہ مجھے دیکھ کر لپٹ گئی۔ وہ مجھے پیار کرتی جا رہی تھی اور روتی جا رہی تھی۔ مجھے دیکھتی اور پھر لپٹ جاتی۔ مجھ سے معافی مانگ رہی تھی کہ صرف اس کی وجہ سے ایسا ہوا۔ وہ فضلو سے ساری کہانی سن چکی تھی۔ میں نے اسے خود سے الگ کیا۔ اس کے آنسو پونچھے اور کادے کے بارے میں پوچھا۔

"ہاں وہ آیا تھا۔ کل رات ہی کو آ گیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کا بابا تجھے لینے گیا ہے۔ وہ بہت خوش تھا۔ کہتا تھا آج پھر آئے گا۔ تُو بیٹھ..... روٹی شوٹی کھا لے۔ کادا بالکل ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔" خالہ فاطمہ مجھے تسلی دے رہی تھی۔ کاکا بھی اٹھ کر ہمارے پاس آ گیا تھا۔ بابا منجھی پر ڈھے گیا۔ کاکا پانی لے آیا۔ میں نے پانی پیا۔ کادے کی خیریت سن کر میرے اندر ڈھیروں اطمینان اتر گیا تھا اور یہ سن کر کہ وہ آنے والا ہے' میں خوش ہو گئی تھی۔ میں نے کالی چادر اتار کر رسی پر ڈالی ہی تھی کہ اچانک دروازہ زور سے بج اٹھا۔ ہم سب ہی اچھل پڑے۔ میں دروازے کی طرف لپکی کہ شاید کادا آ گیا مگر

خالہ فاطمہ نے جھپٹ کر مجھے پکڑ لیا۔ اسی وقت باہر سے ایک گرج دار آواز سنائی دی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

میں گھبرا کر کمرے کی طرف لپکی' ماما اور بابا بھی چونک اٹھے تھے۔ خالہ فاطمہ کا رنگ سفید ہو چکا تھا پھر بھی اس نے چلّا کر پوچھا۔ "کون اے؟" اسی دوران میں اس نے ہمیں اندر کوٹھڑی میں چلے جانے کا اشارہ کیا۔ بابا میرا ہاتھ پکڑ کر کوٹھڑی میں گھس گیا۔ ماما بھی ہمارے پیچھے تھا۔ خالہ فاطمہ کا بیٹا فیکا بھی اٹھ کر دروازے پر پہنچ گیا۔

"در کھولو۔" باہر سے وہی گرج دار اور بھاری سی آواز سنائی دی۔

میں کوٹھڑی کے دروازے سے باہر جھانک رہی تھی۔ بابا نے مجھے وہاں بچھی منجھی کے نیچے لٹا دیا اور خود وہ دونوں وہاں رکھے ٹین کے بکسوں کے پیچھے کو ہو گئے تھے۔

میں نے دیکھا کہ یہ آواز سنتے ہی خالہ فاطمہ بوکھلا گئی تھی۔ فیکے نے آگے بڑھ کر در کھولا۔ اس کے پیچھے خالہ فاطمہ کھڑی لرز رہی تھی۔ "کون اے جی؟" فیکے نے بڑی دلیری سے پوچھا۔

"تیرے گھر میں مرد کوئی نئیں اے؟" آنے والے کے انداز سے پتا چل رہا تھا کہ اس کا لہجہ تیز ہے یا وہ غصے میں بول رہا ہے۔

"ہاں' میں ہوں ناں' بول۔" فیکے نے بلا جھجک کہا۔ جس پر آنے والے نے اونچا قہقہہ لگایا۔

"او توں..... توں مرد اے؟" وہ یہ کہہ کر پھر ہنس پڑا۔

"بولو جی بات کیا ہے؟" خالہ فاطمہ شاید اس کے ہنسنے سے حواسوں میں آچکی تھی۔

"تمہارے جتنا اونچا تو کوئی مرد نئیں اے' یہ میرا پتر اے' پر تم کون ہو؟ اس پنڈ کے تو نئیں لگتے۔"

"تو کیا تھانیدارنی لگی ہوئی ہے اس پنڈ کی؟" اس بار لہجے میں تلخی تھی۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ اب تک تو میں سمجھ رہی تھی کہ شاید بات خطرے کی نہ ہو۔

"نہ جی نہ..... ہم گریب لوگ ہیں۔ آپ حکم کرو جی!" خالہ فاطمہ نے فوراً کہا۔

"فاطمہ ناں اے تیرا؟" اس نے پھنکارتے ہوئے پوچھا۔

"آں..... ہاں..... ہاں جی میرا ہی ناں اے پر ہوا کیا ہے؟" اب خالہ فاطمہ کی

حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ اس نے در کا پٹ زور سے تھام رکھا تھا۔ فیکا بھی یوں گردن اٹھائے کھڑا تھا جیسے فضا میں خطرے کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"سویرے چوہدرانی کی حویلی میں چلی آنا..... میں اس ویلے تو....."

اتنا سنتے ہی وہ لرز اٹھی۔ ضرور کوئی نہ کوئی بات تھی ورنہ.....

"چوہدرانی سونیا جی!" خالہ فاطمہ کی کمزور سی آواز نکلی اور میں پھر اس طرف متوجہ ہو گئی۔

"ہاں! وہ آج ہی واپس آئی ہے۔ بیگم کی حالت ٹھیک نئیں ہے۔ چوہدری جی بھی نہیں ہیں اس لیے اس نے بلایا ہے۔ وہ یہاں دو تین دن رہے گی۔ باہر تو ہم لوگ ہیں پر وہ اکیلی ہے۔ تو سویرے ہی چلی آنا۔" اس بار بھی اس کا انداز اکھڑا ہوا تھا مگر یہ بات سن کر میری جان میں جان آئی تھی۔ جس خطرے کا احساس مجھے ہوا تھا کم از کم وہ بات نہیں تھی۔

"اچھا جی..... میں تو اسی ویلے چل دیتی پر یہ پتر....." اس نے فیکے کی طرف اشارہ کیا۔ "کلا ڈردا ہے ناں جی' پر سویرے میں آجاؤں گی۔" خالہ فاطمہ کی آواز کچھ بہتر ہو گئی تھی۔ خوف زدہ چہرہ بھی اصلی حالت میں آگیا تھا بلکہ اب اس کے ہونٹوں پر ایک دم ہی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ "وہ تو جی ساڈی مائی باپ ہیں۔" خالہ نے چاپلوسی کی۔

"ٹھیک اے' ٹھیک اے پر یہ مرد کلا ڈردا اے؟" اس نے فیکے کے سینے پر انگلی ٹھونک کر قہقہہ لگایا۔ اس کا ہاتھ مجھے نظر آیا تھا جبکہ وہ در کے پیچھے تھا۔ میں نے ذہن پر زور دے کر آواز پہچاننے کی کوشش کی مگر کچھ یاد نہ آیا۔

پھر وہ چلا گیا۔ خالہ نے جھپٹ کر کنڈی چڑھائی اور بھد سے زمین پر بیٹھ کر سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ فیکا جو اس وقت بڑا بہادر بنا کھڑا تھا' وہ اب فق ہو گیا تھا۔ میں تیزی سے باہر آئی۔ بابا اور ماما بھی باہر آگئے۔ میں نے مٹکے سے پانی نکالا اور خالہ کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ وہ بہت زیادہ گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو میرا دل پھٹنے لگا۔ اس کی بوڑھی اور گہری آنکھوں میں بلا کا خوف تھا۔

"خالہ!" میں نے دھیرے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"پتا نئیں کیوں بلایا اے.....؟" وہ پھٹی پھٹی آواز میں بولی۔ "او پتا نئیں کون سی۔ پہلے تو نئیں دیکھا میں نے۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔

"خالہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ اکیلی ہے۔" پھر میں نے اسے بتایا کہ وہ مجھے لاری میں ملی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ بیگم بیمار ہے اور چوہدری شکار پر گیا ہوا ہے۔"

"پر بال بچے تو ہیں حویلی میں' وہ کلی کیسے ہوئی؟" خالہ کو یقین نہیں آیا تھا تھا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ وہ اس کے بھائی کی شادی میں گئے ہوئے ہیں۔

میری پوری بات سن کر اسے کچھ تسلی ہوئی۔

بابا اور ماما اس کی حالت دیکھ کر پریشان تھے۔ "آپاں! تو میرے نال میرے گاؤں چل۔" ماما ایک دم بول اٹھا۔

"نہ ویرا' اپنی مٹی پر پڑے لہو کے کترے بھی مہک دیتے ہیں۔ یہ چھوڑ کر بھلا اب اس عمر میں کتھے جاواں گی۔ عمر کی یہ کھائیاں تو پاٹنی ہی پڑتی ہیں۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"تو یہاں..... اس خوف اور عذاب میں کب تک زندہ رہے گی خالہ! چل..... یہاں سے چل۔ ساری ہی زمین اپنی ہوتی ہے۔ ہر جگہ کی مہک من میں بس جاتی ہے۔" میں نے اس کے ماتھے پر آئی لٹ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں اماں..... یہاں تو چوہدری نیاز نہ رہا تو چوہدری ایاز آ جائے گا۔ وہ اپنے باپ سے دو ہاتھ آگے ہے۔" فیکا فوراً چہک اٹھا۔

"تو چپ کر پتر.....!"

"ٹھیک تو کہتا ہے۔ کادا آ جائے تو ہم سب یہاں سے چلتے ہیں۔" بابا نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

"سویرے تو جانا ہی ہو گا۔" وہ بڑبڑائی۔

تبھی ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے دماغ میں لپکا۔

"خالہ مجھے بھی ساتھ لے چل۔ سویرے میں بھی تیرے ساتھ چلوں گی۔"

وہ یہ بات سن کر اچھل پڑی۔ اس نے دو ہتھڑ مجھے جڑ دیے۔ "جھلی ہوئی ہے شیر کی کچھار میں جائے گی؟ زینو..... زینو خدا کے واسطے تم لوگ چلے جاؤ۔ دنیا اس گاؤں پر ختم تو نہیں ہو گئی ہے ناں۔ تم شہر چلے جاؤ۔ وہاں یہ چوہدری نیاز کچھ نئیں کر سکتا۔ تو فیاض چوہدری کے پاس چلی جا۔ وہاں کیوں نہیں جاتی؟"

"جاؤں گی خالہ! پر یہ اتنے سارے دنوں کا حساب کس سے لوں گی؟ ان کا سود تو چوہدری نیاز اور چوہدرانی سونیا ہی دے سکتے ہیں ناں۔"

"کرم دین۔ اس کے سر سے یہ سودا نکال کیوں نہیں دیتا تو؟" وہ پلٹ کر بابا پر برس پڑی۔

"کہنے دے اسے۔" بابا بھی جھنجلا گیا۔ "لہو بڑا گرم ہو گیا ہے اس کا۔" اسے غصہ آ گیا تھا۔ "تو چپ کر کے نہیں بیٹھ سکتی۔ جا بھاجی گرم کر' بھوک سے چکر آنے لگے ہیں۔"

میں سمجھ گئی کہ وہ بھی خالہ فاطمہ کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا ہے۔ اس بیچاری پر تو ہماری وجہ سے عذاب ہی آ گیا تھا۔ کچھ بھی ہوتا اسے تو سویرے جانا ہی پڑتا۔ میں چپ چاپ بھاجی گرم کر کے لے آئی۔ ہم سب ہی کی شاید بھوک اُڑ چکی تھی مگر ہم سب نے ایک دوسرے کی وجہ سے روٹی کھالی۔ فیکا ہی تھا جس کی آنکھوں میں کچھ چمک تھی۔ وہ ویسے بھی عمر کی اس منزل پر تھا جہاں حالات کی رنگینی تو جلد سمجھ آ جاتی ہے پر سنگینی جلدی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ جانے کن سوچوں میں روٹی کھا کر منجی پر جا لیٹا۔ رات بھیگ چکی تھی۔ فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ خالہ فاطمہ اب کافی بہتر تھیں۔ بابا اور ماما بھی اسے بتا چکے تھے کہ سونیا واقعی اکیلی ہے' اس کے بال بچے بھی نہیں ہیں اسی لیے اس نے بلایا ہو گا۔ خالہ خود بتا چکی تھی کہ وہ اب سے پہلے بھی کئی بار اسے بلا چکی ہے۔ جب بھی اسے کوئی کام ہوتا تھا وہ اسے یا گوگی کی ماں کو بلا لیا کرتی تھی۔ گوگی ہمارے ہی محلے میں رہتا تھا مگر اب وہ ماں کو لے کر شہر جا چکا تھا۔ ان دونوں سے پہلے اماں تو تھی ہی اس کی نوکرانی۔ سارے کام نمٹا دیا کرتی تھی۔ اس کے بعد اور بیگم کی بیماری کے بعد وہ محتاج ہو کر رہ گئی تھی۔ یوں تو وہ جس کو بلاتی' اسے جانا پڑتا پر اس کا نخرہ بھی تو بہت تھا۔ اسے کسی کا کام کم ہی پسند آیا کرتا تھا۔ میں سوچتی رہی اور دانت کچکچاتی رہی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی رات کی تاریکی میں نکل جاؤں اور حویلی پہنچ کر اسے بھی بالکل اسی طرح مار ڈالوں جیسے اس نے بڑی زمیندارنی کو مارا تھا۔ بابا اور ماما لیٹ چکے تھے۔ لمبے سفر نے ان کے جوڑوں میں درد بٹھا دی تھی۔ وہ دونوں سوئے نہیں تھے مگر گم صم منجھی پر پڑے تھے۔ فیکا سو چکا تھا۔ خالہ فاطمہ چت لیٹی چھت کو تک رہی تھی۔ میں کچھ دیر تک سونیا کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس کا چمک دار گلابی چہرہ آنکھوں میں پھرتا تو اماں کا پیلا اور ہڈیوں بھرا چہرہ' پھٹی پھٹی ویران اور خوف زدہ آنکھیں یاد آ جاتیں۔ ایسے میں جی چاہتا کہ چوہدرانی کا

منہ نوچ لوں۔ اسے جان سے مار دوں اور پھر چیخ چیخ کر لوگوں کو بتاؤں کہ میں نے اپنا انتقام لے لیا۔ میں نے اماں کی موت کا بدلہ لے لیا مگر یہ سب سوچ کر بے بسی سے میرے آنسو نکل آئے۔ میرا ذہن کام نہیں کر رہا تھا کہ آخر میں کیا کروں؟ کبھی سوچتی تھی کہ خدا پر چھوڑ کر یہاں سے نکل جاؤں۔ کبھی سوچتی تھی کہ خوف کی اس دلدل سے باہر نکل کر اسے جان سے مار دوں اور خود کو پولیس کے حوالے کر دوں مگر بابا کی التجا کرتی ہوئی بوڑھی آنکھیں' کادے کی ستاروں جیسی' پیار برساتی نگاہیں یاد آتیں تو لگتا جیسے جسم سے جان نکل گئی ہو۔

☆=========☆=========☆

رات بہت ہو چکی تھی۔ کادا اب تک نہیں آیا تھا۔ سناٹے میں جھینگر اور کتے بول رہے تھے اور اتنے لوگوں کے درمیان میں خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کادا کہاں ہو گا۔ خالہ نے بتایا تھا کہ اس نے اور کرم داد نے ماسٹر دینو اور راجے کو بھی چھڑا لیا ہے۔ جانو تو پہلے ہی کرم داد کے ساتھ فرار ہو چکا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ان لوگوں کو بڑا خطرہ تھا پھر کادا ایسے میں کیسے آئے گا۔ اس خیال نے مجھے اتنا بے چین کر دیا کہ میں اٹھ کر خالہ کے پاس جا بیٹھی۔ وہ مجھے اپنے قریب دیکھ کر چونک اٹھی۔

"کیا بات ہے پتر!" اس نے آہستہ سے کہا۔

"خالہ کادا کیسے آئے گا؟"

یہ سن کر وہ مسکرا دی حالانکہ اس کے چہرے پر دکھ پھیلا ہوا تھا۔ "آ جائے گا پتر! کل بھی تو آیا تھا۔"

"اس نے یہ نہیں بتایا کہ باقی سب لوگ اور وہ کہاں ہے؟"

"سب لوگ گاؤں سے باہر جا چکے ہیں۔ صرف کادا اور کرم داد ہے۔ تو کیوں فکر کرتی ہے جھلی! رب ہے ناں اس کے ساتھ۔"

"پر خطرہ بھی تو بہت ہے خالہ!"

"ہاں خطرہ تو بہت ہے۔ تو بس رب سے دعا کر۔" اس نے مجھے تسلی دی حالانکہ اس کا لہجہ بہت کھوکھلا تھا۔

"زینو پتر! سو جا۔ میں جاگ رہا ہوں ناں..... وہ آئے گا تو تجھے اٹھا دوں گا۔" بابا نے سر اٹھا کر کہا۔

بابا جانتا تھا کہ میں سو نہیں سکتی پھر بھی کہہ رہا تھا کہ سو جا۔ میں دبے پاؤں چلتی ہوئی اپنی منجھی پر چلی گئی۔ نیند زندگی سے سکون کی طرح روٹھ گئی تھی۔ وہ بھلا کہاں آتی۔ ساری رات ہی کروٹیں بدلتے گزر گئی پر کادا نہ آیا۔ سورج کی پہلی کرن زندگی لے کر طلوع ہوتی ہے مگر کسی کسی کے لیے یہ کرن موت کا پیغام بھی لاتی ہے۔ اماں کی موت کے بعد یہ پہلی کرن تھی جو میرے لیے موت کا پیغام لے کر آئی۔

خالہ فاطمہ شاید سوئی ہی نہیں تھی اس لیے کہ اذانوں سے بھی پہلے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے دیوار پر اس کا سایہ دیکھا تو پلٹی۔ وہ سر تھامے بیٹھی تھی۔ میں بھی جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ میں جانتی تھی کہ اسے سویرے ہی حویلی جانا ہے۔ میں نے جلدی سے چائے بنا کر دی۔ نہ معلوم کیوں میرے اندر بلا کی بے چینی تھی۔ ایک عجیب و غریب سا خوف تھا جو مجھے اندر ہی اندر لرزا رہا تھا۔ میں نے فیکے کو بھی اٹھا دیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ خالہ اکیلی حویلی جائے۔ فیکا اٹھ کر آنکھیں ملنے لگا پھر کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ تب میں نے سرگوشی کی۔ "فیکے خالہ کو حویلی جانا ہے نا۔ تو ساتھ جانا۔ پتا نہیں کیا ہو؟"

یہ سنتے ہی وہ اچھل بیٹھا۔ اس نے گھبرا کر یوں خالہ کو دیکھا جیسے اطمینان کرنا چاہتا ہو کہ وہ اب تک بھلی چنگی ہے یا نہیں۔ میں اسے اٹھا کر خالہ کو چائے کا پیالہ تھما کر منہ دھونے لگی۔ اس دوران میں بابا بھی اٹھ گیا۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں رت جگے جمے ہوئے تھے۔ اس نے اب تک جانے کتنی راتیں کادے کے انتظار میں گزاری تھیں۔ مجھے وہ دن یاد آ گئے جب میں بابا کے گھر میں رہ رہی تھی۔ وہ باپ بیٹے کا ہنسی مذاق' وہ ان بوڑھی آنکھوں میں جلتے دیوے۔ وہ کادے کو چھیڑتے ہوئے آنکھوں میں بھری چمک' وہ سب جانے کہاں چلا گیا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں ہی منحوس ہوں۔ میرے قدم نہ میرے ماں باپ کے لیے زندگیوں کا پیغام لائے تھے اور نہ کسی اور گھر کے لیے جہاں میں پہنچی۔

اور اب جانے کیا ہونے والا تھا۔ خالہ کو سونیا نے بلایا تھا۔ اس اطمینان کے باوجود کہ وہ اکیلی ہے۔ اس کی ملازم بیگم پر فالج گر چکا ہے۔ چوہدری نیاز یہاں نہیں ہے۔ میں جانتی تھی کہ وہ شکار کا بہانہ کر کے ملک کاما کے پاس میرا سودا کرنے گیا ہو گا۔ ان ساری باتوں کو جاننے کے باوجود میرا دم سوکھ رہا تھا۔ دل کو دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔ میں رب سے دعائیں کر رہی تھی کہ خالہ آج خیریت سے واپس آ جائے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ خالہ آج خیریت کے ساتھ واپس آ گئی تو

میں جلد از جلد یہ گھر چھوڑ دوں گی۔

اس دوران میں خالہ فاطمہ چائے پی چکی تھی۔ اس کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ فیکے کی آنکھوں میں عجیب سی بے چینی تھی۔ خالہ فاطمہ جانے کو تیار ہو گئی۔ فیکا پہلے ہی تیار تھا۔ میں نے جاتے جاتے اسے اطمینان دلایا کہ سب ٹھیک ہو گا اور وہ خواہ مخواہ گھبرا رہی ہے۔ بابا نے بھی اپنی طرف سے اسے اطمینان دلایا تھا مگر اس کا لہجہ بھی اس کی پریشانی کی چغلی کھا رہا تھا۔

خالہ چلی گئی۔ گھر میں بیکراں سناٹا چھا گیا۔ میں گھٹنوں میں سر ٹکا کر لکڑی کی بلی سے کمر ٹیک کر بیٹھ گئی۔ بابا نماز پڑھ کر چائے پینے لگا۔ ماما اب تک سو رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اب تک کیسے سو رہا ہے؟ پھر خیال آیا کہ اس کے بدن میں اب جان ہی کہاں رہی ہے۔ اتنا لمبا سفر' وہ بھی نیچے بیٹھ کر طے کیا تھا اس نے۔ اس کا تو بدن ٹوٹ رہا ہو گا پھر بھی میں بول اٹھی۔

"بابا ماما کو بھی اٹھا دے۔"

نہ پُتر! تجھے کیا پتا' تُو نہیں تھی تو یہ جھلا کیسا بے کل تھا۔ کبھی اپنی بیوی بچے کو یاد کرتا اور کہتا تھا۔ 'زینو کی ماں نے قسم دی تھی کہ اسے لے کر آنا۔ اب اسے کیسے لے کر جاؤں گا۔ کاکا میری راہ دیکھ لیا ہو گا' اور کبھی تجھے یاد کر کے روتا تھا اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہتا تھا۔ تُو نے وعدہ کیا ہے ہر بے کس کی مدد کا' میرے مولا تُو وعدہ کر چکا ہے۔ دیکھ میری زینو تو بالکل بے آسرا ہے' بے کس اور لاچار ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔" اتنا کہتے کہتے بابا رو پڑا۔ "میرا کادا بھی تو بے آسرا ہے ناں زینو؟ وہ بھی تو بے بس و لاچار ہو گیا ہے۔ اتنا لمبا چوڑا کادا اور ایسا بے بس۔ زینو..... خدا اس کا بھی خیال رکھے گا ناں۔ اس نے وعدہ جو کیا ہے کہ وہ ہر بے کس کا والی ہے۔ ہر بے آسرا کا سہارا اور ہر مجبور کا مددگار ہے۔" اس کی آواز رندھ گئی۔ میلے میلے آنسوؤں کے قطرے اس کے چہرے پر پھیلی لکیروں میں آڑھے ترچھے ہو کر دور تک پھیل گئے۔

میں بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔ "بابا! خدا کے واسطے بابا۔ تم دونوں باپ بیٹے مجھے بھول جاؤ۔ چھوڑ دو مجھے میرے حال پر' سوچ لو کہ میں کبھی تمہیں ملی ہی نہیں تھی۔ تم دونوں لوٹ جاؤ۔ کہیں بھی چلے جاؤ' جہاں چوہدری نیاز تم تک نہ پہنچ سکے پھر!"

"چپ کر جا۔ گالی دیتی ہے ہمیں۔" وہ ایک دم پھٹ پڑا۔ غصے سے اس کی آواز پھٹ گئی مگر اس نے بہت جلدی خود کو سنبھال لیا۔ "ہم مرد ہیں زینو..... ایسی باتیں نہ کیا کر۔ یہ

مردانگی کے لیے گالی ہوتی ہیں۔ جھلی میرے رونے پر نہ جایا کر۔ میں تو..... میں تو باپ بھی ہوں ناں اس کا۔ اسے تو آنکھوں کے سامنے دیوے کی طرح رکھ کر پروان چڑھایا تھا میں نے۔ ہر پل چاروں طرف سے بچاتا تھا کہ کہیں یہ دیوا بجھ نہ جائے۔ اب وہ آنکھوں سے دور ہوتا ہے تو بھول جاتا ہوں کہ میں باپ ہونے کے علاوہ ایک مرد بھی ہوں۔ وہ میرا بیٹا۔ میرا پتر ہونے کے علاوہ چوڑے چکلے شانوں والا جوان گبھرو بھی تو ہے اور مرد کب برداشت کرتا ہے کہ کوئی عورت کی جان کے پیچھے پڑ جائے تو وہ صرف اپنی جان بچا کر بھاگ جائے۔ زینو.....! اس عمر میں تو جوان راہ چلتی غیر عورت کی بے عزتی پر بھی جان دے دیتے ہیں یا چھیڑنے والے کے پیٹ میں چھرا اتار کر جیل چلے جاتے ہیں۔ تُو میرے رونے پر نہ جایا کر۔ کبھی کبھی پاگل ہو جاتا ہوں میں۔ ہو جانے دیا کر' ہر وقت ہوش میں رہنا بھی تو کھلنے لگتا ہے ناں۔ کبھی کبھی آدمی کو پاگل ہو جانا چاہیے۔ بڑا سکون ملتا ہو گا۔"

وہ بول رہا تھا اور میں رو رہی تھی۔ سورج اپنا سر نکال چکا تھا۔ خالہ فاطمہ کو گئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ دھوپ کی کچھ کرنیں ماما کی منجھی تک چڑھ آئی تھیں اور ماما ابھی تک سو رہا تھا۔ میں نے اپنی ہتھیلی سے بابا کی آنکھوں سے بہتے گدلے پانی کے قطرے صاف کیے پھر اپنی چادر کے کونے سے اس کی آنکھیں صاف کیں۔

"تُو ایسی باتیں کرتا ہے بابا تو دل پھٹنے لگتا ہے۔ جی کرتا ہے جا کے راوی میں چھلانگ لگا دوں۔ نہ میں ہوں گی نہ تم لوگوں پر مصیبت آئے گی۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔

"دیکھ زینو! ایک تو تیری کھوپڑی میں میری کوئی بات ہی نہیں سماتی۔ تجھے کتنی دفعہ کہا ہے' سمجھایا ہے کہ آدمی پر آنے والی ہر بلا اس کی اپنی ہوتی ہے اور کیونکہ آدمی' آدمی کے بنا نہیں رہ سکتا' جب کسی کا لطیفہ سن کر اسے ہنسی آتی ہے تو وہ اس کا دکھ سن کر روئے گا بھی تو ناں؟ اچھا چل یہ بتا! میرے رونے پر تُو کیوں رو رہی ہے۔ چل اسے بھی چھوڑ' کادا نہیں آیا تو نہ آئے۔ تجھے کیا؟ تُو کیوں فکر کرتی ہے' کیوں رات بھر سوئی نہیں۔ کیوں کروٹیں بدلتی رہی۔ کیوں بار بار سر اٹھا کر آسمان کی تاریکی کو تکتی رہی بھلا تجھے کیا؟ ہاں بول ناں.....؟"

"وہ..... بس کادا..... وہ بابا تیرے پاس رہی ہوں ناں اس لیے تجھے روتا نہیں دیکھ سکتی۔ اور..... کادا نہیں آیا..... تُو جو پریشان ہے۔ نہیں دیکھی جاتی مجھ سے تیری پریشانی۔ کیا کروں بابا..... نہیں ہوتا مجھ سے یہ سب۔" میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ

اسے کیسے بتاؤں کہ کاداہی تو میرا سویرا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اس نے پہلی واری کہا تھا کہ کاداہی تو میرا سویرا ہے۔ سامنے آجاتا ہے تو دنیا روشن لگنے لگتی ہے۔

"ہاں..... تو تیری اس کھوپڑی میں اتنی بات نہیں آئی کہ آدمی کو آدمی سے انس ہوتا ہے..... ہو جاتا ہے' یہی تو رب کی شان ہے' ورنہ کوئی کلا بندہ دنیا میں کیسے جیتا؟ تو جب کسی کی بات پر ہنسی آتی ہے' کسی کی بات پر رونا آتا ہے تو لگی' کسی کے لیے آدمی جان بھی تو دے دیتا ہے۔ پیار ہو جائے تو اسی بندے کے بنا کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ اب اگر تُو زادی میں جان دے' اور ہم تجھے چھوڑ کر چلے جائیں تو کیا ہو گا؟ چل اٹھ..... جھلی کہیں کی۔ جا چائے بنا لا' مامے کو ابھی اٹھا دے۔ اب تو دن چڑھ آیا ہے۔" اس نے میرے سر پر چپت مار کر کہا۔

"اور ہاں سن! اب اگر تُو نے ایسا کہا ناں تو اسی ویلے اپنے کھبے ہتھ کی یہ انگلی کاٹ دوں گا۔ سمجھی تُو..... تو یہی انگلی ہے۔ پھر دیکھوں گا کہ کیسا لگتا ہے تجھے۔"

اس نے مسکرا کر کہا تھا مگر اس کے لہجے میں اتنی سچائی تھی کہ میرا دل بند ہونے لگا۔ میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں بابا! ایسا نہیں کرنا۔"

"تو تُو بھی ایسا نہیں کرنا۔ بے وقوف کہیں کی۔"

میں آنسو صاف کرتی ہوئی چولھے کے پاس جا بیٹھی۔ آگ بجھ چکی تھی۔ میں نے راکھ کو لکڑی سے کریدا تو چنگاریاں چمک اٹھیں۔ میں لکڑی رکھ کر پھونکیں مارنے لگی۔ حالات مجھے ان سب کی خاطر' ان سب سے دور بھاگ جانے پر اکساتے تھے' بالکل بابا کے آنسوؤں اور خالہ کے چہرے پر جمے خوف کی طرح مگر بابا کی باتیں مجھے نچوڑ کر رکھ دیتی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔

آگ ابھی نہیں جلی تھی۔ دھواں گاڑھا ہو گیا تھا۔ میں زور زور سے پھونکیں مارنے لگی۔ بڑی مشکل سے آگ جلی اور بڑی بھلبھلا کر جلی تو مجھے اماں کا ایک جملہ یاد آگیا۔ اگر کبھی وہ ایسے چنگاریاں پھونکیں مار مار کر آگ کا شعلہ بنایا کرتی تھی' اور دھواں گاڑھا ہو کر شعلوں میں تبدیل ہوتا تھا وہ کہتی تھی۔ "اب ہمارے حالات اچھے ہو جائیں گے۔"

تب میں حیران ہو کر پوچھتی تھی۔ "اماں کیا دھواں گاڑھا ہونے سے حالات بدلتے ہیں۔"

وہ مجھے خود سے لپٹا کر کہتی۔ "او جھلی۔ آگ بھڑکنے سے حالات بدلتے ہیں۔ بالکل بدل جاتے ہیں۔ ہمارے حالات خراب ہیں ناں اس لیے اچھے ہو جائیں گے اور اگر حالات اچھے ہوں گے....."

وہ سہم کر چپ ہوتی تو میں اس کے کندھے پر جھول کر پوچھتی۔ "تو کیا اماں؟"

تب اس کی سہمی سہمی آواز نکلتی۔ "تو حالات خراب ہو جاتے ہیں۔ گاڑھا دھواں آنکھوں میں پانی لاتا ہے۔' پھر بھڑک اٹھنے والی آگ کی لپیٹیں وہ پانی سکھا دیتی ہیں زینو۔ اور ایسا..... ایسا بڑے سکھ کے بعد ہی ہوتا ہے اور بڑے دکھ کے بعد بھی۔"

اور جب اس نے کہا تھا اور رات کو ابا آیا تھا تو اس نے بتایا کہ بڑے زمیندار کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ تب اماں بہت روئی تھی' یوں جیسے بہت گاڑھا دھواں اٹھا ہو اور سارا کا سارا اس کی آنکھوں میں جم گیا ہو۔ پھر..... پھر آگ بھی بھڑکی تھی۔ ابا پکڑا گیا پھر مار دیا گیا۔ اور..... اور پھر اماں کی آنکھوں کا سارا پانی خشک ہو گیا تھا۔ مجھے یہ سب یاد آیا تو دل دھک دھک کرنے لگا۔

"اری پُتر..... چاء بنا رہی ہے کہ دیگ چڑھی ہے۔" بابا نے آواز دی۔ وہ ایک طرف بیٹھا اپنے جوتے کے تلوے میں نکل آنے والی کیل ٹھونک رہا تھا۔

"بس بابا..... پیالے میں ڈال رہی ہوں۔" میں نے جلدی سے پیالے اتار کر چائے اس میں انڈیلی۔ "بابا تُو ماما کو اٹھا دے..... دیکھ تو ساری دھوپ اس پر پڑ رہی ہے اور وہ....."

"ہاں تُو چاء لے آ..... میں جگاتا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ اٹھا اور جا کر ماما کی منجھی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ ماما کروٹ لیے' دیوار کی طرف منہ کیے ایسا بے خبر سویا تھا کہ اب تک ہلا بھی نہیں تھا۔

"ارے اٹھ کم نصیب! دیکھ تو دھوپ سے منجھی کیکر ہو گئی۔ ارے اٹھ....."

اور مجھے یوں لگا جیسے بابا چونک اٹھا ہو۔ اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ میں دونوں پیالے تھامے آہستہ قدم اٹھاتی اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ چائے جو پیالے کے کناروں تک بھری ہوئی تھی کہیں چھلک نہ جائے۔ بابا کو یوں دیکھتے پا کر بھی میں نے جلدی سے نگاہ پیالوں میں پر جمالی۔

"ماما! اتنی نیند کافی ہے۔ اب تو تو کئی راتیں جاگ سکتا ہے۔ اٹھ ماما!" میں نے آگے بڑھ کر ماما کا کاندھا ہلایا۔ وہ یوں ہل کر ساکت ہو گیا جیسے میں نے کسی اکڑی ہوئی شاخ کو ہلا کر چھوڑ دیا ہو۔ بابا پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماما کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"اٹھا ناں اسے بابا۔" میں نے پھر ماما کو چھونے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اسی لمحے دروازہ بول اٹھا۔ میں دروازے پر جاتے جاتے تھم گئی۔ جانے کون تھا اور مجھے یا بابا کو در کھولنا بھی تھا کہ نہیں۔ ابھی میں سوچ رہی تھی کہ فیکے کی آواز آئی۔ میں نے لپک کر در کھول دیا اور منہ کھولے کھڑی رہ گئی۔ میرے سامنے کادا کھڑا تھا۔ فیکا اس کے پیچھے تھا۔

"اندر چل۔" اس نے مجھے دھکا دیا اور تیزی سے اندر آ کر در بند کر لیا۔ فیکے نے کنڈی چڑھا دی۔ میں دم بخود رہ گئی تھی۔ کادا مجھ پر نگاہ جمائے کھڑا تھا۔ میں حیران تھی کہ اتنی روشنی میں کادا یہاں کیسے آ گیا۔ بابا بھی ماما کو چھوڑ کر لپک کر اس کے قریب آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ بابا اس سے لپٹ جائے گا۔ روئے گا یا ہنسے گا مگر بابا اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک طرف کو لے گیا۔ میں حیران ہو گئی۔ بڑا عجیب سا رویہ تھا بابا کا۔ وہ اسے چپکے چپکے کچھ کہہ رہا تھا اور جب کادے نے پلٹ کر میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں ساری دنیا کی وحشت بھر چکی تھی۔ میں چپ چاپ آنکھوں میں ہزار امیدیں جلائے اسے دیکھ رہی تھی اور وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس نے مجھے پہلی بار دیکھا ہو۔ پھر وہ ایک دم میری جانب آیا۔

"کیسی ہے توں!"

"تیرے سامنے ہوں کادے!"

"اب..... اب اگر تو کہیں گئی تو....." اس نے دانت کچکچائے۔

مجھے بہت اچھا لگا۔ جی چاہا پہلے کی طرح وہ آج بھی میرے ہاتھ مار دے پر وہ ایک دم بابا کی طرف پلٹ گیا۔ مجھے لگا جیسے بابا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کچھ کہا ہو۔ اس بار کادے نے میرا بازو پکڑ لیا اور گھسیٹتا ہوا کوٹھڑی میں لے آیا۔ میں سمجھی تھی کہ اب وہ میرے اوپر چلّائے گا۔ مجھ سے پوچھے گا کہ جب وہ یہاں انتظار کرنے کا کہہ کر گیا تھا تو میں یوں گھومنے کیوں نکلی تھی۔ کیوں میں نے دوبارہ ان لوگوں کو چھوڑ دیا تھا۔ مگر اس نے تو کچھ بھی نہ کہا اور اندر جا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ "دیکھ زینو..... ہم یہاں ہیں۔ خالہ کے گھر۔ میں رات کو نہیں آ سکا تھا۔ سویرے سویرے آ گیا تھا پر گلی میں بہت لوگ تھے اور اسی لیے مسجد میں چھپا رہا۔

اب گلی سنسان ہوئی تو آ گیا۔ اگر کسی کو پتا چل گیا کہ ہم یہاں ہیں تو..... تو غضب ہو جائے گا۔ زینو..... رونا نہیں۔ گردش آتی ہے تو آئے ہی چلی جاتی ہے۔ تُو رونا نہیں زینو۔ تجھے..... تجھے میری قسم۔"

اس کی باتیں سن کر ہی میرے آنسو بہنے لگے پر آواز حلق میں گولہ بن کر اٹکی رہ گئی تھی جیسے کسی نے میرے حلق میں نمک کی ڈلی گھسیڑ دی ہو۔ میں چاہتی تھی کہ کادے کے سینے میں چھپ کر چیخیں مار مار کر روؤں' اسے بتاؤں کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ کیسے مجھے ملک کاما کے آدمی اٹھا کر لے گئے تھے۔ اسے بتاؤں کہ میں نے جب در پر اس کی آواز سنی تھی تو میں اسے پکارنا چاہتی تھی مگر..... مگر اس حرامزادے نے اپنا چوڑا چکلا ٹین کے ڈبے جیسا ہاتھ میرے منہ پر جما رکھا تھا۔ پھر اسے یہ بھی بتاؤں کہ رب نے کیسے میرا ساتھ دیا اور میں وہاں سے فرار ہو گئی۔ اس سے پوچھوں کہ اس پر کیا بیتی۔ وہ مجھے کہاں کہاں تلاش کرتا رہا' دینو اور ماجے کو اس نے کیسے چھڑایا مگر وہ تو مجھے چھوڑ کر پھر باہر کی طرف چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے کوٹھڑی کا در بھی بھیڑ دیا۔ میں بیٹھی اپنے آنسوؤں کو حلق میں اتارتی رہی۔ خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کے یوں اٹھ کر چلے جانے پر مجھے غصہ آ گیا تھا۔ کتنا بدل گیا ہے کادا' میں نے حیرت سے سوچا۔ اس کی آنکھوں میں پل بھر کو چمک کر ساری روشنی بجھ گئی تھی۔ تبھی مجھے خیال آیا کہ اس کے پیچھے فیکا بھی تو تھا اور میں نے اس سے خالہ کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ میں نے آنسو اپنی چادر کے کونے سے رگڑ کر صاف کیے اور باہر جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کادے نے کچھ نہیں بتایا تو اب میں بھی کچھ نہیں بتاؤں گی۔ میں نے جھٹکے سے اپنے بال پیچھے کیے جو چٹلے سے نکل کر منہ پر آ رہے تھے اور دروازے کی طرف بڑھی۔

"کہاں جا رہی ہے؟" اسی وقت کادا اندر آ گیا۔ اس کے چہرے پر بڑی وحشت تھی۔ میں ڈر گئی۔

"کیا..... کیا ہوا کادے..... کوئی آ گیا ہے کیا؟ فیکے سے پوچھ خالہ کہاں ہے؟" میں خود گھبرا گئی۔

"نہ..... کچھ نہیں ہوا۔ تُو بیٹھ..... بیٹھ یہاں۔" اس نے پھر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے چارپائی پر بٹھا دیا اور خود بھی پٹی پر ٹک گیا۔

"کیوں..... کیوں بٹھا رہا ہے۔ ابھی ماما اور بابا نے ناشتا بھی نہیں کیا۔ مجھے روٹی بھی ڈالنی ہے۔ تُو بھی تو..... تُو بھی تو بھوکا ہو گا ناں؟" میں پھر کھڑی ہو گئی۔

اس دوران میں وہ مجھے یوں دیکھے گیا جیسے کچھ ہو گیا ہو۔ یا شاید میں پاگل ہو گئی ہوں یا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ "بات کیا ہے کادے۔ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ ایسے کیوں دیکھ رہا ہے؟"

"زینو!" وہ بولا تو اس کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ "زینو! ابھی تیرے دکھ ختم نہیں ہوئے۔ پر دیکھ زینو۔ خدا صبر کرنے والوں کو بہت پسند کرتا ہے۔"

"کادے.....! تُو..... اچھا تو ہے ناں؟" میں نے گھبرا کر اس کے چوڑے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں اچھا ہوں۔" اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میرے اندر میٹھی سی لہر دوڑ گئی۔ "زینو تُو نہیں روئے گی ناں؟ دیکھ اگر تُو روئے گی تو سب کو پتا چل جائے گا کہ ہم یہاں ہیں۔ چوہدری کے آدمی جگہ جگہ ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے اور پولیس بھی۔ تیری آواز باہر گئی تو..... میں پکڑا جاؤں گا۔ سب پکڑ جائیں گے زینو۔"

"پر کادے..... میں..... میں تو نہیں رو رہی۔ اب تو تُو آ گیا ہے ناں' اب میں بھلا کیوں روؤں گی' کادے اب میں تیرے ساتھ چلوں گی۔ یہاں سے کہیں چلتے ہیں کادے۔ ہماری قسمت میں ہو گا تو ہم بچ کر نکل جائیں گے ورنہ..... ہم مقدر بدل تو نہیں سکتے ہاں! سب کچھ بھول جائیں گے کادے۔ میں تو ماما اور بابا کو دیکھ کر چھلنی ہو گئی ہوں۔ اب اور آنسو نہیں دیکھے جاتے مجھ سے' آج بابا تجھے یاد کر کے بہت رویا تھا۔ تبھی میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر اب تُو ہمیں لیے بغیر کہیں گیا تو میں دریا میں کود کر جان ہی دے دوں گی۔ اب اور نہیں سہا جاتا کادے۔ خالہ فاطمہ اور فیکے کو بھی ساتھ لے لیں گے اور....."

"بس کر....." وہ ایک دم ہی چیخ اٹھا۔

میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا تو اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ یوں جیسے اس کی آنکھوں میں سرخ پانی کا دریا بہہ رہا ہو۔

"کک..... کیا ہے؟" میں سہم گئی۔ وہ اب بھی مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اس نے جلدی سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔ ایک بہت گہرا سانس کھینچا اور پھر میرے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے اپنے بڑے بڑے ہاتھوں میں یوں چھپا لیا جیسے میرے ہاتھوں کو یخ بستہ ہواؤں سے بچانا چاہتا ہو۔ "دیکھ زینو! زندگی اور موت پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ یہ سب قدرت کے کھیل ہیں۔" اتنا کہہ کر پھر اس نے سر اٹھا کر پہلے چھت کی طرف دیکھا پھر دوسری جانب رخ کر لیا جیسے اپنے آنسو مجھ سے چھپا رہا ہو۔ میں نے اس پل میں بہت بے چینی اور اضطراب محسوس کیا۔ پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ کادا مجھے بہلا رہا ہے۔ وہ کافی دیر سے کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔

"کادے..... کیا بات ہے؟ ادھر دیکھو۔" میں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر منہ اپنی جانب کر لیا۔ اس کی آنکھیں پانی سے بھرے کٹورے لگ رہی تھیں۔ "کیا بات ہے کادے صاف صاف کیوں نہیں بولتا؟"

"زینو بس تُو رونا نہیں وہ..... وہ ماما..... ماما مر گیا زینو۔"

"کیا.....؟" میں نہ رونے کا وعدہ کر کے بھی چیخ اٹھی تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ میری آواز باہر تک گئی تو غضب ہو جائے گا۔ پھر میں وہاں رکی نہیں' دوڑتی ہوئی کوٹھڑی سے باہر چلی آئی۔ بابا' ماما کی منجھی کے پاس سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا تھا۔ فیکا بھی وہیں تھا' آہٹ پا کر ان دونوں نے میری طرف دیکھا۔ بابا مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکا اور اپنی دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ میں سسکتی ہوئی بابا کی بانہوں میں سما گئی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر روؤں۔ آج ماما بھی مجھے چھوڑ گیا تھا۔ کادا جو اتنی دیر سے مجھے نہ رونے کی تلقین کر رہا تھا اس کے منہ سے ماما کا نام سن کر ہی جیسے میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اب میں سمجھی کہ اس کا رویہ عجیب سا کیوں تھا۔ بابا سمجھ چکا تھا کہ ماما اب کبھی نہیں اٹھے گا۔ اس نے کادے کو آتے ہی بتا دیا تھا اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے سمجھا دے۔ میں بابا کے سینے میں سر چھپائے اپنے حلق سے آنسوؤں کے گولے نیچے اتار رہی تھی۔ واقعی مجھے نہیں رونا تھا۔ اگر میں روتی تو شاید میری آواز پھٹ جاتی۔ میں بال نوچتی ہوئی سڑکوں پر نکل جاتی اور تب کیا ہوتا۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی۔ بابا مجھے دونوں بازوؤں میں بھینچے کھڑا تھا اور وہ بھی اندر ہی اندر رو رہا تھا۔

"پتر..... کیا کروں پتر! اتنا غم' اتنا دکھ تو سہا بھی نہیں جاتا۔ تجھے کیسے کہوں کہ صبر

کر..... کیسے کہوں' میرا تو یہ جھلا کچھ بھی نہ تھا اور کلیجہ کاٹ گیا۔ پر تُو' تو....." بابا سے اور کچھ نہ بولا گیا۔ اس کا پورا بدن ہل رہا تھا۔

میری آنکھوں میں جیسے کسی نے مرچیں بھر دی تھیں۔ اس شفیق سینے سے لگے لگے ہی میں جانے کیا سوچ گئی۔ میرے اندر نفرت کی بھڑکتی ہوئی آگ مجھے بری طرح سلگا گئی میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں ساری دنیا کو آگ لگا دوں یا چوہدری نیاز جیسے سارے چوہدریوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتار دوں۔ یہ سوچ کر ہی میرا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا کہ مامی اور کاکا اب بھی ماما کے منتظر ہوں گے۔

میں بڑی دیر خود کو سنبھالتی رہی' جانے کیسی ڈھیٹ ہو گئی تھی کہ کچھ ہی دیر بعد پھر سنبھل گئی۔ اس دوران میں کادا اور فیکا فق ہوئے بیٹھے رہے۔ ذرا ہوش آیا تو اس خیال نے ڈسنا شروع کر دیا کہ اب کیا ہو گا؟ خالہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ فیکے سے پتا چلا کہ وہ سونیا کے کام کر رہی ہے' اس نے خود ہی فیکے کو گھر بھیج دیا تھا کہ وہ کچھ دیر بعد آ جائے گی۔ اسے تو پتا بھی نہ تھا کہ یہاں ماما ایک لاش میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ابھی تک ویسے کا ویسا لیٹا تھا عجیب بے بسی کا عالم تھا کہ ہم نہ اسے یہاں غسل دے سکتے تھے' نہ دفنا سکتے تھے۔ نہ یہاں سے میت لے جانے کا کوئی انتظام کر سکتے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ کادا بھی سر تھامے بیٹھا تھا۔ شاید وہ بھی یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ میں تو رونا دھونا بھول کر اس پھیر میں پڑ گئی کہ اب کیا ہو گا' جو گھاؤ ماما کی موت نے میرے دل پر لگایا تھا وہ تو اندر ہی اندر مجھے لہولہان کر رہا تھا پر یہاں یوں بے بسی سے بیٹھا رہنا تو ناممکن تھا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماما کو دیکھ رہی تھی جس کے پریشان چہرے پر اس وقت بلا کا سکون تھا۔ لگتا تھا کہ جیسے وہ سو رہا ہے۔ مجھے اس پر رشک آیا کہ وہ کیسے چپکے سے سارے عذابوں سے چھوٹ گیا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ پیچھے والوں کا کیا حشر ہو گا۔ اسے تو یہ بھی فکر نہ ہوئی کہ ہم یہاں اس کی لاش کا کیا کریں گے؟

"میں..... میں جاتا ہوں۔" اچانک کادا کھڑا ہو گیا۔

"کہاں.....؟" میں اور بابا دونوں ہی چونک اٹھے۔ "شاید کرم داد کچھ کر سکے۔ وہ ریلوے کوارٹر میں میرا انتظار کر رہا ہو گا۔" کادے نے چادر کو اپنے گرد لپیٹے ہوئے کہا۔

یہ غنیمت تھا کہ سردی بڑھ گئی تھی۔ وہ اس چادر کو اپنے سر پر لپیٹ کر جا سکتا تھا۔ خطرہ تو اس میں بھی تھا پر کیا کیا جا سکتا تھا۔ "بابا! میں رات ہی کو آؤں گا۔ تم تیار رہنا۔ رکنا نہیں

ہے۔ میں کوئی انتظام کر کے آؤں گا۔ ہم رات ہی کو اس کے گاؤں چلیں گے۔"

اس نے ماما کی طرف دیکھ کر کہا اور مجھے لگا جیسے میرے سینے میں طوفان اٹھنے لگے ہوں۔ میں کیا منہ لے کر جاؤں گی مامی کے پاس.....! اس کی کیا حالت ہو گی..... کاکا تو پاگل ہو جائے گا اور مامی..... میں یہ سوچ کر پھر رو پڑی۔ کادے نے لمحہ بھر کو سلگتی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور فیکے سے کہا کہ وہ ذرا گلی میں نکل کر دیکھے۔ فیکا فوراً ہی باہر چلا گیا۔ اس نے ذرا دیر بعد آ کر کادے سے کہا کہ وہ چلا جائے۔ یہ وقت ایسا تھا کہ سارے مرد کھیتوں پر یا کام پر جا چکے ہوتے تھے اور عورتیں گھر کے کاموں میں مصروف ہوتی تھیں۔ سردی بھی بہت تھی اس لیے گلی کے بچے بھی کم ہی باہر نکلتے تھے۔ کادا رات کو آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی یوں لگا جیسے اکیلا ماما ہی نہ مرا ہو ہم سب ہی مر گئے ہوں۔ فیکا چپ چاپ کھڑا تھا۔ بابا نے اپنی چادر ماما کے منہ پر ڈال دی تھی۔ اس پر پڑا گدیلا اٹھا لیا تھا تاکہ ٹھنڈک ملتی رہے۔ وہ جو گدیلا رات اوڑھ کر سویا تھا وہ کافی گرم تھا۔ رات جانے کب اس کا دم نکلا ہو۔ اسے ہر حال میں ٹھنڈا رکھنا تھا تاکہ رات بلکہ اگلی صبح اس کے گاؤں پہنچنے تک لاش خراب نہ ہو۔

میں اور بابا اس کے سرہانے بیٹھے بے آواز رو رہے تھے۔ میری تو دنیا ہی لٹ گئی تھی۔ وہ واحد اپنا تھا جو اماں کی طرح مجھے بے بسی کے گرداب میں چھوڑ گیا تھا۔ ہوا ٹھنڈی تھی اور ہم کھلے آنگن میں بیٹھے تھے۔ ہمیں نہ سردی لگ رہی تھی اور نہ بھوک یا پیاس کا کوئی احساس تھا۔ ہم یوں بیٹھے تھے جیسے پتھرا گئے ہوں۔ جانے کتنا وقت گزر گیا' سورج کی کرنیں ماما کی منجھی سے ہوتی ہوئی دور دیوار کے کنارے تک پہنچ چکی تھیں۔ اس وقت بابا چونک اٹھا۔ اس نے فیکے کو اشارہ کیا کہ وہ ماما کی منجھی دوسری طرف سے پکڑ کر برآمدے میں لے چلے۔ ایک طرف سے بابا نے منجھی اٹھالی۔ اسے برآمدے میں' سائے میں رکھ کر ہم پھر اس کے سرہانے بیٹھ گئے۔ خالہ فاطمہ آئی تو یوں لگا جیسے یہاں کچھ لوگ زندہ بھی ہیں ورنہ تو جیسے سبھی مر چکے تھے۔ اسے جو ماما کے متعلق پتا چلا تو وہ سکتے میں رہ گئی۔ فیکا اسے جلدی جلدی بتا رہا تھا۔ وہ لپک کر میرے پاس آئی اور مجھے چمٹا کر رو پڑی۔ وہ بے آواز رو رہی تھی اور میں بھی۔ بابا کبھی چپ ہو جاتا اور کبھی سر جھکا کر رونے لگتا۔ اس کا بدن جھٹکے لینے لگتا۔ خالہ فاطمہ یوں ایک ہاتھ اپنے سر پر اور دوسرا ہاتھ میری کمر پر رکھے بیٹھی تھی جیسے لٹیروں نے اس کا گھر لوٹ لیا ہو۔ کیسی بے بسی تھی کہ میرے سامنے میرا ماما مرا پڑا تھا اور میں رو سکتی تھی اور نہ چیخ سکتی

تھی۔ نہ کسی کو بتا سکتی تھی اور نہ ہی اسے چپکے سے کہیں دفنا سکتی تھی۔ اسے مامی اور کاکے کے پاس لے جانا ضروری تھا ورنہ وہ تو ساری زندگی اس کا انتظار کرتے رہتے' میں اگر کلام پاک اٹھا کر بھی بتاتی کہ ماما مر گیا تو دونوں یقین نہ کرتے۔

وہ دن کیسے گزرا اور کتنا کٹھن گزرا' اسے بیان کرنا ناممکن ہے مگر ماما آج بڑے سکون میں تھا اس کے تو جیسے دکھ ہی ختم ہو گئے تھے۔ خالہ فاطمہ سخت پریشان تھی کہ اسے لے جانا بڑی جان جوکھوں کا کام تھا۔ میں بھی سوچتی تھی تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا۔ ابھی مغرب کی اذان ہوئی تھی کہ اچانک دروازے پر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ ہم سب ہی چونک پڑے۔ خالہ فاطمہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی پھر اس نے آگے بڑھ کر در کھولا اور در کھلتے ہی کرم داد اندر آ گیا۔ "چل بابا..... جلدی۔" اس نے دو لفظ کہے اور تیزی سے ماما کی منجھی کی طرف بڑھا۔ شاید اس نے چادر پڑی لاش دیکھ لی تھی۔ میں بھاگ کر کوٹھڑی میں گئی اور کپڑوں کی تھیلی اٹھا لائی۔ بابا بھی کھڑا ہو گیا۔ خالہ فاطمہ نے جلدی جلدی ایک تھیلے میں اپنے اور فیکے کے کپڑے ٹھونسے اور ہمارے ساتھ ہی چلنے کو تیار ہو گئی۔ اتنی دیر میں کرم داد لاش اٹھا کر باہر لے جا چکا تھا۔ میں نے باہر آ کر دیکھا تو یہ پیچھے سے کھلی گاڑی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک انجانا بندہ بیٹھا تھا اور ایک اور آدمی کرم داد کی مدد کر رہا تھا۔ ماما کی لاش کو دونوں سیٹوں کے درمیان رکھ کر ہم لوگ بھی پیچھے بیٹھ گئے۔ میں نے خود کو اچھی طرح چادر میں لپیٹ لیا تھا۔ بابا بھی سر پر پٹکا باندھے اور خود کو چادر میں لپیٹے بیٹھا تھا۔ میں نے خالہ فاطمہ کی طرف دیکھا' وہ بے فکری سے منہ کھولے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے دھواں سا بھرا تھا۔ دھندلائی ہوئی آنکھوں میں بے خوفی اور غصہ تھا۔ لگتا تھا جیسے اس نے بھی خود کو حالات کے دھارے میں چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

گاڑی ایک جھٹکے سے چل پڑی۔ کرم داد آگے بیٹھ گیا تھا۔ میں اس سے کادے کے متعلق پوچھنا چاہتی تھی پر موقع نہ ملا۔ گاڑی چلانے والا گلیوں میں تو آرام سے چلاتا رہا پھر جانے کہاں کہاں سے گھوم کر پکی سڑک پر نکلا تو گاڑی فراٹے بھرنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد اچانک اس نے گاڑی کچے میں اتار دی۔ اس طرف کماد کی فصل کھڑی تھی۔ ایک جگہ اس نے گاڑی آہستہ کی تو کماد کے کھیتوں سے کادا نکل کر سامنے آ گیا۔ اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے گاڑی کی لائٹیں روشن تھیں جس کی روشنی میں' میں اسے دور ہی سے پہچان گئی تھی۔ گاڑی

کے رکتے ہی کادا اچک کر ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ میں ماما کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس کا سر میں نے اپنی گود میں رکھ لیا تھا اور جانے کب سے میری آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کے چہرے پر پڑی چادر کو بھگو رہے تھے۔ اب مجھے کسی کا ڈر نہ تھا۔ میری سسکیاں اونچی ہونے لگیں' خالہ فاطمہ بھی بار بار چپ ہوتی اور بار بار رو پڑتی تھی۔

گاڑی رات بھر چلتی رہی۔ سویرا ہونے سے پہلے ہی ہم ماما کے گاؤں پہنچ گئے۔ سارا گاؤں سنسان پڑا تھا۔ گلی کے کتے ایک دم شور کرتے ہوئے ہمارے ساتھ ساتھ بھاگنے لگے تو ہلچل سی مچ گئی۔ سنسان اور ویران گلیاں ایک دم جیسے بول اٹھی تھیں۔ بابا اور کادا میرے ساتھ یہاں آ چکے تھے۔ گاؤں کے بارے میں شاید کادا کرم داد کو بتا چکا تھا مگر وہ ماما کا گھر نہ جانتا تھا اس لئے وہاں رک کر اس نے کادے کو آگے بلا لیا تاکہ وہ راستہ بتا سکے۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ یہ سوچ کر ہی میرا کلیجہ پھٹنے لگا کہ ماما کا در بجاؤں گی تو مامی اور کاکا سمجھیں گے کہ ماما آ گیا اور جب انھیں پتا چلے گا کہ ماما آیا تو ہے پر بے جان لاش بن کر' تو ان کی کیا حالت ہو گی؟ میں یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس لمحے ساری دنیا ختم ہو جائے۔ قیامت آ جائے اور کسی کو کسی کی خبر نہ ہو۔ میں بھی مامی اور کاکے کو بتانے کے لیے زندہ نہ رہوں کہ ماما مر گیا اور نہ وہ یہ دکھ سہنے کو زندہ ہوں مگر یہ سب ناممکن تھا۔ یہ سب نہیں ہوا اور گاڑی ماما کے دروازے پر تھم گئی۔ کادے نے اتر کر در بجایا۔ بابا نے مجھے سہارا دے کر اتار لیا تھا۔ خالہ فاطمہ مجھے سنبھالے ہوئے تھی ورنہ میری ٹانگوں میں تو دم ہی نہیں رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس نے بازو چھوڑ دیا تو میں ڈھے جاؤں گی۔ کادا در بجا کر گاڑی کی پچھلی طرف آ گیا تاکہ لاش اتار سکے مگر بابا نے اسے منع کر دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گھر سے باہر آتے ہی کسی کی نظر لاش پر پڑے۔ اس نے خالہ فاطمہ کو سمجھا دیا کہ اندر جا کر سنبھال لینا۔ اندر اب تک خاموشی تھی۔ خالہ فاطمہ نے اس بار زور سے دروازے پر ہاتھ مارا تب اندر کچھ ہلچل ہوئی پھر کاکے کی آواز آئی۔

"کون اے؟"

"کھول پتر..... زینو آئی ہے۔" خالہ فاطمہ نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ تبھی میں بھی بول اٹھی۔

"کاکے..... در کھول..... میں ہوں..... زینو۔"

اس نے کھٹکے سے در کھول دیا اور پھر مجھ پر نگاہ پڑتے ہی پکارا۔ "اماں! اٹھ اماں دیکھ کون آیا ہے۔ دیکھ زینو اور بابا آئے ہیں۔"

ایک بگولہ سا میرے سینے سے نکلا اور میں تڑپ کر اس سے لپٹ گئی..... "ہاں کاکے میں ماما کو لے آئی ہوں....."

"ہائے ربا! زینو..... میری دھی..... میری جان۔" مامی چھپاک سے آ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ "مجھے پتا تھا کہ تُو آئے گی۔ تُو خیر سے ہو گی یہ جانتی تھی میں۔ تیرا ماما تو تیرے جانے کے بعد پاگل ہو رہا تھا۔ اسے سب کچھ پتا لگ گیا۔ اتا روتا تھا کہ جانے زینو زندہ ہو گی کہ نہیں۔ پر میں نے کہہ دیا تھا کہ میرا دل کہتا ہے وہ ٹھیک ہو گی....." وہ میری حالت سے بے خبر روتی جا رہی تھی اور کہتی جا رہی تھی۔ کاکا بھی آنکھیں پٹپٹا کر مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ "اور پتا ہے کیا؟" مامی نے میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا پھر آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ "میں نے تیرے ماما کو کہہ دیا تھا کہ تیری وجہ سے وہ اتی دکھی ہوئی ہے' اب تُو ہی اسے لے کر آنا۔ ہم تو تھک گئے تھے انتظار کر کر کے۔"

پھر اسی لمحے اس کی نگاہ خالہ فاطمہ پر پڑی۔ "آؤ جی آؤ بسم اللہ۔" اس نے آگے بڑھ کر خالہ کو سینے سے لگا لیا۔ اس دوران میں شاید کاکا باہر کھڑی گاڑی اور بابا وغیرہ کو بھی دیکھ چکا تھا اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔

"بابا کتھے اے؟" اس کی آنکھوں میں حیرانگی تھی۔

"کاکے ..... وہ..... وہ گاڑی میں۔" اور تب میں برداشت نہ کر سکی۔ ایک طویل اور کرب ناک چیخ تھی جس نے دور دور تک سناٹے کو چیر کر رکھ دیا پھر تو لگا جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ خالہ نے مامی کو بتا دیا کہ ماما اپنے پیروں پر چل کر نہیں آیا ہے۔ مامی کو سکتہ سا ہو گیا۔ وہ یوں سب کو دیکھتی رہی جیسے یہ سب کسی اور کے بارے میں بتا رہے ہوں۔ جیسے مرنے والا اس کا کوئی بھی نہ ہو۔ کاکے کی چیخوں نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورا گھر اس کی چیخوں سے لرزنے لگا۔ سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔

ماما کی لاش جب بیچ آنگن میں منجھی پر لا کر رکھی گئی تو مجھے وہ دن یاد آ گیا جب اسی طرح بابا کی لاش بھی لا کر رکھی گئی تھی' تب اماں مامی ہی کی طرح پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اسی طرح اپنا سر دیواروں سے پھوڑ رہی تھی اور کاکے کی طرح میں بھی ایک کونے میں سہمی بیٹھی تھی اور

اپنے دامن سے آنسو پونچھتی جا رہی تھی۔ وہی قیامت تھی' وہی ہنگامہ تھا۔ مامی کو عورتیں سنبھال رہی تھیں اور کاکے کو میں..... میں مامی کے پاس بیٹھی تھی۔ اچانک مامی پلٹ کر بولی۔ "اسے تو میں نے تجھے لانے کو بھیجا تھا۔ کہا تھا' زینو کو لے کے آنا۔ وہ نہ ملی' اس کے زخموں پر تُو نے مرہم نہ رکھا تو آپاں کی روح کتنی بے چین ہو گی تبھی سے وہ روتا رہتا تھا۔ وہ تیرے گاؤں گیا تھا۔ تجھے جگہ جگہ تلاش کیا اور جب لوٹا تو میں اسے پہچان ہی نہ سکی۔ وہ تو غم کھا کھا کر سوکھ چلا تھا۔ اس کے چوڑے شانے ڈھل گئے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ زینو..... پھر..... پھر اس نے دو دن آرام کیا اور جاتے وقت میں نے کہہ دیا کہ اب کی واری زینو کو لے کر ہی آنا..... مجھے کیا پتا تھا کہ وہ یہ گل جی کو لگا لے گا۔ ارے آ جاتا تو اسے دیکھ تو لیتے۔" مامی یہ کہتے کہتے پھر رو پڑی۔ خالہ فاطمہ کھڑکی سے سر ٹکائے کھڑی تھی۔ میں بھی رو رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کے آنسو صاف کر دیتی اور کبھی پاس رکھا کٹورا اٹھا کر اس کے منہ سے لگا دیتی اور اس کے ہونٹ کچھ تر ہو جاتے۔ یہاں آ کر کچھ بوجھ کم ہو گیا تھا کہ یہاں کھل کر رونے کا موقع تو تھا۔ میں یہاں جی بھر کے' پھوٹ پھوٹ کر اور چیخ چیخ کر روئی تھی اور میرے اندر جمع برسوں کا غبار نکل گیا تھا۔

ماما کی قبر کی پہلی رات ہم سب پر بڑی کٹھن تھی۔ کاکا سوجی ہوئی آنکھوں اور سرخ ناک سے گھر کا سارا انتظام سنبھالے ہوئے تھا۔ میں اسے دیکھ کر ہی حیران تھی۔ وہ بدن اور قد کاٹھ میں ماما جتنا ہی تھا مگر عمر میں بہت چھوٹا تھا' پھر بھی پورے مرد کی سی ذمے داریاں اٹھائے ہوئے تھا۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ ماما نے اسے گھر کے اندر ہی اس کوٹھڑی میں جس کا دروازہ باہر گلی میں نکلتا تھا ایک پرچون کی دکان کر دی تھی۔ جس سے وہ گھر کی دال روٹی نکال لیا کرتا تھا۔ مامی گلے پر شیشوں کا کام اور کڑھائی کر لیا کرتی تھی اور گزارا اچھا ہو جاتا تھا۔ مامی کی ماں جس کے پاس میں بابا اور کاکا ایک بار پہلے آ چکے تھے' وہ اب ویسی لمبی چوڑی نہیں رہی تھی۔ کافی کمزور ہو چکی تھی۔ مامی سے پتا چلا کہ وہ مسلسل بیمار رہی ہے۔ اس وقت تو بیٹی کے سہاگ اجڑنے پر اس کے چہرے پر ہزاروں جھریاں اتر آئی تھیں۔ آنکھوں میں بیٹی کا دکھ دھند کی چادر سی پھیلا گیا تھا۔ اس رات مامی بس ماما کی باتیں کیے گئی۔ پل پل کی باتیں' لمحے لمحے کی باتیں' اس نے بتایا کہ ماما کو جب میرے بارے میں پتا چلا تھا تو وہ سفید ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ اس چوہدری کو زندہ نہیں چھوڑوں گا جس نے میری آپاں کا سہاگ اجاڑا۔ اسے یوں بے

بسی کی موت مارا اور پھر زینو کو دربدر کر دیا۔ اس کے خلاف میرے دل میں نفرت بھر دی۔ مامی اور اس کی ماں نے ماما کو شرم دلائی تھی کہ زینو تیری عزت تھی' تیری بیٹی تھی' اچھی یا بری تجھے اس کو یوں نہیں دھتکارنا چاہیے تھا۔ اس کا تو جیسے کلیجہ چھد کر رہ گیا تھا۔ مامی سمجھ رہی تھی کہ کادے سے میری شادی ہو چکی ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میرے ساتھ کیا کچھ ہوا۔ کیسے چوہدری نیاز نے اپنے کتے میرے اور کادے کے پیچھے لگا دیے تو وہ اپنا سارا دکھ بھول کر مجھے سینے میں چھپا کر رونے لگی۔

اب تو یہیں رہ جا۔ دیکھتی ہوں اس کتے کے آدمی یہاں تک کیسے پہنچتے ہیں۔ میں کروں گی تیرا بیاہ۔" اس نے میرا پنڈا چوم لیا۔

"ہاں پتر! اب یوں ہرنیوں کی طرح ماری ماری نہ پھر۔ یہ عزت کی بات نہیں ہوتی۔ یہ تیرا اپنا گھر ہے اور لڑکیاں بالیاں اپنا گھر چھوڑ کر صرف اسی وقت جاتی ہیں جب وداعی جائیں۔" مامی کی اماں نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"مامی میرا کب جی چاہتا ہے کہ میں یوں اندھیری راتوں میں چھپی چھپی پھرتی پھروں' کبھی ایک گھر اور کبھی دوسرے در۔ پر تم لوگوں کو نہیں پتا وہ.... وہ بلا ہے۔ ایسی بلا کہ اگر آ جائے تو اور نہ آئے تو آدمی کا لہو پی جاتی ہے۔ مامی وہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ وہ جانتا ہے کہ میں اس کی سب سے بڑی دشمن ہوں اور اس کے جرم کی اکیلی گواہ ہوں۔ وہ سمجھتا ہے کہ اماں مجھے بتا گئی ہے کہ بڑے زمیندار کو کس نے قتل کیا ہے۔ بڑی زمینداری کا گلا گھونٹتے ہوئے تو میں نے خود دیکھا تھا۔ اسے مارنے والی تو چوہدرانی سونیا ہے۔ وہ جانتا ہے مامی کہ میں اگر عدالت تک پہنچ گئی یا میں نے چوہدری فیاض کے بیٹوں کو بتا دیا تو وہ مجھے عدالت تک لے جائیں گے تب چوہدری نیاز ہی نہیں سونیا بھی جیل چلی جائے گی اور ان کی ساری جائیداد چوہدری فیاض کے بیٹوں کو مل جائے گی۔ میرا مارا جانا ہی اس کی اور اس کے خاندان کی ضمانت ہے اسی لیے وہ میرے پیچھے ہے۔"

میں بتا رہی تھی اور مامی اور اس کی ماں منہ پھاڑے سن رہی تھیں "زینو! تو..... تو اسکول میں پڑھی ہے؟" مامی نے مجھے پیار سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں ستائش تھی۔

"نہ مامی! اسکول میں پڑھتی تو شاید اتنا کچھ نہ جان پاتی جتنا ان دکھوں اور غموں نے سکھا

دیا ہے۔ ہر پل کا خوف ویسے ہی دماغ کو چمکا دیتا ہے جیسے چھری تیز کرنے والا چھری کو سان پر گھس کر چمکاتا ہے۔"

"دیکھو تو اماں! کیسی باتیں کرتی ہے میری زینو! ایسی باتیں تو بھا قادر کی دھی بھی نہیں کرتی۔ وہ پوری نو جماعت پڑھ کر آئی ہے شہر سے۔ وہ اپنے ماما کے گھر شہر میں رہتی ہے۔ اسکول جاتی ہے کبھی کبھی اپنے اماں ابا سے ملنے آ جاتی ہے۔ تو تو اس سے بھی زیادہ اچھی باتیں کرتی ہے۔ بڑی بڑی۔"

میری باتوں سے مامی کچھ دیر کو بہل گئی تھی مگر دکھ اسے نچوڑ گیا تھا۔ وہ بار بار ہولا کر کھڑی ہو جاتی اور سینہ کوٹ کوٹ کر ماما کو یاد کرنے لگتی۔ گھر سناٹے میں ڈوبے ڈوبے ایک دم جاگ اٹھتا۔ کاکا پریشان ہو کر مامی کے پاس آتا' اسے صبر کرنے کو کہہ کر خود بھی رو پڑتا۔ مامی کبھی اسے اور کبھی مجھے سینے سے لگا لیتی۔ اس کی سسکیاں ہچکیوں میں بدل کر پھر گہری سانسوں اور آہٹوں میں تبدیل ہو جاتیں۔ گھر پھر سناٹے میں ڈوب جاتا۔ یوں سویرا ہو گیا۔ کادا اور بابا یہاں رکنے کو تیار نہ تھے اور مامی مجھے چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی وہ تو بابا سے باقاعدہ لڑ پڑی تھی کہ جب زینو کا نکاح ہی نہیں ہوا تو وہ کیوں مجھے ساتھ ساتھ لیے پھر رہا ہے۔ ایک طرح سے تو وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ کادا اور بابا بھی لمحہ بھر کو چپ رہ گئے تھے مگر پھر اچانک ہی کادا بول اٹھا۔ "قاضی بلا کر نکاح کر دو مامی! میں زینو کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

اس پر مامی پھر بکھر گئی۔ وہ کہتی تھی کہ ابھی تو اس کے ماما کی قبر کی مٹی بھی تازی ہے۔ ابھی تو یہ غم کلیجے کو چھیدے دے رہا ہے' ایسے میں نکاح کیسے کروں۔ میں خود بھی کادے کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔ مامی کی اماں میری مرضی جان کر مامی کے پیچھے پڑ گئی کہ چوہدری نیاز اسے ڈھونڈتا ہوا یہاں تک آ گیا تو تو کلی جان اس کی حفاظت کیسے کرے گی۔ کادا مرد ہے اپنی عزت پر حرف بھی نہ آنے دے گا۔ کاکا ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا تھا کہ گھر کی عزت کا محافظ بن سکتا۔ کاکے اور ماسی نے اسے سمجھایا' خالہ فاطمہ نے بتایا کہ چوہدری نیاز کیسے کیسے اس کے پیچھے پڑا۔ کہاں کہاں تک پہنچا ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ اگر اس نے زینو کو روکا تو وہ ایک نہ ایک دن یہاں ضرور پہنچ جائے گا جب کہ کادا اور بابا سوچ چکے تھے کہ وہ یہاں سے مجھے لے کر سیدھے کراچی جائیں گے۔ وہاں چوہدری فیاض کے بیٹوں کو مل کر ساری بات بتائیں گے اور چوہدری کو قانون کے حوالے کر کے چھوڑیں گے تاکہ وہ گاؤں اس کے مظالم سے بچ سکے۔

بات بڑی مشکل سے مامی کے پلے پڑی۔ وہ چپ کر گئی پھر اس پر راضی ہوئی کہ ماما کا تیجا ہو جائے تو قاضی بلا کر میرا نکاح پڑھوا دے۔ بابا اور کادا یہ سن کر خوش ہو گئے۔ اسی رات بابا اور کادا وہاں سے شادو کے گاؤں روانہ ہو گئے۔ بابا کہتا تھا کہ نکاح شادو کے بغیر ہوا تو وہ رو رو کر مر جائے گی۔ میں خود بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ اپنے ہاتھ سے کادے کے سر پر سہرا باندھے۔ یہ اس کی دیرینہ خواہش تھی پھر کادے نے بتایا کہ کملا' دینو' ماجا اور جانو بھی اس کا منتظر ہو گا۔ وہ سب جانتے تھے کہ میرا ماما مر گیا ہے اور کادا مجھے اور اس کی میت کو لے کر اس کے گاؤں جا رہا ہے۔ کادے نے ان سے کہا تھا کہ وہ اس جگہ صرف دو دن اس کا انتظار کریں اب اگر وہ نہ جاتا تو وہ اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے اور کادے کو ڈر تھا کہ کہیں ان کے پیچھے چوہدری نیاز کا کوئی آدمی یہاں تک نہ پہنچ جائے۔ میں بھی جانتی تھی کہ یہ خبر کہ میں ملک کاما جیسے آدمی کے چنگل سے بھی نکل بھاگی ہوں اسے غصے سے پاگل کر دے گی۔ وہ پاگلوں کی طرح میرا پیچھا کرے گا۔

کادا اور بابا چلے تو گئے مگر مجھے پھر ایک بار سولی پر لٹکا گئے۔ رات کے سناٹے میں خوف کی چاپ پورے گھر میں چکراتی رہی۔ آج ماما کو مرے دوسرا دن تھا۔ مامی کی حالت بہت خراب تھی۔ کاکے کی آنکھوں میں لہو اترا ہوا تھا۔ وہ ساری باتیں سن رہا تھا' سمجھ رہا تھا پر بولتا نہیں تھا۔ چوہدری نیاز کا ذکر آتا تو میں اس کے چہرے پر چنگاریاں سی اڑتی محسوس کرتی۔ وہ تمام رات بھی روتے گزر گئی۔ خالہ فاطمہ اور مامی کی ماں' مامی کو سنبھالے رہیں' کاکا فیکے سے سرگوشیاں کرتا رہا۔ اگلی صبح ہماری آنکھ کھلی تو کاکا گھر میں نہیں تھا۔ پہلے تو ہمیں خیال ہوا کہ یہیں کہیں ہو گا یا قبرستان چلا گیا ہو گا مگر جب دھوپ سر پر آ گئی۔ محلے کے لوگ قرآن خوانی کے لیے آنگن میں بچھی چارپائیوں اور کوٹھڑی میں بچھی دریوں پر آ بیٹھے تو مامی کلیجہ تھام کر دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ محلے کے کئی لڑکے کاکے کی تلاش میں گاؤں بھر میں پھیل گئے۔ قرآن پڑھنے والوں کے دھیان پڑھنے پر کم اور دروازے پر زیادہ ہو گئے تو میں بھی اپنے اندر خوف کی سرسراہٹ محسوس کرنے لگی۔ کاکے کو پتا تھا کہ آج اس کے باپ کا تیجا ہے۔ گھر میں مہمان ہوں گے پھر وہ کہاں گیا تھا؟ مجھے تو اپنی نحوست سے ڈر لگ رہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ میرے قدم جہاں بھی پڑے ہیں وہاں آفت ضرور آئی ہے اور میرے اوپر آنے والی آفت کا تعلق ہر حال میں چوہدری نیاز ہی سے ہوا کرتا تھا۔ اب میں دعا کر رہی تھی کہ خدا کرے کاکا

خیریت سے ہو۔

یہاں تو نہ کملا تھا' نہ کادا اور نہ بابا کہ سینے میں چھپا کر تسلی ہی دے سکتا۔ دن ڈھلا اور دھیرے دھیرے شام ہوتی چلی گئی۔ مامی اب اکیلی ماما ہی کو نہیں کاکے کو بھی رو رہی تھی۔ میں' خالہ فاطمہ اور ماسی' مامی کو جھوٹے دلاسے دے رہے تھے اور چپکے چپکے اپنے آنسو صاف کرتے جا رہے تھے۔ اسی وقت میں نے فیکے کی آنکھوں میں بلا کا خوف اور گہری چپ دیکھی تب میں چپکے سے اس کے پاس جا بیٹھی۔ "فیکے..... تجھے پتا ہے کاکا کہاں گیا ہے؟" میں نے سرگوشی کی۔

اس نے گھبرا کر مجھے یوں دیکھا جیسے میں نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اب بھی چپ تھا۔ "بول..... تُو جانتا ہے ناں کہ کاکا کہاں گیا ہے؟" اب میں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر اپنی طرف گھما لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کی آنکھوں میں اعتراف تھا کہ وہ پل بھر بھی مجھ سے نگاہ نہ ملا سکا اور اس نے آنکھیں جھکا لیں۔

"بول....." میں نے انگلیاں اس کے رخساروں میں پیوست کر دیں۔

"وہ..... زینو وہ چوہدری نیاز کو مارنے گیا ہے۔ وہ ہمارے گاؤں گیا ہے۔"

اور مجھے لگا جیسے کسی نے میرے بدن کی جان کھینچ لی ہو۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو سنبھالا۔ "تجھے پتا تھا اور تُو نے نہیں بتایا..... بول..... بول کیوں نہیں بتایا۔" میں نے غصے سے اس کے بال پکڑ لیے۔

"وہ..... میں نے منع کیا تھا اسے زینو..... پر وہ کہتا تھا کہ تُو نے کسی کو بتایا تو اتنی کلہاڑیاں ماروں گا کہ تُو زندہ نہیں بچے گا۔ وہ رات کو ہی چلا گیا تھا۔" یہ سن کر تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ رات کو اس کے چلے جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ سویرے وہاں پہنچ گیا ہو گا۔ حالات کی سنگینی نے مجھے بالکل ہی پاگل کر دیا۔ اب تک تو جانے کیا ہو چکا ہو گا۔ یہ تو میں جانتی تھی کہ چوہدری نیاز وہاں نہیں ہے پر وہاں سونیا تو تھی' پھر راستے میں چوہدری مل بھی سکتا تھا۔ کیا پتا وہ اب تک گاؤں پہنچ گیا ہو۔ وہ کاکے کو جانتا تو نہیں تھا پھر بھی کاکا بچہ تھا۔ وہ ایسی غلطی کر سکتا تھا جس سے چوہدری نیاز کو پتا چل جاتا کہ وہ کون ہے۔ پتا نہیں کیسی اوٹ پٹانگ باتیں تھیں جو میرے دماغ میں آندھی میں اڑتے سوکھے پتوں کی طرح چکرا رہی تھیں میری سمجھ

میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ آنے والی تباہیوں کو کیسے روکوں۔ مامی کو کیا جواب دوں۔ میں حیران بیٹھی تھی کہ خالہ فاطمہ آ گئی۔

"کی گل اے پترا!" وہ میرے پاس بیٹھ کر مجھے غور سے دیکھنے لگی۔

میں نے اسے ساری بات بتا دی تو وہ تو آپے سے باہر ہو گئی۔ اس نے جھاڑو اٹھا کر فیکے کو اتنا مارا کہ جو بات میں خود اپنے سے چھپا رہی تھی اس کی سارے گاؤں کو خبر ہو گئی۔ ایک قیامت مچ گئی۔ مامی تو چکرا کر ایسی گری کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ ابھی گھر میں دیا نہ جلا تھا کہ قسمت کے گھور اندھیرے سب کو اپنی لپیٹ میں لیے بڑھتے چلے آئے۔ فیکا زخمی پڑا تھا۔ مامی کی ماں سینہ کوٹ کوٹ کر بین کر رہی تھی۔ خالہ فاطمہ رو رہی تھی اور مامی کے ہاتھ پاؤں مل رہی تھی کہ اچانک مامی کی ماں مجھے خونخوار نگاہوں سے دیکھتی ہوئی میری طرف جھپٹ پڑی۔ "منحوس' کُتی..... چھنال تُو نے میری بچی کا گھر برباد کر دیا۔ کھا گئی اپنے مامے کو' میرے بچے کاکے کو۔ ارے دفع ہو جا یہاں سے..... نکل جا اپنی یہ منحوس شکل لے کر۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے مجھے مار رہی تھی' میں رو رہی تھی مگر میں نے اس کے ہاتھ نہ پکڑے۔ خالہ فاطمہ اسے پکڑ رہی تھی مگر اس پر تو جیسے جنون سوار تھا۔ وہ مجھے دھکے دیتی ہوئی باہر لے آئی پھر اس نے مجھے ایسا زور سے دھکا دیا کہ میں گلی میں جا گری۔ گلی میں جمع لوگ حیرت سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ بڑی اماں نے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا اور میں چاروں طرف کھڑے' سر اٹھائے تماشہ دیکھتے ہوئے لوگوں کے درمیان زمین پر جا پڑی۔ رو رو کر میری حالت بھی بہت خراب تھی اور اوپر سے اس لمبی چوڑی ماسی نے مجھے بری طرح دھنک کر رکھ دیا تھا۔ میں نے دکھتے بدن کو سمیٹا' چادر کو اچھی طرح چاروں طرف لپیٹا اور ایک طرف کو چل پڑی۔ میں جلد از جلد ان لوگوں کے درمیان سے نکل جانا چاہتی تھی جو میری مدد کرنے کی بجائے چپ چاپ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ وہ چاہتے تو ماسی کو سنبھال سکتے تھے۔ اسے بتا سکتے تھے کہ یوں جوان لڑکی کو رات کے وقت بے قصور گھر سے نکال دینا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ سمجھا سکتے تھے کہ ان حالات میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں تو خود قسمت کی ماری ہوں۔ انھوں نے نہ ماسی کو روکا' نہ مجھے اور میں لڑکھڑاتے قدموں سے گلی سے نکل آئی۔ میرے پاس کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں تھا' اتنی رات کو میں کہاں جاتی؟ یہاں تو کوئی بھی میرا جاننے والا نہ تھا۔ کادا ایک بار پھر مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ دوبارہ نہ ملنے کے لیے۔ میں گلی عبور کر کے پکی سڑک تک

پہنچ چکی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر میں کیا کروں۔ میں نہیں جانتی تھی کہ یہاں سے کون سی لاری کہاں جاتی ہے۔ میں اکیلی شادو کے گاؤں بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں وہیں سڑک کے کنارے ایک پتھر پر جا کر بیٹھ گئی۔

اب میں جوں جوں سوچ رہی تھی' میرے اندر آگ بھڑکتی جا رہی تھی۔ میرے اندر اب کچھ بھی نہ تھا سوائے اس کے کہ میں اپنی اس تباہی اور بربادی کا انتقام لوں اور اپنی جان دے دوں۔ میں جان چکی تھی کہ قسمت کو میری کوئی خوشی' کوئی سکھ منظور نہیں۔ اب خوشی کے خواب دیکھنا گویا آنکھوں میں کانٹے اگانے جیسا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ میرے پیچھے کوئی بھی نہ آیا۔ نہ فیکا' نہ خالہ فاطمہ اور نہ ہی محلے کا کوئی شخص۔ میری بجھتی ہوئی آنکھوں میں پھر بھی ایک آس تھی کہ خالہ فاطمہ مجھے یوں تنہا نہیں چھوڑے گی' وہ میری تلاش میں ضرور آئے گی مگر جب کافی دیر تک کوئی نہ آیا تو میں نے آیندہ کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ میں جانتی تھی کہ میں یہاں سنسان علاقے میں اکیلی رات بھر نہیں بیٹھی رہ سکتی۔ مجھے بہرحال کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ اسی لمحے میں نے سڑک پر دور سے آتی لاری کے انجن کی آواز سنی۔ میرے پاس کرایے کو پیسے نہیں تھے پھر بھی میں نے سوچ لیا کہ لاری والے کے آگے ہاتھ جوڑ دوں گی کہ پیسے نہیں ہیں۔ میں کھڑی ہو گئی اور چند قدم چل کر سڑک کے کنارے آ گئی۔ اب میں ہر حال میں اپنے گاؤں جانا چاہتی تھی۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید میں کاکے کو بچا سکوں۔ شاید اسے چوہدری اور سونیا نہ ملیں ہوں۔ وہ اب تک کچھ بھی نہ کر سکا ہو اور ایسے میں' میں پہنچ جاؤں۔ اس خیال نے مجھے بڑا پُرامید کر دیا تھا۔ لاری اب قریب آ گئی تھی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ لاری میرے قریب آ کر رک گئی۔ میں اندر جا بیٹھی اور کھڑکی سے اس سمت دیکھا جہاں ماما کی گلی تھی۔ وہ اب بھی سنسان تھی۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور میں نے منہ چھپا کر اپنی آنکھوں میں آئے آنسو پونچھ لئے۔

یہ میرے دکھوں کے تابوت میں آخری کیل تھی۔ اب میں نے قسم کھا لی تھی کہ چوہدری نیاز اور سونیا کو قتل کرنے کے سوا کچھ اور نہیں سوچوں گی۔ یہ قسم کھاتے ہی میں نے اپنے سارے آنسو اپنے اندر اتار لیے اور کبھی آنسو نہ بہانے کا عزم کر لیا۔ عورت ہونے کے خیال کو دل سے نکال دیا۔ بہت دیر تک خود سے مختلف قسم کے عہد کرتی رہی تب میں نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ میں جان چکی تھی کہ دکھ اٹھا اٹھا کر روتے رہنا' کادے کے چوڑے سینے

کی آس لیے خوشیوں کو اپنا لینے کے سپنے دیکھنا' رشتوں اور ناتوں اور محبتوں کو پیروں میں لپیٹے رہنا' خوف سے یہاں وہاں چھپتے رہنا' میرے لیے بیکار ہے۔ میں اب تک سراب کے پیچھے بھاگتی رہی تھی۔ زندگی کی بہاروں کی منتظر تھی مگر اب میں جان چکی تھی کہ میری زندگی زرد پتوں کا بھنور ہے اور اسے اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ' تنہائیوں اور بربادیوں کے ساتھ قبول کرلینا چاہیے۔ میں چاہوں بھی تو سکھ کا ایک پل' خوشی کا ایک لمحہ اور محبت کا ایک سپنا تک نہیں دیکھ سکتی۔ پھر ایسی چیز کے پیچھے بھاگنا جو اپنی نہ ہو' نہ کبھی اپنی ہو سکتی ہو' بیکار تھا۔

میں خود کو تبدیل کر رہی تھی۔ حقائق کو تسلیم کر رہی تھی اور لاری پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ ایک جگہ جہاں لاری ذرا دیر کو ٹھہری تھی' لاری والے نے ڈیزل لیا تھا۔ پانی کے کنستر بھر کر لاری میں رکھے تھے' وہاں میں نے ایک پک اپ میں ماجے' دینو اور کمالے کو بھی دیکھا۔ میں چاہتی تو انھیں آواز دے سکتی تھی۔ انھیں اپنی بپتا سنا سکتی تھی مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ اب میں کسی کو اپنا کوئی دکھ بتاؤں گی نہ کسی سے اپنا کوئی سکھ مانگوں گی۔ میں چپ رہی۔ ان میں سے کسی کی نگاہ مجھ پر نہ پڑی' ذرا دیر بعد وہ لوگ مخالف سمت چلے گئے شاید وہ کادے کی تلاش میں تھے۔ میں چاہتی تو انھیں بتا سکتی تھی کہ کادا شادو کے گاؤں گیا ہے۔ کملا جانتا تھا کہ شادو کا گھر کہاں ہے اور کون سے گاؤں میں ہے مگر میں یہ بھی جانتی تھی کہ اگر میں نے ایسا کیا تو وہ لوگ مجھے تنہا نہیں جانے دیں گے۔ ان کا ساتھ میری تباہی کو نہیں روک سکتا تھا لیکن میری تباہی ان کو ضرور نقصان پہنچا سکتی تھی اس لیے میں بالکل انجان بنی رہی۔ ویسے بھی میں خود سے عہد کر چکی تھی کہ اب میں کسی کو درمیان میں نہیں آنے دوں گی۔ کاکا میری تباہی کا آخری شکار ہو گا اگر اسے کچھ ہو گیا تو' ورنہ اگر خدا نے اس کی مدد کی تو اور مجھے حوصلہ دیا تو میں اسے بھی بچالوں گی پھر یہ معاملہ صرف میرے اور چوہدری نیاز کے درمیان ہو گا۔

لاری چل پڑی۔ میں نے پلٹ کر اس پک اپ کی طرف دیکھا جس میں کملا اور دینو وغیرہ سوار تھے' وہ دور دھول اڑاتی چلی جا رہی تھی۔ میں پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ یہ سب سوچ لینے کے بعد مجھ میں حیرت انگیز تبدیلی آئی تھی کہ میں خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ مجھے بہت جلد نیند بھی آگئی اور میں کھڑکی کے شیشے سے سر لگا کر سو گئی۔

☆=========☆=========☆

آنکھ اس وقت کھلی جب لاری ایک جھٹکے سے میرے گاؤں کے اڈے پر رکی۔ آنکھ

کھلتے ہی میں پہچان گئی کیونکہ سامنے ہی اس ہندو کا ہوٹل تھا جہاں بابا اکثر بیٹھا کرتا تھا۔ مسافر اپنا اپنا سامان اور پوٹلیاں اٹھا کر اتر رہے تھے۔ میں بھی جلدی سے خود کو چادر میں چھپائے دروازے پر بڑھ گئی۔ ابھی تک لاری والے نے مجھ سے کرایہ نہیں مانگا تھا۔ میں نے غنیمت سمجھا کہ وہ اس وقت چھت پر چڑھا مسافروں کا سامان اتار رہا تھا۔ میں اس کی نگاہوں سے بچتی ہوئی لاری کی دوسری طرف چلی گئی۔ میرے پاس پیسے نہ تھے کہ تانگا کرتی پھر یہ خیال بھی آیا کہ پیسے ہوتے بھی تو تانگا کہاں کے لیے کرتی؟ خالہ فاطمہ تو تھی نہیں اور میرے گھر کی چابی بھی میرے پاس نہ تھی مگر مجھے جانا تو تھا' کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی کے گھر۔ دن کی روشنی میں' میں خود کو زیادہ دیر تک چھپائے نہیں رکھ سکتی تھی۔ میں یہ سب سوچ رہی تھی مگر میرے قدم نہیں تھمے تھے۔ میں نہر کی طرف جانے والے رستے پر مڑ گئی۔ وہی جگہ ایسی تھی جہاں میں کچھ دیر' بلکہ شام ڈھلے تک خود کو چھپا سکتی تھی۔ وہاں گھنے درخت تھے۔ جھاڑیاں تھیں پھر کماد کے کھیتوں کا لمبا سلسلہ تھا۔ وہاں ٹھنڈا پانی بھی تھا کہ میں کم از کم پانی ہی پی کر اپنی پیاس بجھا سکتی تھی۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھی۔ ابھی نہر دور تھی کہ اچانک میرے دماغ میں عبدالقادر کی بہن کا چہرہ گھوم گیا۔ اس وقت' ان حالات میں صرف وہی تھی جو میری مدد کر سکتی تھی۔ میں نے فوراً ہی اپنا رخ اس کی گلی کی طرف کر لیا۔ ڈر تو صرف یہ تھا کہ کہیں عبدالقادر گھر میں نہ ہو پھر مجھے خیال آیا کہ اس کی بہن نے بتایا تھا کہ وہ زیادہ تر حویلی پر ہوتا ہے' یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس وقت چوہدری نیاز کے ساتھ میری تلاش میں نکلا ہوا ہو۔ مجھے بہرحال یہ خطرہ تو مول لینا ہی تھا میں یہ جاننے کی ترکیب سوچتی ہوئی اس گلی میں داخل ہو گئی کہ عبدالقادر کی موجودگی کا پتا کیسے لگاؤں۔ گلی سنسان تھی۔ عبدالقادر کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ میں یہ دیکھتے ہی جان گئی کہ عبدالقادر گھر پر نہیں ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے ہلکے سے کھڑکی کا پٹ بجایا۔ میں جانتی تھی کہ عبدالقادر کی بہن گھر پر ہی ہو گی۔ عبدالقادر اسے کہیں بھی نہیں جانے دیتا تھا اور ویسے بھی اگر وہ گھر پر نہ ہوتی تو باہر سے کنڈی نہ لگی ہوتی بلکہ تالا پڑا ہوتا۔ میں نے پھر کھٹکھٹایا۔ اس بار ایک لرزتی سی سہمی ہوئی آواز آئی۔ وہ یقیناً عبدالقادر کی بہن کی آواز تھی۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ باہر کون ہے۔ میں نے سرگوشی میں اسے کھڑکی کھولنے کو کہا۔ میں چاہتی تو کنڈی کھول کر اندر جا سکتی تھی مگر میں

اطمینان کرنا چاہتی تھی کہ وہ گھر میں اکیلی ہے یا نہیں۔ میری آواز سن کر پتا نہیں وہ مجھے پہچانی یا نہیں مگر اس نے کھڑکی کھول کر جھری میں سے جھانکا۔ میں نے جلدی سے اسے یاد دلایا کہ میں کون ہوں' پھر اسے بتایا کہ میں سخت مشکل میں ہوں اور گھر کے اندر آنا چاہتی ہوں۔ وہ یہ سن کر پریشان ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ عبدالقادر دو تین دن کے بعد آج آیا ہے اور تنور سے روٹی لینے گیا ہے پھر کچھ سوچ کر وہ کھڑکی سے ہٹ گئی پھر آئی تو اس نے کہا کہ میں کنڈی کھول کر جلدی سے اندر آ جاؤں۔ میں نے دیر نہیں کی' گو گلی اب تک سنسان تھی۔ چند آوارہ کتوں کے سوا یہاں کوئی نہیں تھا مگر کسی بھی پل کوئی آ سکتا تھا۔ میں نے جھٹ کنڈی کھولی اور اندر چلی گئی۔ وہ دروازے پر ایک لوہے کا کنڈا پکڑے کھڑے تھی۔ میرے اندر آتے ہی اس نے مجھے جھکنے کو کہا پھر وہ میری پشت پر سوار ہو گئی۔ اس کے بوجھ سے میری کمر دُکھنے لگی مگر میں جان گئی تھی کہ وہ کسی ترکیب سے باہر کی کنڈی لگا رہی ہے۔

ذرا دیر بعد اتری اور میں سیدھی ہوئی تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں پھر بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ کنڈی لگا چکی ہے اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے مگر مجھے فوراً چھپ جانا چاہیے۔ ہم کوئی بھی بات کیے بغیر اندر چلے گئے۔ وقت کم تھا۔ نہ میں اسے بتا سکتی تھی کہ میں کس مشکل میں گرفتار ہوں اور نہ وہ پوچھ سکتی تھی۔ اس نے آنگن میں ایک چھپر تلے رکھے ٹین کے بڑے بکسے کو کھول کر مجھے اس میں چھپے رہنے کو کہا۔ اس بکسے کا منہ دیوار کی طرف تھا۔ اس نے اس میں سے دو موٹے موٹے گدے نکال کر اس بکسے پر پھیلا دیے اور مجھے کہا کہ میں اندر جا کر بکسے کی کنڈی کو اس کے کنارے پر ٹکا دوں تو بکسے کا منہ کچھ کھلا رہے گا اور یوں ہوا اندر جاتی رہے گی۔ میں نے اس کے کہے پر عمل کرنے میں دیر نہ لگائی۔ عبدالقادر اگر تھلے کے پاس والے تنور پر گیا تھا تو وہ زیادہ دور نہ تھا۔ اب وہ آنے والا ہو گا۔ میں نے بکسے میں جاتے ہی کنڈی اس کے کنارے پر ٹکا دی۔ کنارے کی پتری کافی چوڑی تھی۔ کنڈی اس پر جم گئی۔ اب ہوا کے ساتھ ہی ہلکی روشنی بھی اندر آ رہی تھی۔ اندر ایک اور موٹا گدیلا رکھا تھا۔ میں اس میں سیدھی لیٹ گئی یہ بکسا اتنا بڑا تھا کہ میں اس میں باآسانی پاؤں پھیلا کر لیٹ گئی تھی اس پر لیٹ کر مجھے بڑا آرام ملا۔ ساری رات لاری میں بیٹھے بیٹھے میری کمر چیخ کر رہ گئی تھی۔ یہاں تو یوں لگا جیسے میں کسی بڑے سے نرم بستر پر لیٹی ہوں۔ شروع شروع میں تو مجھے گھٹن کا شدید احساس ہوا مگر جلد ہی یہ گھٹن ختم ہو گئی۔

ابھی میں نے سکھ کا سانس بھی نہ لیا تھا کہ اچانک آہٹ سنائی دی پھر کسی نے زور سے دروازے کو کھٹکھٹایا۔

"آئی جی!" عبدالقادر کی بہن کی سہمی ہوئی آواز نکلی اور دوسرے ہی لمحے کنڈی گرنے اور دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

"چل جلدی بھاجی گرم کر۔" عبدالقادر کی آواز میں لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔

"اچھا جی۔" اس کی بہن کی آواز سنائی دی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ پورے بدن کو جیسے جھٹکے سے لگ رہے تھے۔ کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں اور حلق خشک ہو گیا تھا۔ کچھ دیر برتنوں کی آواز آتی رہی پھر چارپائی چرچرائی۔ شاید عبدالقادر چارپائی پر بیٹھ چکا تھا۔

"تُو نے روٹی کھائی؟" اس نے پوچھا۔

"نہ جی ابھی تو کوئی نہیں کھائی پر میں نہا کر روٹی کھاؤں گی۔" اس کی بہن کی آواز پھنسی پھنسی سی تھی۔ مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں مارے خوف کے وہ کچھ بول نہ دے۔

"میں رات کو نہیں لوٹوں گا۔ مجھے چوہدری کے ساتھ رہنا ہے۔ اس کے کچھ مہمان آئے ہیں' وہ شام کو واپس جائیں گے اور سن.... کل غلام رسول کا ماما آئے گا تیری بات پکی کرنے۔ وٹے سٹے کی بات ہو گئی ہے۔ اب اگر تُو نے اس کے سامنے کچھ بک بک کی تو میں تیری زبان کاٹ دوں گا۔"

وہ کافی غصے میں لگ رہا تھا۔ میں نے کچھ ہی دیر بعد سسکیوں کی آواز سنی۔ پھر اس کی سہمی ہوئی آواز آئی۔ "آپاں کو کیوں نہیں لایا توں؟"

"مر گئی آپاں تیری.... اسے لے آؤں تا کہ تم دونوں چھنالیں مل کر میری زندگی حرام کرو۔ میں بتا چکا ہوں کہ غلام رسول اس صورت میں مہرو کا رشتہ دے گا جب میں اس سے تیرا ویاہ کروں گا۔ تجھے کون سا غم کھا رہا ہے۔ تین بھینس ہیں اس کی۔ دودھ کا اچھا خاصا کاروبار ہے' کسی چیز سے دکھی نہیں ہو گی توں۔"

"پر بھاجی! وہ اتنا بوڑھا....."

"بس..... بس کر بے شرم۔ بے غیرت۔ بڑا گبھرو جوان چاہیے ناں تجھے۔ زیادہ بک بک کی تو یہیں گاڑ دوں گا سمجھی۔" اس نے کہا اور شاید چارپائی سے اٹھ گیا پھر کچھ دیر اس کی

بڑبڑاہٹ سنائی دیتی رہی۔ میں دل میں دعا کر رہی تھی کہ وہ جلد از جلد چلا جائے۔ اب پھر میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس کی بہن کی سسکیاں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔

"رولے..... جی بھر کر رولے..... لیکن اگر تُو نے یہ ٹسوے غلام رسول کے مامے کے آگے بہائے تو سمجھ لینا' وہ تیرا آخری وقت ہو گا۔" یہ کہہ کر وہ زور سے دروازہ مار کر باہر چلا گیا پھر باہر سے کنڈی لگنے اور تالا ڈالنے کی آواز سنائی دی۔ چند ہی لمحوں بعد اس کی بہن نے آ کر بکسا بجایا۔ میں جو اسی انتظار میں تھی' جلدی سے بکسا کھول کر باہر آ گئی۔

عبدالقادر کی بہن کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ وہ اب بھی رو رہی تھی۔ میں نے باہر آتے ہی اسے سینے سے لگا لیا۔ میرا پیار پا کر وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بڑی مشکل سے قابو میں آئی۔ مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ میں جانتی تھی کہ اس نے بھی کھانا نہیں کھایا ہے اس لیے میں نے اسے کہا کہ وہ بھی روٹی کھا لے اور مجھے بھی دے پھر میں نے اسے بتایا کہ میں بہت دور سے آئی ہوں۔ یہ سنتے ہی اس نے آنسو صاف کر لیے اور جلدی جلدی بھاجی گرم کی۔ ہم دونوں نے کھانا کھایا..... درمیان میں' میں نے اسے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ وہ یہ سن کر کہ میں غلام حسین کی دھی زینو ہوں' وہ اچھل پڑی۔ "عبدالقادر تو تیرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ کہتا ہے کہ چوہدری نے تیرے پکڑے جانے پر پورے پچاس ہزار دینے کا وعدہ کیا ہے۔" اس نے کانپتے ہوئے کہا۔

"میں ان کے ہاتھ لگوں گی تو یہ پچاس ہزار لے گا یا چوہدری دے گا ناں؟" میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

وہ میری ہمت اور جرات پر حیران تھی۔ وہ حیران تھی کہ یہ سب جانتے بُوجھتے بھی میں دوبارہ گاؤں کیسے چلی آئی۔ میں اسے اپنا پروگرام نہیں بتانا چاہتی تھی اس لیے صرف اتنا بتایا کہ میں کاکے کے پیچھے آئی ہوں۔ یہاں آ کر اور بالخصوص عبدالقادر کے گھر آ کر مجھے اتنا تو پتا چل ہی گیا تھا کہ کاکا ابھی تک کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکا ہے جس سے یہ بات سامنے آئی کہ شاید کاکا کہیں چھپا ہوا ہے یا چوہدری تک نہیں پہنچ پایا ہے۔ عبدالقادر کی بہن ریشم ہی سے مجھے پتا چلا کہ چوہدری نیاز رات ہی آیا ہے۔ سونیا کے بھائی کی شادی ہے وہ اور چوہدری بھی شاید کل سویرے تک چلے جائیں گے۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا آج ہی رات کرنا تھا۔ آج کی رات گزر گئی تو وہ لوگ یہاں سے چلے جائیں گے۔

میں نے اسے باتوں میں لگا کر اپنے موضوع سے ہٹا دیا اور اس سے پوچھا کہ وہ کیوں رو رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ عبدالقادر جہاں شادی کرنا چاہتا ہے وہاں وہ راضی نہ تھی۔

"وہ بوڑھا ہے زینو..... بہت بڑا ہے' میرے ابے جتنا اور نشہ کرتا ہے۔ گندا رہتا ہے۔ میں..... میں نہیں کروں گی اس سے ویاہ' چاہے میں مر ہی کیوں نہ جاؤں۔"

"پھر وہ کیوں کر رہا ہے تیری مرضی کے بغیر۔"

"اس لیے کہ اس حرام کے جنے چوہدری نے فیصلہ کر لیا ہے۔ غلام رسول کے مامے کی بھی ایک دھی ہے لیلیٰ' اسے چوہدری اپنی ووہٹی بنانا چاہتا ہے۔ پر غلام رسول کا ماما کہتا ہے کہ غلام رسول کی شادی میرے سے کر دی جائے۔ اس کمینے نے مجھے ایک روز دیکھ لیا تھا پھر عبدالقادر بھی غلام رسول کی بہن سوہنی کو چاہتا ہے' پیار کرتا ہے' بس یہ دونوں مل کر اس نشئی کے حوالے کرنا چاہتے ہیں تاکہ اپنی من پسند عورتیں حاصل کر سکیں۔" اس نے روتے ہوئے بتایا۔

اس معاملے میں بھی چوہدری کا دخل ہے' یہ سن کر تو میرے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی۔ وہ حرامزدہ گاؤں کی ہر لڑکی کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا بن گیا ہے۔ کیا پتا وہ لیلیٰ بھی یوں ہی رو رہی ہو' بلک رہی ہو۔ میں دل ہی دل میں ہنسی۔ میں جانتی تھی کہ چوہدری کی یہ حسرت اس کے دل ہی میں رہ جائے گی۔ میں کچھ بھی نہ کر سکی تب بھی کم از کم یہ تو نہ ہونے دوں گی۔ میں اس کی اطلاع سونیا تک پہنچا کر بھی اس کی راتوں کی نیندیں حرام کر سکتی تھی۔ ریشم سے پتا چلا تھا کہ کل چوہدری سونیا کو لے کر بھائی کے گھر چلا جائے گا پھر اسے وہیں چھوڑ کر واپس آئے گا اور تبھی ان کا پروگرام ہے کہ ریشم کو غلام رسول کے حوالے کر کے لیلیٰ کو چوہدری نیاز کی بیوی بنا دیا جائے۔ ریشم نے بتایا کہ چوہدری نیاز الگ بنگلے کا انتظام بھی کر چکا ہے۔ اس نے اس گاؤں کے دوسری طرف' چھوٹی پہاڑی کے اوپر جو بنگلہ بنوایا تھا وہ تیار ہو چکا ہے۔ وہ لیلیٰ کو وہیں رکھے گا۔ میں اس سے سب کچھ معلوم کر چکی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اس کی شادی غلام رسول سے نہیں ہونے دوں گی پر وہ میرے کہنے کے مطابق عبدالقادر سے نہ الجھے بلکہ ایسا ظاہر کرے جیسے وہ اس شادی پر تیار ہے۔ یہ سن کر وہ پریشان ہو گئی تھی مگر جب میں نے قسم کھائی تو وہ کچھ مطمئن ہو گئی۔

ایسا کرنے سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ عبدالقادر غصے میں نہ رہے اور جو کچھ کر رہا ہے اس کے بارے میں بہن کو بتاتا رہے تاکہ میں ہر بات سے واقف ہو سکوں۔ اس طرف سے اطمینان کے بعد مجھے کاکے کی فکر ہوئی۔ پتا نہیں وہ کہاں ہو گا۔ یہاں گاؤں میں تو وہ کسی کو جانتا بھی نہ تھا پھر کہاں گیا ہو گا۔ اس خیال نے مجھے بے چین کر دیا پھر میں نے ریشم کو بھی اس کے بارے میں بتا دیا اور اس سے کہا کہ وہ کسی بھی طرح عبدالقادر سے پوچھے کہ کوئی بات تو نہیں ہوئی۔ ریشم نے مجھے بتایا کہ وہ یہ بات بیگم کی بیٹی سے پتا کرا سکتی ہے۔ بیگم وہی تھی جو سونیا کی خاص ملازمہ تھی۔ یہ جان کر کہ اس کی بیٹی سے ریشم سب کچھ پتا کروا سکتی ہے مجھے اطمینان ہو گیا۔ واقعی عبدالقادر سے پوچھنے کا مطلب تو اسے کاکے کے پیچھے لگانا تھا۔ بیگم کی بیٹی ریشم کے گھر کے برابر والے گھر میں رہتی تھی۔ وہ شادی شدہ تھی اور اس کا خاوند رحیمو بھی حویلی میں کام کرتا تھا۔ عبدالقادر واپس نہ آنے کے بارے میں کہہ گیا تھا اس لیے مجھے کافی اطمینان تھا۔ ریشم نے جھٹ منجھی کو اس دیوار سے ٹکا دیا جس کے دوسری طرف بیگم کی بیٹی کوثر کا گھر تھا۔ وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے منجھی پر چڑھ گئی۔

ذرا ہی دیر بعد مجھے پتا چل چکا تھا کہ اب تک حویلی میں یا حویلی کے باہر ایسی کوئی بات نہیں ہوئی جو میرے لیے پریشانی کا باعث ہو۔ بیگم کی بیٹی کوثر کچھ ہی دیر پہلے وہاں سے آئی تھی۔ اس نے ریشم کو بتایا کہ وہ سونیا سے ماں کو لے آنے کی بات کرنے گئی تھی۔ اس کی حالت اچھی نہیں ہے اور اب وہ سونیا پر بوجھ بن گئی ہے اس لیے سونیا کا رویہ بھی اس کے ساتھ اچھا نہیں رہا۔ جب تک وہ گھر بھر کی خدمت کرتی رہی' اس کی لاڈلی رہی' اب اس کے لیے عذاب بن گئی تھی۔ سونیا نے اس کا علاج بھی نہیں کروایا اگر اس کا علاج ہو گیا ہوتا تو وہ اب تک ٹھیک ہو چکی ہوتی۔ بیگم تکلیف میں ہے اور اب سونیا کے رویے کی وجہ سے روتی رہتی ہے' یہ سن کر میرے دل میں فرحت انگیز سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے وہ دن یاد آ گئے تھے جب بیگم سونیا کی لاڈلی تھی اور اماں کو گالیاں دے دے کر کام لیا کرتی تھی۔ سونیا اور چوہدری نیاز سے ہماری شکایتیں لگایا کرتی تھی اور یوں ان کی چہیتی بن گئی تھی۔ اماں سخت بیماری میں اگر کام میں سستی کرتی تو وہ پورا گھر سر پر اٹھا لیا کرتی تھی۔ اماں کو زبردستی گھسیٹ کر باورچی خانے میں لے جایا کرتی تھی۔ مجھے ایک ایک بات یاد آ گئی۔ آج خدا نے انہی لوگوں کے ہاتھوں اسے اذیت پہنچائی تھی جن کے ہاتھوں اس نے ہمیں اذیت پہنچوائی تھی۔

واقعی خدا سب کچھ جاننے' دیکھنے اور سننے والا ہے۔ کوثر سے یہ بھی پتا چلا کہ اس کا خاوند بیگم کو پسند نہیں کرتا اور گھر لانے کی مخالفت کر رہا ہے مگر وہ بے چاری تو اس کی بیٹی تھی۔ اس کا خون تھی' لڑ جھگڑ کر بھی اسے لانا چاہتی تھی۔ یوں بھی اسے لانا ضروری تھا کہ سونیا کہہ چکی تھی کہ اس غلاظت کی گٹھڑی کو یہاں سے اٹھا لے جاؤ ورنہ میں سڑک پر پھینکوا دوں گی۔ کوثر رو رو کر بتاتی رہی اور ریشم سنتی رہی۔ میں بھی وہیں دیوار کے قریب کھڑی سب کچھ سن رہی تھی۔

اب شام ہو چکی تھی۔ مجھے جلد از جلد فیصلہ کرنا تھا۔ ریشم سے مجھے یہ تو پتا چل چکا تھا کہ پولیس اب میری تلاش کے سلسلے میں ٹھنڈی پڑ چکی ہے اور تھانیدار بھی بدل چکا ہے اور نیا تھانیدار شاید چوہدری کے تحفے وصول نہیں کرتا کیونکہ اکثر عبدالقادر اسے گالیاں دیتا رہتا تھا اور کہتا کہ یہ سالا اگر راہ پر نہ آیا تو کسی دن ڈاکوؤں سے مقابلے میں مارا جائے گا۔ میں سمجھ گئی کہ اس بات سے عبدالقادر کا کیا مقصد ہے۔ بہرحال میرے لیے یہ بات خوشی کا باعث تھی کہ وہ چوہدری نیاز کا پٹھو تھانیدار اب یہاں نہیں ہے اور غالباً اب یہاں جو بھی تھا وہ چوہدری نیاز کے رعب میں نہیں آیا تھا وہ شریف آدمی تھا ورنہ آج تک تو سارے ہی تھانیدار چوہدری کے ٹکڑوں پر پلتے تھے۔

جوں جوں رات ہو رہی تھی میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے آج ہی چوہدری نیاز کی حویلی جانا تھا۔ میں نے ریشم سے ذکر کیا تو وہ پیلی پڑ گئی۔ "پر زینو! اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟"

"تو کیا..... جو قسمت میں ہونا ہے ہو کر رہے گا ریشم! اور میں تو خود کو اسی وقت تک چھپاؤں گی جب تک سونیا اور چوہدری نیاز کے سر پر نہ پہنچ جاؤں۔ مجھے کچھ ہو جائے ریشم تو' تو سب کو بتا دینا کہ میں ہی غلام حسین کی دھی تھی اور اپنے بے گناہ باپ اور بے قصور ماں پر ہونے والے ظلم کا انتقام لینے آئی تھی اور سن ریشم! اگر تو ان مردوں سے دبتی رہی تو یہ تجھے کہیں کا بھی نہیں چھوڑیں گے۔ اپنا حق چھیننا سیکھ ریشم! میں نے بہت دیکھ لیا۔ بہت ظلم سہہ لیے کہ شاید ان لوگوں کو رحم آ جائے مگر نہیں..... یہ وہ بھیڑیے ہیں جنہیں مردار پسند ہیں۔ ہر گاؤں کا ایک چوہدری ہے جو نیاز سے مختلف نہیں' ہر گاؤں پر ان کا پہرہ ہے ہر دل پر ان کا پہرہ ہے' ہر آنکھ پر ان کا پہرہ ہے۔ غریب کو نہ سپنے دیکھنے کا حق ہے' نہ اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا' نہ اپنے ارمان نکالنے کا نہ کوئی خوشی حاصل کرنے کا۔ ہر گاؤں میں صرف

ایک دو یا تین عورتیں خوش ہوتی ہیں' اپنی مرضی کی زندگی گزارتی ہیں مہارانیوں کی سی زندگی گزارتی ہیں ریشم اور.... اور وہ چوہدری کی بیویاں ہوتی ہیں یا ان کی بیٹیاں۔ میں اگر ہر گاؤں کی روایت نہ بدل سکی تو اپنے گاؤں کو ضرور اس خبیث روایت کے چنگل سے نکال لوں گی۔" میں اتنا کہہ کر ایک عزم کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

ریشم گھبرا کر مجھ سے لپٹ گئی۔ "نہیں زینو! نہیں جا.... کیوں جان کی سودائی ہوئی ہے جھلی..... برسوں کے رواج تُو کلی کیسے بدل سکتی ہے؟"

"کوشش تو کر سکتی ہوں ریشم! میں پل پل خوف زدہ رہ رہ کر جینا نہیں چاہتی اور مرنا ہے تو ان کتوں کے ہاتھوں کیوں مروں' اپنے ہی ہاتھوں کیوں نہ مر جاؤں اگر میں نے حویلی کے ایک فرد کو بھی مار دیا تو سمجھوں گی کہ ہر لڑکی کے لیے ایک مثال چھوڑ دی۔" میں نے اسے تھپک کر کہا۔ وہ مجھ سے لپٹی لرز رہی تھی۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں بھی کبھی اسی طرح ماں سے لپٹ کر لرزا کرتی تھی' اتنی ہی ڈرپوک تھی میں بھی۔ ایسے ہی سہمی رہتی تھی مگر ان درندوں کے ظلم نے مجھے کتنا نڈر' کتنا بے خوف کر دیا تھا۔ وہ چوہدری جو کتوں کی طرح میری بُو سونگھتا رہا تھا میں آج اس کے گاؤں میں' اس کی حویلی میں اس کے قتل کا عزم لے کر جا رہی تھی۔

"جانے دے ریشم! اور سن! تجھے یہ سن کر دکھ تو بہت ہو گا مگر بتانا ضروری ہے تاکہ تجھے پتا ہو کہ تُو کس بھائی کی بہن ہے۔ عبدالقادر قاتل ہے۔ عبدالقادر چوہدری نیاز کے ہر ظلم' ہر جرم کا شریک ہے' اگر وہ میرے ہاتھوں مارا گیا تو' تو..... تُو مجھے معاف کر دینا اور یہ نہ سمجھنا کہ میں حق پر نہ تھی۔ میں تجھ سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں کسی بھی ایسے شخص کی جان نہیں لوں گی جو ظالم نہ ہو۔ جانے دے مجھے۔"

"تُو..... تُو ایسے جائے گی زینو تو وہ تجھے مار دیں گے۔" اپنے بھائی کے بارے میں سن کر اس کے چہرے پر نہ حیرت طاری ہوئی نہ تشویش۔ شاید وہ جانتی تھی کہ عبدالقادر کیا ہے جبھی تو وہ مجھ سے اس کی جان کی بھیک مانگنے کی بجائے میرے لیے پریشان ہو رہی تھی۔

"پھر کیسے جاؤں گی؟" میں نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔

وہ چند لمحے سر اٹھائے میری طرف دیکھتی رہی پھر پلٹ کر کوٹھڑی کی طرف بھاگی۔ میں حیرت سے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اسے کیا ہوا ہے کہ وہ ہاتھ میں پستول لیے باہر نکل آئی۔ پستول کا رخ میری طرف تھا۔ میں لمحہ بھر کو بھونچکی رہ گئی۔ "یہ..... زینو یہ رکھ

لے۔" اس نے پستول میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے جھپٹ کر پستول لے لیا۔ میں اسے چلانا نہیں جانتی تھی مگر میری یہ مشکل اس نے حل کر دی۔ وہ اکثر عبدالقادر کو اس کی صفائی کرتے اور نشانہ باندھ کر اسے چلاتے دیکھتی تھی بلکہ اس نے بتایا کہ ایک بار بہت پہلے اس نے کھیل ہی کھیل میں پستول چلا دیا تھا جس سے اس کی دیوار پر لگا شیشہ ٹوٹ کر گر گیا تھا اور بڑی زور کا دھماکا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ پستول بھرا ہوا ہے اور کسی بھی خطرے کے وقت میرے کام آ سکتا ہے۔ میں نے جلدی سے اسے چادر کے نیچے چھپا لیا۔ ریشم کو پیار کر کے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔

ابھی زیادہ اندھیرا نہیں پھیلا تھا مگر لوگ گھروں کو واپس آ چکے تھے۔ گلی میں بچوں کی بھیڑ لگی تھی۔ گھروں کے صحنوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ مرد گھروں کو آتے تھے تو ویران گھروں میں رونقیں اتر آتی تھیں۔ وہ میرا گھر تھا۔ جب بابا شام ڈھلے گھر آتا تھا تو لگتا تھا جیسے ہر سوئی ہوئی چیز جاگ اٹھی ہو۔ اماں اس کے گھر میں آنے سے پہلے ہی آگ جلا لیا کرتی تھی کہ اب بابا آنے والا ہے مگر آج وہی گھر ویران پڑا تھا۔ میں قسم کھا چکی تھی کہ ایک نہ ایک روز اپنے گھر میں شام ڈھلے دیوا ضرور جلاؤں گی۔ سارا گاؤں دیکھے گا کہ آج غلام رسول کی دھی لوٹ آئی ہے۔ آج اس اجاڑ آنگن میں دیوا جلا ہے' رونق نہ سہی' روشنی کی کرن ضرور جگمگائی ہے اور شاید اب وہ وقت بہت قریب تھا۔ میں یہ سب سوچتی ہوئی' تیز قدم اٹھاتی اس راستے پر جا رہی تھی جو سیدھا حویلی کو جاتا تھا۔ یہ وہی راستہ تھا جس سے ہو کر ایک بار میں اور اماں چوہدری نیاز کے ساتھ حویلی میں داخل ہوئے تھے تو پھر مجھے پچھلی دیوار پھاند کر یہ گاؤں چھوڑنا پڑا تھا۔ آج برسوں کے بعد میں پھر اسی راستے پر' اپنے قدموں سے' اپنے دل میں ایک عزم لئے جا رہی تھی۔ آج میں پورے طور پر اپنے اختیار میں تھی۔ اپنی مرضی سے جا رہی تھی۔ میں نے چادر کو اس طرح سر پر لیا ہوا تھا کہ میرا منہ چھپ چکا تھا' صرف آنکھیں کھلی تھیں۔ ان گلیوں میں اتنی روشنی نہ تھی کہ گزرتے ہوئے لوگ مجھے پہچانتے۔ ویسے بھی میں بہت بے خوف تھی۔ صرف کاکے کی پریشانی تھی۔ جانے وہ کہاں ہو گا۔ یہ خیال جب بھی آتا میں بری طرح بے چین ہو جاتی۔ ماسی کا اداس اور پریشان چہرہ نگاہوں میں گھوم جاتا۔ ماسی کی ماں کا کہنا کہ میں نے اس کی بیٹی کا گھر برباد کر دیا' دل میں ہوک سی اٹھا دیتا۔ اسے کیا پتا کہ میرے لیے وہ گھر کیا تھا۔ میں بھلا اس گھر کو کیسے برباد ہونے دیتی۔ میرا بس چلتا تو ماما کو کبھی نہ

مرنے دیتی۔ کاکے کو کبھی گھر سے قدم بھی نہ نکالنے دیتی۔ وہ جوان خون تھا۔ وہ اپنے باپ کا قاتل بھی چوہدری کو سمجھ رہا تھا۔ ماما اسی دکھ سے تو مرا تھا کہ چوہدری نے اس کی آپاں کو اور اس کے خاوند کو مار دیا اور مجھے دربدر کر دیا۔ اس میں کاکا حق بجانب تھا مگر میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ چوہدری کو مار کر جیل چلا جائے یا ان کتوں کے ہاتھوں مارا جائے۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

حویلی پر جیسے چراغاں ہو رہا تھا۔ اتنی لائٹیں تھیں جیسے وہاں جشن منایا جا رہا ہو۔ پورا گاؤں تاریک تھا اور ویران حویلی میں روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ میرے دل میں بگولے سے اٹھنے لگے۔ کچھ آگے بڑھی تو چوپال پر لوگ بیٹھے نظر آنے لگے۔ اس طرف سے جانا خطرناک تھا اس لیے میں نے راستہ کاٹ دیا۔ اب میں حویلی کی پچھلی جانب جا رہی تھی۔ میں نے راستہ وہاں سے بدل دیا تھا جہاں اندھیرا ختم ہوتا تھا۔ اس لیے مجھے کسی نے نہیں دیکھا۔ حویلی کی پچھلی طرف جانے سے پہلے میں نے اندھیرے حصے میں حویلی کی دیوار تک آ کر وہاں بیٹھے لوگوں کو پہچاننے کی کوشش کی۔ یہاں شاید کچھ گڑبڑ تھی یا شاید چوہدری کسی غریب کی بیٹی کی تقدیر کا فیصلہ سنا رہا تھا۔ کافی لوگ بیٹھے تھے۔ ملازم باہر چوکنے کھڑے تھے۔ عبدالقادر کندھے پر چادر ڈالے' مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ وہ بیٹھک میں باہر کھڑا تھا۔ لوگ اندر جا رہے تھے' باہر آ رہے تھے۔ میں دھیرے دھیرے الٹے پاؤں چلتی ہوئی دور ہو گئی۔ اب میں بہت تیزی سے حویلی کے پچھواڑے جا رہی تھی۔ میں جانتی تھی کہ یہ حصہ جل چکا ہے اور ابھی تک بنا نہیں ہے۔ وہاں روشنی بہت کم تھی اور حویلی کے کونے پر لگا پول اور اس پر لٹکے بلب کی روشنی یہاں تک آتے آتے معدوم ہو گئی تھی بس اتنا تھا کہ گہری تاریکی کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ یہاں بجری' اینٹیں اور لکڑی کی سیڑھی پڑی ہے۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں نے اس حویلی کی اسی دیوار کو عبور کیا تھا تب بھی اندر پڑی یہی چیزیں میرے کام آئی تھیں۔ اس وقت اندر کا یہ حصہ بن رہا تھا اور میں نے بجری پر سیڑھی لگا کر دیوار عبور کی تھی۔ میں نے پستول کو اپنے نیفے میں اڑسا اور سیڑھی کو ہاتھ لگا کر دیکھا کہ وہ جمی ہوئی ہے یا نہیں۔ وہ بالکل مضبوطی سے دیوار سے ٹکی ہوئی تھی۔ مجھے ذرا بھی محنت نہیں کرنا پڑی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا اور دھیرے دھیرے قدم رکھتی ہوئی اوپر پہنچ گئی۔ پہلے میں نے سر نکال کر دیوار کے اس پر دیکھا۔ یہاں بھی ملگجا اندھیرا تھا۔ دور آنگن میں جلنے والے بلب کی ہلکی سی

روشنی یہاں تک پہنچ رہی تھی مگر یہاں کسی کی موجودگی کے آثار نہ تھے۔ ایک طرف جلی ہوئی اینٹوں اور کاٹھ کباڑ کا ڈھیر تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور بدن کو دیوار سے اندر کی طرف لٹکا دیا۔ مجھے خوف تھا کہ مجھے کوئی دیکھ نہ لے مگر میں چپکے سے' ہلکی دھپ کی آواز کے ساتھ دوسری طرف کود گئی۔ میری ٹانگیں جیسے چیخ کر رہ گئیں۔ اب میرا بدن کافی بھاری تھا اس لیے کودنا تکلیف دہ تھا۔ پہلے تو میں دس گیارہ برس کی بچی تھی' ہلکے پھلکے چھریرے بدن والی' پیٹ بھر روٹی ہی نہ ملتی تھی کہ بدن پر گوشت ہوتا اس لیے کودنا اتنا تکلیف دہ نہیں لگا تھا مگر اس وقت تو آنکھوں میں تارے ناچ گئے تھے پھر میں نے جلد ہی تکلیف کو بھلا کر چاروں طرف دیکھا اور گھٹنوں کے بل رینگتی ہوئی اس کاٹھ کباڑ کے ڈھیر کے پیچھے پہنچ گئی۔ میں سر نکال کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی کہ میرے کودنے کی آواز سن کر کوئی اِدھر تو نہیں آ رہا۔ میرے کان کسی آہٹ پر لگے تھے مگر کافی دیر تک میں نے کوئی آواز نہ سنی تو اطمینان سے گہری سانس لے کر سر ان اینٹوں سے ٹکا دیا۔ لمحہ بھر کو آنکھیں بند کیں تو جیسے مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ آنے والے نے مجھے پیچھے سے دبوچ لیا تھا اور اپنا ہاتھ میرے منہ پر جما دیا تھا۔ اندھیرے میں' میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنا چاہا تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

وہ ایک اجنبی تھا جسے میں آج پہلے بار دیکھ رہی تھی۔ میں اس کی گرفت میں پہلے تو بری طرح مچلی' اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش بھی کی مگر جب اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "اگر تم مرنا چاہتی ہو تو شور کرو۔ چوہدری نیاز اپنے چیلوں کے ساتھ باہر موجود ہے' ذرا سی آہٹ بھی اسے متوجہ کر لے گی۔ میں تمھارا نہیں چوہدری نیاز کا دشمن ہوں۔ ویسے تم..... تم بھی اس کی دوست تو نہیں لگتیں۔ دوست دیوار کود کر نہیں آتے۔" اتنا کہنے ہی اس نے مجھے فوراً آزاد کر دیا تھا۔ نہ معلوم اس نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ اس کے چھوڑ دینے پر میں شور نہیں مچاؤں گی۔ ویسے بات اس کی بھی ٹھیک ہی تھی۔ دوست دیوار کود کر نہیں آیا کرتے اور دیوار کود کر آنے والا شخص کسی کو اپنی جانب متوجہ کیسے کرے گا؟ میں وہیں دبک کر بیٹھ گئی۔ ایک دم پڑنے والی اس افتاد نے میرے اعصاب شل کر دیے تھے۔ سانس اکھڑ گیا تھا اور دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔ میں کافی دیر تک خود کو سنبھالتی رہی۔ اس اجنبی کے بارے میں کچھ سوچنا بیکار ہی تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ میں اسے جانتی ہی نہیں تھی پھر یہ سوچنا کہ وہ چوہدری نیاز کا دشمن کیوں ہے بیکار ہی تھا۔ چوہدری نیاز کے تو شاید

دشمن اتنے زیادہ تھے کہ ان کا شمار کرنا ہی مشکل تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ شخص بھی اتنا ستایا گیا ہو گا کہ آج یہاں تک پہنچ گیا۔ یہ خدا کی طرف سے میرے لیے مدد تھی ورنہ میں تنہا ہوتی اور جانے تنہا اس کا کچھ بگاڑ بھی پاتی یا نہیں لیکن یہ میری دلی تمنا تھی کہ چوہدری نیاز کے بدن پر پہلا زخم میں لگاؤں۔ میں اس شخص سے اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر یہ موقع نہ تھا۔ میں نے اپنی دائیں جانب گردن جھکا کر اس حصے کی طرف دیکھا جہاں سے ایک راہداری سی حویلی کے اندرونی حصے کی طرف جاتی تھی۔ وہاں جلنے والی روشنی یہاں سے نظر آ رہی تھی مگر وہاں کسی کی موجودگی کے آثار نہ تھے۔ میں جانتی تھی کہ اس راہداری کو عبور کرتے ہی سیڑھیاں ہیں جو اوپر بڑی زمینداری کے کمرے کی طرف جاتی ہیں۔ اس کے برابر میں ہی چوہدرانی سونیا کا کمرا تھا۔ اس کمرے میں ملحق ایک کوٹھڑی نما کمرا ملازمہ بیگم کا تھا۔ سونیا اپنا یہ کمرا بہت کم استعمال کرتی تھی اور خاص طور پر اس وقت جب چوہدری نیاز سے اس کی کسی بات پر کھٹ پٹ ہو جاتی تھی تب وہ ناراض ہو کر اوپر والے کمرے میں سونے لگتی تھی۔ میرا جی چاہا کہ میں چپکے سے اوپر چلی جاؤں۔ وہاں میں یہاں کی نسبت زیادہ محفوظ بھی تھی۔ یہی سوچ کر میں نے دھیرے سے سرکنا شروع کر دیا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" اس اجنبی نے سرگوشی کی۔ مجھے اس کا کچھ پوچھنا برا لگا۔ میں پلٹ کر اسے گھورنے لگی۔ اب ہم دونوں ہی کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔ اس کے خدوخال مجھے صاف نظر آ رہے تھے۔

"میں نہیں چاہتا کہ تمہیں بے وجہ نقصان پہنچے اور.... اور وہ لوگ ہماری یہاں موجودگی سے واقف ہو جائیں۔" وہ دبے دبے انداز میں بولا۔

"اگر تم خوفزدہ ہو تو آج اپنا پروگرام کینسل کر دو..... میں یہاں جو کچھ کرنے آئی ہوں اسے کر کے جاؤں گی' میری نقل و حرکت تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم چلے جاؤ۔"

میرے لہجے سے وہ بری طرح سلگ اٹھا تھا۔ اس نے دانت کچکچا کر مجھے دیکھا۔

"اور میں بھی تجھ سے یہی کہنا چاہتا ہوں۔ میری وجہ سے تجھے کچھ ہو گیا تو مجھ سے گلہ نہیں کرنا۔ میں تو شاید اس پوری حویلی کو اُڑا دوں۔" اس کا لہجہ مضبوط اور کھردرا سا تھا جس سے اس کے ارادے کی پختگی کا بہ خوبی اندازہ ہو رہا تھا۔

میں گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر آہٹ سننے کی کوشش کرتی رہی پھر جیسے ہی مجھے احساس ہوا کہ باہر سے کوئی بھی اندر نہیں آ رہا۔ نہ اس حصے میں کسی کی موجودگی کا کوئی احساس ہو رہا ہے تو میں نے اس راہداری کی طرف سرکنا شروع کر دیا اور میری نگاہیں وہاں سے آتی ہوئی ہلکی روشنی پر لگی تھیں۔ اس بار اس اجنبی نے مجھے نہیں ٹوکا۔ میں کسی بھی طرح اوپر تک پہنچنا چاہتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ آج ایسا موقع مجھے پھر کبھی نہیں ملے گا۔ سونیا کے بچے یہاں نہیں تھے' ان کے ساتھ ان کے نوکر نوکرانیاں بھی گئی ہوئی تھیں۔ سونیا بھی بھائی کے گھر رہ رہی تھی اور چند دن کے لیے آئی تھی اس لیے نہ مہمان داریاں تھیں اور نہ محلے کی چاپلوس اور شیخی خور عورتوں کا مجمع۔ چوہدری نیاز میری اطلاع اور خیال کے مطابق تو اس وقت ملک کاما کے ساتھ بیٹھا اپنے بال نوچ رہا ہو گا مگر ابھی اس اجنبی نے کہا تھا کہ باہر چوہدری نیاز موجود ہے جو میری آواز سے متوجہ ہو سکتا ہے' ممکن ہے یہ صحیح ہو یا ممکن ہے غلط ہو۔ میں نے اس بات کی تصدیق کرنے کی کوشش نہ کی۔ میں تو اس وقت سونیا تک پہنچنا چاہتی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی سیڑھیوں تک گئی۔ یہاں روشنی بہت کم تھی اس لیے کہ اوپر جلنے والے بلب کی روشنی کو سیڑھیوں کے درمیان والی دیوار نے روک لیا تھا اور نیچے تک اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ میں دم سادھے چند لمحے وہیں بیٹھی رہی پھر دھیرے دھیرے اوپر چڑھنے لگی۔ ابھی آدھا راستہ بھی طے نہ کیا تھا کہ اچانک مجھے شور کی سی آواز آئی' یوں جیسے بہت سے لوگ ایک ساتھ بولنے لگے ہوں پھر بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازوں نے تو مجھے دہلا ہی دیا۔ یہاں تو چھپنے کی بھی کوئی جگہ نہ تھی۔ چھپنے کے لیے یا تو مجھے نیچے واپس اس کباڑ تک جانا پڑتا یا پھر سیڑھیاں عبور کر کے اوپر جانا پڑتا۔ میں عجیب شش و پنج میں تھی کہ قدموں کی آہٹ اور بولنے کی آوازیں تیزی سے قریب آتی محسوس ہوئیں۔ اب آواز کافی واضح تھی۔ وہ کئی مرد تھے جو زور زور سے بول رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا پھر تیزی سے اس جانب بھاگ اٹھی جدھر سے یہاں تک پہنچی تھی۔

شاید چند ثانیوں کا فرق ہوا ہو گا ورنہ میں بری طرح پھنس جاتی۔ میں ابھی اس کباڑ کی آڑ میں پہنچی بھی نہ تھی کہ اسی اجنبی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ وہ ایسا نہ کرتا تو جانے کیا ہو جاتا۔ میرے آڑ میں ہوتے ہی کچھ لوگ تیز تیز قدم اٹھاتے سیڑھیوں تک پہنچ گئے۔ اب تک

میں کسی آواز کو نہیں پہچان پائی تھی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ میں اپنے حواسوں میں ہی نہ تھی کہ کسی آواز کو پہچان پاتی۔ اتنا میں ضرور جانتی تھی کہ یوں حویلی کے اندرونی حصے میں دندناتے ہوئے چلے آنے والے خاندان ہی کے لوگ ہو سکتے ہیں اور عین اسی لمحے جو آواز میرے کانوں میں پڑی وہ مانوس آواز تھی۔ میں نے چاہا کہ بولنے والے کو دیکھ پاؤں لیکن یہاں سے حرکت بھی ان لوگوں کو متوجہ کر سکتی تھی۔ آنے والے سیڑھیوں پر چڑھتے چلے گئے۔ میں نے خود کو کباڑ کے پیچھے چھپالیا تھا اور سانس روکے بیٹھی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ اس اجنبی کی اس وقت کیا کیفیت تھی اور کیا سوچ رہا تھا۔ میری اس شخص کی جانب پشت تھی اور میں ہلنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ میری قوتِ سماعت اس وقت بہت حساس ہو چکی تھی۔ پورا بدن اور اس کی تمام حسیں جیسے صرف سماعت کی حس میں تبدیل ہو کر رہ گئی تھیں۔ سیڑھیوں پر پڑنے والے بھاری قدموں کی دھمک مجھے اپنے سینے پر محسوس ہو رہی تھی۔ میں پورا دھیان دینے کے باوجود اس آواز کو پہچان نہ پائی تھی۔ نہ ہی یہ سمجھ میں آیا تھا کہ مسئلہ کیا ہے۔ آوازیں تو آ رہی تھیں مگر اتنی صاف نہیں تھیں کہ اصل معاملے کا پتا چلتا۔ بہرحال مجھے نہ جانے کب تک یہیں بیٹھنا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہوا میں خنکی بے پناہ بڑھ چکی تھی' اوس بھی پڑ رہی تھی۔ سردی اچھی خاصی تھی اور میرے بدن پر ایک موٹی چادر کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ چادر بھی مجھے عبدالقادر کی بہن نے دی تھی۔ میرے بدن میں ہلکی سی کپکپی دوڑنے لگی' نہ معلوم یہ سردی کی وجہ سے تھی یا خوف کی وجہ سے۔ میں نے دانت پر دانت جما لیے۔ اب اوپر جانے والے اتنی دور جا چکے تھے کہ ان کی آوازیں بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اجنبی غائب ہو چکا تھا۔ میں نے چاروں طرف اسے تلاش کرنے کی کوشش کی مگر وہ جانے کب اور کہاں غائب ہو گیا۔ یہاں تو دو ہی راستے تھے' ایک پچھلی طرف کی دیوار اور دوسری طرف یہ راہداری جس پر میری نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ وہ دیوار کود کے جا چکا ہے۔

میں نے کچھ دیر اس اجنبی کے بارے میں سوچنے کے بعد اپنے ذہن سے ان فضول سوچوں کو جھٹک دیا اور سوچنے لگی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے اب سے پہلے بھی ہر قدم بغیر سوچے سمجھے اٹھایا تھا۔ اب بھی میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ جب مجھے کاکے کے بارے میں ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی کہ وہ حویلی میں ہے تو میں نے یہاں آنے کا کیوں سوچا؟ اور سوچا ہی

تھا (میں سونیا کو ختم کرنے کا سوچ چکی تھی) تو یہ تو اندازہ لگا لینا چاہیے تھا کہ حویلی میں کون کون ہے۔ چوہدری نیاز کا تو مجھے یقین تھا کہ وہ ملک کاما کے پاس ہو گا مگر جانے کیوں میں ایسا سوچ رہی تھی۔ اب تو مجھے وہاں سے فرار ہوئے کتنے دن گزر چکے تھے۔ وہ بھلا اب تک ملک کاما کے پاس کیوں ہو گا۔ وہ تو' میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک چونک اٹھی۔ مجھے ایسی آواز آئی تھی جیسے کوئی عورت دبی دبی سسکیاں لے رہی ہو۔ یہ آواز سیڑھیوں کی پچھلی طرف سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اوپر جانے والے لوگ ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ گویا خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا اس لیے میرا یہاں سے آگے بڑھنا بھی خطرناک تھا۔ میں نے سسکیوں کی آواز کو غور سے سن کر اندازہ لگانا چاہا مگر سوائے اس کے کہ کوئی عورت شدید تکلیف میں ہے اور سسکیاں لے رہی ہے اور کچھ اندازہ نہ کر پائی۔ وہ آواز یقیناً سونیا کی نہیں تھی۔ سونیا کی آواز تو میں لاکھوں آوازوں کے شور میں بھی پہچان سکتی تھی۔ یہ کسی اور کی آواز تھی۔ میں وہیں دبکی اوپر دیکھتی رہی۔ مجھے یوں بیٹھے ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ میں نے اچانک ہی چوہدری نیاز کی دھاڑ سنی۔ وہ کسی کے اوپر برس رہا تھا۔ آواز بہت صاف اور واضح تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"تم سے کس بے وقوف نے کہا تھا کہ اسے اٹھا کر یہاں لے آؤ۔"

"چوہدری جی! مینوں تے عبدالکادر آکھیا سی۔"

"وہ کتے کا بچہ..... بے وکوف کی اولاد..... عشک کا بھوت سوار ہے اس پر۔ لے جاؤ اسے..... میں یہاں..... اس حویلی میں ایسا کوئی ثبوت نہیں چھوڑنا چاہتا۔ جاؤ عبدالکادر کو بلا کر لاؤ۔"

وہ نہ جانے کسے لے جانے کی بات کر رہا تھا۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ اسی عورت کی بات کر رہا ہے جس کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ چوہدری نیاز اس وقت بڑے غصے میں لگ رہا تھا۔ میں نے سیڑھیوں سے کسی کے اترنے کی آہٹ سنی۔ اترنے والا میرے اندازے کے مطابق سیڑھیوں کی پچھلی طرف بنے کوٹھری نما کمروں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں اوندھی لیٹی جھانک رہی تھی۔ پھر اس نے ایک دروازہ کھولا جس میں یقیناً تالا پڑا تھا' کیونکہ میں بہت دیر تک چابیوں کے گچھے کی آواز سنتی رہی تھی۔ اس شور میں سسکیاں بھی اچانک بند ہو گئی تھیں۔ میرا سارا دھیان اب اس مظلوم عورت کی طرف تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ آدمی اس عورت کو لے کر کہاں جائے گا۔ میرا جی تو چاہا تھا کہ میں اس شخص کا پیچھا کروں مگر

مسئلہ پھر وہی تھا کہ سیڑھیوں پر شاید چوہدری نیاز یا اس کے آدمی موجود تھے اور ان کی باتیں کرنے کی مدہم آواز اب بھی آ رہی تھی۔ میں یہاں سے نکلتی تو سوائے اس کے کہ ان تاریک کمروں میں ایک اور کمرا آباد ہو جاتا اور پھر وہاں میری سسکیاں گونجنے لگتیں کچھ بھی نہ ہوتا۔

"او دینو.....!" اچانک چوہدری کی دھاڑ پھر گونجی۔ "وہ چھوکرا کدھر ہے۔"

"وہ اوپر کے کمرے میں اے چوہدری جی۔" ایک اور آواز سنائی دی۔ یہ شخص شاید سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ "چوہدری جی! اس نے بہت تنگ کیتا اے۔ اتی چوٹیں کھا کر بھی اس کے بدن میں بھری بجلی نئیں کم ہوئی۔"

"ساری بجلی آف کر دوں گا۔ سالا چوہے کی اولاد۔ اس کا باپ میری گرد کو نہیں پہنچ سکا تو یہ بھلا کیا کرلے گا۔" چوہدری نیاز کے لہجے میں گھمنڈ تھا۔ چوہدری نیاز کی آواز کے ساتھ ہی اس کے بھاری جوتوں کی آواز ابھری اور پھر معدوم ہو گئی۔ مجھے حیرت صرف ایک بات پر تھی کہ سونیا کہاں ہے یہاں تو جس طرح یہ کھیل جاری تھا۔ اس سے لگتا تھا کہ سونیا حویلی میں نہیں ہے اور میری اطلاع کے مطابق اسے یہیں ہونا چاہیے' ہاں اگر وہ خالہ فاطمہ کے گھر جانے کے بعد پھر بھائی کے گھر روانہ ہو چکی تھی تو اور بات تھی۔ ویسے حالات یہی بتا رہے تھے کہ سونیا جا چکی ہے۔ ورنہ حویلی میں زنانیوں کی موجودگی میں چوہدری نیاز کے چیلے یوں نہ گھوم رہے ہوتے۔

سیڑھیوں کے پیچھے جانے والا آدمی اب کسی سائے کو گھسیٹتا ہوا لا رہا تھا۔ وہ عورت تھی۔ شاید وہی عورت جو کچھ دیر پہلے سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ میں چوکنی ہو کر بیٹھ گئی۔ اسے گھسیٹ کر لانے والا آدمی سیڑھیوں پر موجود آدمی کے پاس رک گیا پھر اس کی سرگوشی ہوا کے دوش پر سوار مجھ تک پہنچی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "یار مینوں تے ڈر لگتا اے۔ یہ عبدالقادر کی لیلیٰ اے۔ اس نوں پتا لگیا تے..... ہُن میں اینوں کتھے لے جاواں۔ چوہدری جی آکھدے نے کہ اینوں گم کرو۔"

"ماجھے! تو اینوں عبدالقادر دے کار لے جا۔ اتھے عبدالقادر نہ ہویا تے ریشم ہوئے گی۔ اونوں دے آئیں۔ اے چوہدری جی چنگا نہیں کردے..... عبدالکادر تے ناگ اے گا۔" بولنے والا شاید چوہدری نیاز کے خلاف تھا یا اس کے دل میں اس کے خلاف زہر ضرور تھا جو اس کے لہجے سے ٹپک رہا تھا۔ دوسرا شخص بھی چوہدری نیاز سے زیادہ عبدالقادر سے خوفزدہ

تھا۔

وہ لڑکی جو اب تک سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔ اچانک بول اٹھی۔ "مینوں چھڈ دیو پراجی۔ رب دے واسطے مینوں چھڈ دیو۔"

"چل چل..... جلدی کر..... چوہدری نے دیکھ لیا تو....." سیڑھیوں پر کھڑا آدمی بول اٹھا۔

پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ شخص جسے ماجھے کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا' وہ لڑکی کو کلائی سے پکڑ کر آنگن کی طرف بڑھ گیا۔ میرا جی چاہا کہ کوئی اینٹ اٹھا کر اس کے سر پہ دے ماروں۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے باہر نکلنے کا سوچ لیا۔ یہاں بیٹھے بیٹھے تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ الٹی مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اجنبی بھی جانے کہاں چلا گیا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ باہر سے تو یہاں پہنچنے میں آسانی ہوئی تھی کہ وہاں سیڑھی اور بجری کا ڈھیر تھا مگر یہاں سے وہ ڈھیر جس کے پیچھے میں چھپی ہوئی تھی وہ دیوار سے کافی دور تھا' اتنی اونچی سپاٹ دیوار پر چڑھنا میرے لیے ممکن ہی نہ تھا۔ اب صرف دوسرا راستہ ہی رہ جاتا تھا' وہ تھا آنگن سے بیرونی دروازے کا۔ گویا مجھے یہاں اس وقت تک چھپا رہنا تھا جب تک یہ تمام لوگ واپس نہ چلے جاتے۔ میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ چوہدری نیاز یہاں اوپر کیا کرنے آیا ہے۔ وہ تو کبھی کبھی ہی جب بڑی زمیندارنی زندہ تھی تب اسے دیکھنے آیا کرتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت باہر چوپال پر یا نیچے اپنے کمرے میں گزرتا تھا۔ میں گہرا سانس لے کر ان لوگوں کے جانے کا انتظار کرنے لگی۔

میں نہیں جانتی تھی کہ میں وہاں سردی میں کتنی دیر تک بیٹھی رہی۔ وقت کے گزرنے کا مجھے کچھ بھی پتا نہ چلا۔ میری آنکھوں میں تو مامی کی وحشت ناک صورت گھومتی رہی۔ بابا کی ویران آنکھوں سے اٹھتا حسرتوں کا دھواں سا چکراتا نظر آتا رہا یا خالہ فاطمہ کی آنکھوں میں پھیلتی ہوئی دہشت دکھائی دیتی رہی۔ کاکے کا خیال آتا رہا اور اس کی گہری خاموشی کا احساس ہوتا رہا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ ننھا سا بچہ جسے میں گود میں لے کر گلیوں پھرتی تھی' وہ اتنی جلدی اتنا بڑا ہو گیا کہ باپ کا بدلہ لینے یہاں تک آ پہنچا۔ اس خیال نے میرا دل بھینچ لیا کہ جانے وہ اس وقت کہاں بھٹک رہا ہو گا۔ اب تک یہ تو پتا نہیں چلا تھا کہ وہ کہاں ہے مگر غیر ارادی طور پر مجھے یہاں بھی اس کا انتظار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یوں بھرے گھر سے باپ کا تیجا

چھوڑ کر رات کی تاریکی میں یہاں تک آنے والا کاکا خاموشی سے نہیں بیٹھے گا۔ وہ کسی بھی حال میں چوہدری نیاز تک ضرور پہنچے گا۔ میں اسے بچانا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ چوہدری نیاز کے ہاتھ نہ لگے۔ اب مجھے اپنی بے وقوفی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ مجھے پہلے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیے تھیں مگر میں یہ معلومات کیسے حاصل کرتی؟ یہ ایک بڑا مسئلہ تھا شاید اس لیے میں یہاں تک آ پہنچی تھی۔

ابھی میں یہ سب کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ میں نے سیڑھیوں پر بھاری جوتوں کی دھمک محسوس کی۔ میں نیچے ہو کر دبک کر بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اوپر جانے والے لوگ واپس آ رہے ہیں۔ اس وقت چوہدری کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی سے پوچھ رہا تھا۔ "ہاں۔ ماجھا گیا؟"

"ہاں چوہدری جی چلا گیا۔" کسی دوسرے شخص نے جواب دیا۔

"اور وہ مصیبت؟"

"اس کو نال ہی لے گیا اے۔"

"کدھر؟"

"نہ جی' یہ تو نہیں پتا۔"

"اوہ..... تم لوگوں کی عقلوں کو کیا ہو گیا ہے؟ چوہدری فیاض اگر یہاں تک پہنچ گیا تو..... اور ہاں سنو!" اب اس کی آواز دھیمی ہو گئی تھی۔ میں باوجود کوشش کے نہیں سن پائی کہ اس نے کیا کہا۔ بس ایک بھنبھناہٹ سی سنائی دی پھر اس دوسرے آدمی کی آواز آئی۔

"آپ نے دستخط تو لے لیے ہیں ناں؟"

"ہاں..... پھر بھی میں نہیں چاہتا کہ کوئی گڑبڑ ہو۔ ویسے میں نے عبدالکادر کو بھیج دیا تھا۔ وہ پکی سڑک پر گھات لگائے بیٹھا ہو گا۔ تم بھی چلے جاؤ اور عبدالکادر سے کہنا کہ ان میں سے کوئی بھی بچنا نہیں چاہیے۔ اگر پہلے جیسی بے وکوفی کی تو کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس بار کوئی بھی بچا تو.....!"

"آپ فکر نہ کرو جی۔"

"اور ہاں تم فاصلے پر رہنا۔ جیسے ہی عبدالکادر سب کو بھون ڈالے۔ آخری گولی تم چلاؤ گے' سمجھے۔ میں کوئی ثبوت نہیں چھوڑنا چاہتا اور اس چھوکرے کو الٹا لٹکا کر چھوڑ دو۔ نہیں تم

نہیں۔ چل او گلو..... تو جا اوپر۔"

چوہدری نے شاید کسی اور شخص سے کہا تھا۔ جس کے جواب میں ایک ممیاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"جی چوہدری جی.....!"

"اسے صرف الٹا لٹکا کر چھوڑ دینا۔ مارنا نہیں اے..... اس کے بدن پر نشان کوئی نہیں ہونا چاہیے۔ کھون دماگ میں جم جائے گا تو اپنے آپ جان دے دے گا۔ مکوڑے جتنا تو ہے سالا..... چلا تھا چوہدری نیاز سے ٹکر لینے۔" اس نے حقارت سے کہا اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے چار اور آدمی بھی تھے جو سبھی مسلح تھے۔

میں اب ان لوگوں کو باآسانی دیکھ سکتی تھی اس لیے کہ میری جانب ان سب کی پشت تھی۔ وہ لوگ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو میں نے ذرا سا اچک کر سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ ایک دبلا پتلا سا آدمی سیڑھیوں سے اوپر جا رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ چوہدری نیاز کی باتیں تیر کی طرح دل میں پیوست ہو چکی تھیں۔ میں جان گئی تھی کہ چوہدری فیاض آنے والا ہے جس کو مارنے کے لیے چوہدری نے عبدالقادر کو بھیجا ہے اور عبدالقادر کو ختم کرنے کے لیے اس نے ابھی ابھی میرے سامنے اس شخص کو بھیجا ہے' دوسری بات جس نے میرے حواس معطل کر دیے تھے وہ کسی لڑکے کا ذکر تھا۔ نہ جانے وہ کس چھوکرے کی بات کر رہا تھا۔ ممکن ہے یہ وہی اجنبی ہو جسے میں کچھ دیر پہلے یہاں دیکھ چکی تھی۔ وہ تو ایسے غائب ہو گیا تھا جیسے کوئی جن ہو مگر پھر میں نے خود ہی اس خیال کو مسترد کر دیا۔ اگر وہی اجنبی ہوتا اور وہ اسے اوپر لے جاتے تو میں ضرور دیکھ لیتی۔ یہ کوئی ایسا شخص تھا جسے میرے یہاں آنے سے پہلے ہی اوپر لے جایا جا چکا تھا۔

ایک سرگوشی میرے اندر ہلچل مچا گئی کہ وہ چھوکرا کاکا بھی ہو سکتا ہے۔ میرے ہاتھ پیروں میں ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے آنے لگے حالانکہ جب میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا اور جب میں دیوار پھاند کر یہاں پہنچی تھی تو میرے حوصلے بہت بلند تھے۔ چوہدری نیاز کو ختم کرنے کے سوا میرے دماغ میں اور کچھ بھی نہ تھا۔ عبدالقادر کی بہن کا دیا ہوا ریوالور اب بھی میرے پاس تھا۔ چوہدری نیاز میرے سامنے سے گزرا تھا میں چاہتی تو ساری گولیاں اس کے بدن میں اتار سکتی تھی مگر ایسا کرنے میں خود میری جان کو بھی خطرہ تھا جب کہ میں اماں اور ابا کی لاش

سے کیا ہوا وعدہ نبھانا چاہتی تھی۔ میں اپنے گھر میں چراغ جلانا چاہتی تھی۔ اس کے بعد مجھے اپنی جان کی کوئی فکر نہ تھی۔ زندگی کی ساری خوب صورتیاں' بدصورتیوں میں بدل چکی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ مجھے مامی کے گھر نہ پا کر کادا کتنا پاگل ہو جائے گا۔ وہ جان جائے گا کہ میں کہاں ہوں مگر میں اب اسے یہاں نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ میں چوہدری نیاز کو ختم کر کے اس پر زندگی کو آسان بنانا چاہتی تھی۔ بابا کے چہرے کی رونق' اس کی آنکھوں میں ٹھنڈک اور اس کے بڑھاپے کے سہارے کو بچانا چاہتی تھی۔ اب تو ایک اور فکر گلے پڑ گئی تھی کہ چوہدری نیاز چوہدری فیاض کو مروانا چاہتا تھا۔ شاید چوہدری فیاض یہاں آ رہا تھا اور یہ بھی میں جان چکی تھی کہ عبدالقادر کو بھی خطرہ ہے۔ جس شخص کو آخری گولی چلانے کا حکم دیا گیا تھا وہ یہ آخری گولی عبدالقادر پر ہی چلاتا اس لیے کہ چوہدری نیاز کوئی ثبوت نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

اس بات کا خیال آتے ہی میرا دم گھٹنے لگا۔ چوہدری نیاز ایک ساتھ اتنے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار رہا تھا کہ میں کوشش کرتی بھی تو شاید کسی کو نہ بچا پاتی۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اوپر جا کر اس لڑکے کی جان بچاؤں یا باہر نکلنے کی کوشش کر کے چوہدری فیاض یا کم از کم عبدالقادر تک ہی پہنچ جاؤں' اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ گزرتے وقت نے مجھ سے میری قوتِ فیصلہ بھی چھین لی تھی۔ جوں جوں لمحے ہاتھ میں بھری ریت کی طرح پھسل رہے تھے' میرا دل گھبرایا جا رہا تھا۔ اچانک میں نے اپنی جان کی پروا نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں کسی نہ کسی کو ضرور بچانا چاہتی تھی۔ میں نے دیکھا' اب یہ حصہ سنسان تھا۔ میں جھکے جھکے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

دبے پاؤں سیڑھیاں عبور کر کے اوپر پہنچی۔ بڑی زمیندارنی کا کمرا باہر سے بند تھا۔ سونیا کے کمرے کے دروازے پر بھی تالا پڑا ہوا تھا۔ میں آگے ہی آگے بڑھتی رہی۔ ان دو کمروں کے بعد دو کمرے اور تھے۔ تیسرے دروازے پر باہر سے تالا نہیں تھا۔ میں وہیں دبک گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ آدمی اس کمرے میں آیا ہو گا۔ میں نے کان دروازے پر لگا دیا اور پھر دوسرے ہی لمحے اچھل پڑی۔ اندر گونجنے والی کراہ اتنی دردناک تھی کہ میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں جلدی سے وہاں رکھی ایک میز کے پیچھے ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ اندر جو بھی تھا اسے میرے اچھل پڑنے کی آہٹ ضرور سنائی دی ہو گی اس لیے کہ میرا ہاتھ بے اختیار دروازے پر پڑا تھا۔ میں کچھ دیر وہیں دبکی رہی مگر اندر جانے والا شخص باہر نہ آیا تو میں پھر

دروازے پر پہنچ گئی۔ باہر بالکل اندھیرا تھا اگر وہ نکلتا بھی تو فوری طور پر اس کی نگاہ مجھ پر نہ پڑتی۔ اندر سے کسی شخص کے کراہنے اور چیخنے کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ میرا دل لرزنے لگا۔ میں نے نیفے میں اُڑسا ہوا پستول نکال لیا۔ اتنا اندازہ مجھے ہو چکا تھا کہ اندر صرف دو ہی آدمی ہیں' ایک وہ جس پر تشدد کیا جا رہا ہے اور دوسرا وہ جو اس پر تشدد کر رہا ہے۔ نہ معلوم کیا سوچ کر میں نے دروازے پر ہلکے سے دستک دی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اندر سے اسی شخص کی ممیاتی ہوئی آواز آئی۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ دروازے پر کون ہے۔ میں نے آواز کو بدلنے کی پوری کوشش کرتے ہوئے کہا کہ وہ فوراً دروازہ کھلے کیونکہ اسے چوہدری نیاز نے نیچے بلایا ہے۔ اندر سے کچھ آوازیں آئیں پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں اس طرح کھڑی تھی کہ اگر دروازہ کھلتے ہی اندر کی روشنی باہر آتی تو براہِ راست مجھ پر نہ پڑتی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ "اب کیا ہے یار.....!"

"چلو....." میں نے آواز کو بھاری بنا کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔

وہ جونہی دروازہ بند کرنے کے لیے مڑا۔ میں نے ہاتھ میں پکڑے ریوالور کے دستے سے اس کے سر پر پوری قوت سے وار کیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اوندھا ہو گیا۔ میں نے اس کے گرتے ہی ایک اور زوردار ہاتھ مارا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بے حس و حرکت ہو چکا ہے تب میں نے ریوالور پھر نیفے میں اُڑسا اور اسے گھسیٹتی ہوئی اسی کمرے کے اندر لے گئی۔ اندر بجلی کی روشنی نہیں تھی بلکہ دیوار میں بنے کارنس پر لیمپ رکھا تھا۔ جس کی چمنی دھویں سے کالی ہو رہی تھی۔ اس میں سے آنے والی روشنی کی کرنیں عجیب وحشت ناک سا ماحول پیدا کر رہی تھیں۔ میں نے اس آدمی کو ایک طرف ڈال کر سب سے پہلے دروازہ بند کیا پھر تیزی سے سر گھما کر دیکھا تو میرے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ کمرے کے بیچ میں ایک شخص الٹا لٹکا ہوا تھا۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ اس کے بدن پر برائے نام کپڑے تھے ورنہ تو کچھ چیتھڑے سے تھے جو لٹک رہے تھے اور ان چیتھڑوں نے اس کے چہرے کو چھپایا ہوا تھا۔ دھوتی یا شلوار کی جگہ اس کے بدن پر سیاہ پتلون دیکھ کر میں حیران تھی لیکن ایک اطمینان سا ہو بھی ہو گیا تھا کہ وہ کاکا نہیں تھا۔ میں تیزی سے گھوم کر دوسری طرف چلی گئی۔ یہاں ہلکی روشنی میں جب میں نے اس شخص کا چہرہ دیکھا تو حیرت سے اچھل پڑی۔ وہ چوہدری فیاض کا بیٹا تھا۔ وہی ڈاکٹر بیٹا جس سے میں پہلی بار کراچی کے اس اسپتال میں ملی تھی جہاں بعد میں مجھے

چوہدری فیاض نے بلایا تھا اور جہاں عبد القادر نے مجھے کچلنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ میں نے جلدی جلدی نگاہ چاروں طرف دوڑائی۔ یہاں ایسی کوئی چیز نہ تھی جس سے میں رسی کو کاٹتی۔ پھر میں نے لیمپ اٹھالیا' لیمپ کو اس کے قریب لا کر رکھ دیا اور اس کے چہرے کو تھپتھپانے لگی۔ وہ ہوش میں تھا۔ اس نے فوراً ہی اپنی آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحے وہ خالی خالی آنکھوں سے مجھے تکتا رہا۔ "ڈاکٹر! ہوش میں آؤ۔ جلدی کرو۔ چوہدری فیاض کی زندگی خطرے میں ہے۔ جلدی کرو..... میں..... میں آگ سے رسی کو جلاتی ہوں۔ تم خیال کرو۔" اتنا کہتے ہی میں نے لیمپ کی چمنی اتار دی اور آگ کے ننگے شعلے کو اس کے پیروں کے قریب رسی پر لگا دیا۔ ایسا کرنے کے لیے مجھے منجھی کا سہارا لینا پڑا تھا جو ایک کونے میں پڑی تھی۔ میں نے اس منجھی کو سرکا کر اس کے قریب کر لیا تھا اور خود اس پر کھڑی ہو گئی تھی۔ رسی کافی موٹی تھی' اسے جلنے میں بڑا وقت لگ رہا تھا۔ میں سخت پریشان تھی' کبھی کبھی میں اس شخص کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی جو دروازے کے قریب بے حس و حرکت پڑا تھا' پتا نہیں وہ مر گیا تھا یا بے ہوش تھا۔ جو کچھ بھی تھا اتنا وقت نہیں لگنا چاہیے تھا۔ پتا نہیں چوہدری فیاض کو کب آنا تھا۔ کب وہ گاؤں کے باہر پکی سڑک پر پہنچتا اور مارا جاتا۔ میں نے کسی نہ کسی طرح اسے رہا کیا۔ اس دوران میں' میں اسے یہ بھی بتا چکی تھی کہ چوہدری نیاز کے کیا ارادے ہیں۔ میں نے اسے کہا تھا کہ وہ کسی بھی طرح پکی سڑک پر پہنچ جائے۔ گو اس کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ اتنی تیزی سے یہ سب کچھ کر سکتا مگر جہاں موت بانہیں پھیلائے بڑھ رہی ہو وہاں آدمی کی قوتِ مدافعت بے پناہ بڑھ جاتی ہے۔ وہ جوں ہی آزاد ہوا' میرا بازو پکڑ کر تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ آنگن کی طرف سے جانا خطرناک تھا۔ میں ڈاکٹر کو لے کر اس کاٹھ کباڑ کی طرف آ گئی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں یہاں سے اندر داخل ہوئی تھی۔ اس نے بڑی تیزی سے چند اینٹیں دیوار کے ساتھ رکھیں پھر ان اینٹوں پر پیر رکھ کر میں نے دیوار کی منڈیر پکڑ لی تو اس نے مجھے اوپر چڑھنے میں مدد دی پھر وہ بھی چند ہی لمحوں بعد کود کر باہر آ گیا۔ ہم وہاں ایک منٹ بھی نہ رکے۔ مجھے اس طرف سے کچی سڑک کا راستہ معلوم تھا۔ وہ راستہ بھلا میں کیسے بھول سکتی تھی جو پہلی بار مجھے میرے گاؤں سے ان بھول بھلیوں میں لے گیا تھا جہاں میں آج تک بھٹک رہی تھی۔ یہ راستہ تو وہ راستہ تھا جہاں قدم رکھنے سے پہلے ہی میں زندگی کی ہر نعمت سے محروم ہو چکی تھی۔ جہاں سے خوف کا دیو میرے پیچھے لگا تھا اور اس

دیو کے شکنجے سے آج بھی آزاد نہیں ہو سکی تھی۔

ڈاکٹر میرے پیچھے پیچھے تھا۔ اس نے مجھ سے راستے کے بارے میں پوچھا پھر یہ معلوم کیا کہ میں یہاں تک کیوں اور کیسے پہنچ گئی تب میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ اسے بتایا کہ مامی کی گود اجڑتی نہیں دیکھ سکتی۔ اس کا سہاگ تو میری وجہ سے اجڑ گیا۔ میں کاکے کو لے جانا چاہتی ہوں اور اسی کو دیکھنے یہاں تک پہنچی تھی مگر وہ شاید ابھی تک چوہدری نیاز کے ہتھے نہیں چڑھا۔ میں نے چوہدری نیاز سے بدلہ لینا ہے۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ اس سے پہلے جب اس نے چوہدری فیاض پر حملہ کرایا تھا تو اس نے میرا' کادے کا اور بابا کا نام لیا تھا۔

"میں جانتا ہوں۔" اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "بابا کو بھی یقین تھا کہ حملہ چاچا ہی کے آدمیوں نے کیا تھا۔ وہ بال بال بچ گئے ورنہ گولی ان کی پسلی توڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔"

یہ سن کر کہ حقیقت سے وہی نہیں چوہدری فیاض بھی واقف ہے' میرے دل میں چبھی پھانس سی نکل گئی۔ اب ہم پکی سڑک کے قریب پہنچ چکے تھے۔ یہ تھوڑا سا راستہ خودرو جھاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے بعد ہی پکی سڑک تھی۔ میں ڈاکٹر کو لے کر ان جھاڑیوں میں گھس گئی۔ میں جانتی تھی کہ یہیں قریب ہی کہیں عبد القادر ہو گا اور پھر اب تو وہ دوسرا شخص بھی پہنچ گیا ہو گا یا پہنچنے والا ہو گا جسے عبد القادر کو مارنے کا حکم دیا گیا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ کسی طرح عبد القادر کو بتا دوں کہ اس کی جان کو خطرہ ہے۔ اسے دکھاؤں کہ ان چوہدریوں سے وفاداری کا صلہ کیا ہوتا ہے۔ مگر وہ مجھے اب تک کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا وہ اس سڑک پر آگے کی طرف جس قدر دور تک ہو سکے چلا جائے۔ انہی جھاڑیوں کی آڑ میں رہ کر وہ کافی دور تک جا سکتا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ چوہدری فیاض کی گاڑی کو گاؤں سے دور ہی روک دیا جائے۔ ڈاکٹر مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر میں عبد القادر کو تلاش کرنا چاہتی تھی۔ میری نگاہوں میں ریشم کا معصوم چہرہ گھوم رہا تھا جو عبد القادر کے بعد بالکل بے آسرا رہ جاتی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ یوں بے خبری میں مارا جائے۔ میں نے ڈاکٹر کو جلدی جانے کو کہا۔ وہ کچھ پریشان پریشان سا چلا گیا۔ وہ مجھے یہاں نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں ہلکے قدم اٹھاتی ہوئی جھاڑیوں سے باہر آ گئی' تبھی گاؤں سے آنے والے رستے پر ایک سایہ سا آتا نظر آیا۔ میں پلٹ کر پھر جھاڑیوں میں دبک گئی۔ اب میری نگاہیں اس سائے پر تھیں جو جھومتا جھامتا چلا آ رہا تھا۔ اس کے کندھوں پر رائفل لٹکی ہوئی

تھی۔ قد کاٹھ سے وہ عبدالقادر لگ رہا تھا۔ میں جھاڑیوں میں دبکی دعا کرتی رہی کہ وہ اس طرف نہ آجائے۔ خدا نے میری دعا سن لی' وہ اس طرف آنے کی بجائے دوسری جانب چلا گیا۔ سڑک کی دوسری جانب ایک کچی دیوار سی کھڑی تھی۔ وہ اس دیوار کے عقب میں چلا گیا۔ میرا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یہ وہی عبدالقادر تھا جس کی آہٹ سے بھی میرا دم لبوں پر آتا تھا۔ آج میں اس کے قریب کھڑی تھی اور صرف یہی نہیں بلکہ سوچ رہی تھی کہ اسے کیسے بتاؤں کہ چوہدری نیاز اس کی جان کے درپے ہے۔ کیا وہ یقین کرلے گا کہ میں سچ کہہ رہی ہوں؟ اور سب سے پہلے تو وہ مجھے ہی قابو کرے گا۔ میں تو اسے جانے کب سے مطلوب تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں اور کیسے اسے یقین دلاؤں۔ میں اسی شش و پنج میں تھی۔ عبدالقادر اسی کچی دیوار کے پیچھے چھپ چکا تھا۔ صرف اس کے شانے اور چہرہ باہر تھا۔ میں عین اس کے سامنے جھاڑیوں میں چھپی اسے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اگر اسے پتا چل جائے کہ وہ زینو جسے وہ اور چوہدری نیاز جانے کب سے تلاش کرتے پھر رہے تھے' وہ آج اس کے مدِمقابل کھڑی ہے تو اس کی کیا حالت ہوگی۔ بہرحال میں وہاں دبکی رہی اور سوچتی رہی کہ کیا کروں' دوسری طرف مجھے چوہدری فیاض وغیرہ کی بھی فکر تھی۔ اگر ڈاکٹر انہیں روکنے میں کامیاب نہ ہوسکا تو ذرا ہی دیر بعد یہاں اندھیری اور سنسان سڑک پر لاشیں پڑی ہوں گی۔ میں آج زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بچانا چاہتی تھی۔ ان تمام لوگوں کو جن کی موت کے پروانے پر آج ہی چوہدری نیاز نے مہر ثبت کی تھی۔

میں ابھی سڑک پر دور کہیں سے آنے والی گاڑیوں یا جیپ کو تلاش کر رہی تھی کہ اچانک جھاڑیوں میں آہٹ سی سن کر چونک اٹھی۔ میں نے زمین پر بیٹھ کر خود کو پوری طرح گٹھڑی کی شکل میں تبدیل کرلیا۔ مجھے یقین ہوچکا تھا کہ یہاں کوئی ہے۔ میں نے کان زمین سے لگائے تو مجھے آواز کا بخوبی اندازہ ہوگیا۔ آنے والے قدموں کی آہٹ مجھ سے کافی دور تھی مگر آنے والا اسی سمت میں آرہا تھا۔ میں گھٹنوں اور کہنیوں کے بل الٹی سمت چل پڑی۔ یعنی میں اس طرف جارہی تھی جس طرف میرے پیر تھے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میں آنے والے کی نگاہوں میں آؤں۔ میرے کان آواز کی سمت کا اندازہ لگا رہے تھے۔ اب آنے والا رک گیا تھا۔ وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھا۔ ممکن ہے یہ وہ شخص ہو جسے چوہدری نیاز نے عبدالقادر کو ختم کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ یوں تو میں اب مشکل میں گھر گئی تھی۔ نہ ہی اب میں

سڑک عبور کرکے عبدالقادر تک پہنچ سکتی تھی۔ عین اسی لمحے مجھے کسی کی سرگوشی سنائی دی۔ کوئی بول رہا تھا۔ پھر عورت کی آواز آئی۔ اس عورت کی آواز بھرائی ہوئی تھی' بھیگی ہوئی تھی' یوں لگتا تھا جیسے وہ عورت رو رہی ہو۔ میں نے سارا دھیان آنے والوں کی طرف کردیا۔ میں سمجھ نہیں پائی تھی کہ آنے والے کون لوگ ہیں لیکن اب وہ لوگ مجھ سے قریب ہوگئے تھے۔ میں گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھی تھی تاکہ جھاڑیاں ہل کر میری موجودگی کو ثابت نہ کردیں۔

وہ لوگ شاید ایک جگہ تھم گئے تھے۔ آہٹ اب نہیں آرہی تھی مگر سرسراتی جھاڑیاں ان کی موجودگی کا ثبوت تھیں۔ میں چند لمحے تو یونہی دبکی بیٹھی رہی پھر میں نے بے آواز آگے کی سمت بڑھنا شروع کردیا۔ میں ان لوگوں سے اتنا قریب ہونا چاہتی تھی کہ ان کی سرگوشیاں جملے بن کر میری سمجھ میں آنے لگیں۔ قریب جاتے ہی مجھے ہلکی سسکیوں کی آواز سنائی دی' نہ معلوم کیوں مجھے یہ احساس ہوا جیسے یہ سسکیاں میں اب سے پہلے بھی سن چکی ہوں۔ جلد ہی مجھے یاد بھی آگیا اور میں یہ جان کر حیرت زدہ رہ گئی کہ یہ اس عورت کی سسکیاں تھیں جسے کچھ ہی دیر پہلے چوہدری نیاز نے ٹھکانے لگانے کے لیے حویلی سے باہر بھیجا تھا۔ اب ان کی گفتگو میری سمجھ میں آرہی تھی۔ وہ یقیناً ماجھا اور وہی عورت لیلیٰ تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ ماجھا اس شخص کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کرتے ہوئے لیلیٰ کو عبدالقادر کے گھر' اس کی بہن کے پاس لے کر جائے گا مگر وہ دونوں یہاں جھاڑیوں میں کیا کر رہے تھے۔ کچھ دیر تو اس لڑکی کی سسکیوں کی آواز سنائی دیتی رہی پھر وہ بولی تو میں حیران رہ گئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "عبدالقادر! چوہدری نیاز مجھے مارنا چاہتا تھا' تو یقین کیوں نہیں کرتا؟"

"اونہ اوئے..... جھلی ہے تو..... وہ تو خود اپنے چکر میں ہے۔ اس پر شک نہ کر' مائی باپ ہے وہ ہمارا۔" وہ سو فی صد عبدالقادر کی آواز تھی۔

"کیوں..... تجھے ماجھے نے کچھ نہیں بتایا؟" وہ سخت غصے میں تھی۔

"ہاں بتایا تھا۔ بولتا تھا' چوہدری جی نے بولا ہے اسے یہاں سے لے جاؤ۔ چوہدری فیاض یا اس کا کوئی آدمی یہاں پہنچ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ وہ حویلی میں کوئی ایسا ثبوت نہیں چھوڑنا چاہتا تھا جس سے اس کی گردن پھنسے۔"

"تیری عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں عبدالقادر..... تو اندھا ہوگیا ہے۔ اس کی حرام کی

کمائی نے تیری آنکھوں پر چربی چڑھادی ہے۔"

واقعی عبدالقادر کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ اس کی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ وہ اندھا ہو چکا تھا' اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ لیلیٰ کے سمجھانے پر بھی کچھ نہیں سمجھ رہا تھا۔ میں برداشت نہ کر سکی اور چادر کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر دبے پاؤں آگے بڑھی۔ یہ بڑا غنیمت تھا کہ یہاں عبدالقادر تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سڑک کے دوسری طرف کچی دیوار کی آڑ میں وہ شخص تھا جسے چوہدری نے عبدالقادر پر آخری گولی چلانے کا حکم دیا تھا۔ غالباً اسے علم تھا کہ عبدالقادر انہی جھاڑیوں میں چھپ کر چوہدری فیاض پر حملہ کرے گا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں سامنے آجاؤں۔ مجھے امید تو نہیں تھی کہ عبدالقادر فوری طور پر مجھے پہچان پائے گا۔ اس نے تو مجھے اس وقت دیکھا تھا جب بابا کو مارا گیا تھا۔ اب اتنے برس بعد اور اتنی تاریکی میں میرا پہچان لیا جانا ناممکن نہیں تو کم از کم مشکل ضرور تھا۔ میں بغیر آہٹ پیدا کیے آگے بڑھی تھی مگر اس نے آہٹ کو محسوس کر لیا اور چوکنا ہو کر تیزی سے پلٹا۔ اس نے کاندھے پر لٹکی رائفل اتار کر اس کا رخ میری طرف کر لیا تھا اور گرج کر بولا۔

"کون اے؟"

"قادر بھا..... میں..... میں ہوں تیری بہن....." میں نے جلدی سے کہا اور اس کے سامنے آگئی۔

"ریشم.....؟" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"نہیں..... پر ریشم جیسی ہوں بھا۔" میں نے کہا تو میری آواز بھیگ گئی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جی چاہا کہ وہ واقعی میرا بھائی ہوتا۔ میرا محافظ میرا رکھوالا' تب میں یوں کسی ویرانے میں' جھاڑیوں کے درمیان دبکی نہ بیٹھی ہوتی۔

"کون اے توں!" اس کا لہجہ کرخت ہو گیا۔

"بھا قادر! تیری جان خطرے میں ہے۔" میں نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر جلدی سے کہا۔ "اس کچی دیوار کے پار ایک شخص تیری گھات میں ہے۔ تو جیسے ہی چوہدری فیاض کو ختم کرے گا' وہ آخری گولی چلائے گا جو تیری زندگی کا خاتمہ کر دے گی۔"

"کیا بکتی ہے توں اور توں ہے کون؟" وہ ایک دم بدک گیا۔

"عبدالقادر اس کی بات تو سن۔" لیلیٰ ایک دم بول اٹھی۔

"بکواس کرتی ہے یہ....." وہ ہتھے سے اکھڑ گیا اور اس نے لپک کر میری کلائی پکڑ لی۔ "تجھے ان سب باتوں کا کیسے پتا لگا!" اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ میری کلائی دکھنے لگی۔

"میں..... میں حویلی میں تھی۔" میں نے سسکی لے کر کہا۔ میرے ہاتھ میں سخت درد ہو رہا تھا۔ "جب چوہدری نے ماجھے کو کہا کہ وہ اس کو لے جا کر ٹھکانے لگائے' تب میں وہیں تھی۔ وہ اسے لے گیا۔ وہاں کوئی دینو تھا جسے چوہدری نے اوپر فیاض کے بیٹے کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ اسے الٹا لٹکا دے اور پھر اس نے کسی سے کہا وہ تیرا پیچھا کر کے تجھے نظر میں رکھے' جوں ہی تو سب کو ختم کر دے' وہ تجھے بھی مار دے اس لیے کہ چوہدری کوئی ثبوت نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اگر تجھے میری بات کا یقین نہیں ہے۔ تو..... تو اس کچی دیوار کے پیچھے کھڑے آدمی کو دیکھ..... پوچھ اس سے۔" میں بولتی چلی گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ زور سے بولے یا اس آدمی تک یہ بات پہنچے کہ میں یا کوئی بھی عورت یہاں ہے۔ اسے تو اکیلے عبدالقادر کا انتظار ہو گا۔ یہ سب بتانے کے دوران میں' میں سڑک پر بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ میری نگاہ اسی طرف تھی جہاں سے چوہدری فیاض کو آنا تھا۔ سڑک ابھی تک تاریک اور سنسان تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔

یہ تمام باتیں سنتے ہی عبدالقادر کی گرفت میری کلائی پر ہلکی ہو گئی۔ وہ کچھ بے چین سا ہو گیا۔ گویا لوہا گرم تھا۔ میں اس موقعے کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی اسی لیے بولی۔ "بھا جی..... چوہدری کوئی ثبوت نہیں چھوڑتا۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو۔ اس نے اپنے آدمیوں سے کہا ہے کہ بات چوہدری فیاض نے بہت آگے تک پہنچا دی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی بھی موقعے پر مجھ پر کوئی بات آئے۔ میرے ہاتھ صاف ہیں جو کچھ بھی کیا گیا ہے اس میں عبدالقادر ملوث ہے' وہی میرے تمام معاملات کا گواہ ہے۔ اس کی زندگی مجھے پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتی ہے' اس لیے اس کا زندہ رہنا میرے لیے خطرناک ہے۔"

میری ان باتوں نے خاطر خواہ اثر ڈالا۔ اس نے میری کلائی چھوڑ دی۔ اب وہ اپنی مونچھ کو دائیں ہاتھ سے بل دے رہا تھا جو اس کے پریشان ہونے کا ثبوت تھا۔ چوہدری نیاز نے یہ سب نہیں کہا تھا مگر اس کا مقصد یہی تھا۔ وہ عبدالقادر کو مروا کر اپنے گناہوں یا کرتوتوں پر پردہ ڈالنا چاہتا تھا۔ میں نے عبدالقادر سے جھوٹ نہیں بولا تھا بلکہ اس کی بات' اس کے مقصد

کی وضاحت کی تھی۔ ایسا کرنا ضروری تھا۔

"توں..... توں کون اے؟" وہ اب مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ سڑک پر لگے پول کی ہلکی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی جبکہ میں اس کی جانب پشت کیے کھڑی تھی۔ میرا چہرہ گہرے اندھیرے میں تھا' مجھے یقین تھا کہ وہ میرے خدوخال دیکھنے میں ناکام رہا تھا۔

"بھاجی..... پہلے توں میری بات کی سچائی دیکھ لے۔ جا..... کسی بھی طرح کہ اسے پتا نہ لگے..... اسے پکڑ لے۔ پوچھ اس سے کہ وہ کیوں لکا بیٹھا ہے۔"

"جو کچھ میں نے تجھ سے پوچھا ہے اس کا جواب دے۔" وہ اکھڑ لہجے میں بولا۔

"تو مجھے نہیں جانتا۔ میرا نام صغراں ہے۔ میں بیگم کی دھی ہوں۔" میں نے جھوٹ بولا۔ اگر ایسا نہ کرتی' اپنی اصلیت بتا دیتی تو وہ مجھ پر شک کرتا اور سمجھتا کہ میں اسے چوہدری نیاز سے منحرف کرنے کے لیے جھوٹ بول رہی ہوں۔ چوہدری نیاز کی وفاداری اس کی نس نس میں لہو بن کر دوڑ رہی تھی۔ وہ جس نے بچپن کی کچی عمر سے لے کر آج تک چوہدری کی جوتیاں سیدھی کی تھیں' اس کی خاطر ہر برے بھلے کام میں ہاتھ ڈال دیا تھا' وہ اس سے بے وفائی پر اتنی جلدی آمادہ نہ ہوتا۔ بالخصوص میرا نام سن کر یا مجھے جان کر تو وہ میری ایک نہ سنتا اور شاید مجھے کھینچتا ہوا چوہدری نیاز کے قدموں میں لے جا کر ڈال دیتا۔

"پر توں وہاں حویلی میں کیا کر رہی تھی؟" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میں اپنی ماں کو لے جانا چاہتی تھی۔"

"مگر وہ تو....." اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"ہاں میں جانتی ہوں۔" میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی' حالانکہ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا کہنے والا ہے' مگر عقل مندی یہی تھی کہ فی الوقت کسی بھی تفصیل میں نہ جاؤں۔ میں چاہتی تھی کہ وہ جلد از جلد میری بات کی تصدیق کر لے۔ مجھے ڈر تھا کہ چوہدری فیاض آ گیا تو اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ چوہدری فیاض کو بچانے کی ایک ہی صورت تھی کہ اسے میری بات پر یقین آ جائے اور وہ اپنی آنکھوں سے اپنے متوقع قاتل کو دیکھ لے۔

اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی لیکن اب اس کی نگاہیں بار بار سڑک کے پار بنی اس چھوٹی سی کچی دیوار کی جانب اٹھ رہی تھیں۔

"دیکھ لے عبدالقادر..... کیا پتا یہ سچ ہو!" لیلیٰ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "تو

نے میری بات کا یقین نہیں کیا تھا ناں..... میں نے تجھے کہا تھا کہ چوہدری نیاز....."

"بس کر....." عبدالقادر نے غرا کر کہا۔ وہ سر اٹھائے اس کچی دیوار کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ اچانک چونکا تھا۔ شاید اس نے وہاں کوئی حرکت محسوس کی تھی' ممکن ہے وہاں موجود شخص اسے دکھائی دیا ہو۔ وہ دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر ہمیں پیچھے کرتا ہوا دبے پاؤں آگے بڑھا۔

"نیچے ہو جاؤ....." اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

میں اور لیلیٰ جلدی سے نیچے بیٹھ گئے۔ وہ بھی جھک کر دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ پوری کوشش کے باوجود جھاڑیاں ہل رہی تھیں۔ میرا دل دھڑکنے لگا لیکن یہ اطمینان تھا کہ وہاں موجود شخص ابھی گولی نہیں چلائے گا۔ عبدالقادر آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر ہمارے اور اس کے درمیان جھاڑیاں حائل ہو گئیں۔ میں اور لیلیٰ سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ میں نے ذرا سا اچک کر پھر سڑک پر اس جانب دیکھا جس طرف چوہدری فیاض کا بیٹا تھا۔ سڑک کی تاریکی میں کسی گاڑی کی لائٹیں دکھائی نہیں دیں۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اب تک سڑک سے نہ کوئی لاری گزری تھی اور نہ کوئی اور سواری۔ میں دعا مانگ رہی تھی کہ ڈاکٹر ان لوگوں کو مل گیا ہو۔ انہیں روک لے۔ یہاں تک نہ آنے دے اور انہیں پتا چل جائے کہ اس شفاف سڑک پر موت ان کی منتظر ہے۔

عبدالقادر کہاں گیا' کیسے گیا ہمیں کچھ پتا نہ چلا۔ کچھ دیر تو جھاڑیوں کی سرسراہٹ ہمیں اس کی موجودگی کا احساس دلاتی رہی پھر چاروں طرف گہرا سناٹا چھا گیا تھا۔

جھینگروں کی تیز آواز سماعت میں چبھ رہی تھی۔ کبھی کبھی ہوا چلتی تو دل زور سے دھڑک اٹھتا تھا۔ میں اور لیلیٰ بالکل خاموش تھے۔ ہماری نظریں جھاڑیوں میں اٹکی ہوئی تھیں اور کان کسی دہشت انگیز آواز کے منتظر تھے۔

اچانک تاریک سڑک روشن ہو گئی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ روشنیاں ابھی بہت دور تھیں مگر اتنی گہری تاریکی میں ان دور کی روشنیوں نے یہ روشن ارتعاش سا پیدا کر دیا تھا۔ میں گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ شاید ڈاکٹر ان تک نہیں پہنچا تھا' کیونکہ وہ روشنیاں دھیرے دھیرے قریب آتی جا رہی تھیں۔ ان آگے بڑھتی کرنوں نے میرے بدن سے جیسے زندگی کھینچنا شروع کر دی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے

پڑتے جا رہے تھے۔ اب میں ہر احتیاط بالائے طاق رکھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"بیٹھ جا..... نیچے ہو جا۔" لیلیٰ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا..... وہ اب بھی سہمی ہوئی تھی۔

"چھوڑو مجھے۔" میں نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ اب میری ٹانگیں بھی کانپ رہی تھیں۔ میری نگاہیں سڑک کے پار عبدالقادر کو تلاش کر رہی تھی۔ وہ اس طرف تو نہیں تھا۔ یقیناً سڑک پار جا چکا تھا۔ میں دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی۔ لیلیٰ نے جھپٹ کر مجھے پکڑ لیا۔

"کہاں جا رہی ہے تُو..... آگے مت جا۔"

"ان سب کی زندگی خطرے میں ہے لیلیٰ!" میں نے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا مگر پھر اچانک ہی چونک اٹھی۔ سڑک پر تیرتی روشنیاں تھم چکی تھیں۔ میری نگاہیں اس طرف جم گئیں۔ شاید آنے والے رک گئے تھے۔ ڈاکٹر نے شاید انہیں روک لیا تھا۔ اچانک ہی سڑک پھر تاریکی میں ڈوب گئی۔ میرا دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے سینے کی قید سے باہر آ جائے گا۔

گہرے سناٹے میں میری سانسیں گونجتی اور دل کی دھڑکن چیختی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ کوئی اس سناٹے کو چیر دے۔ وہ گہرا سناٹا جس میں مجھے دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک کچھ عجیب سی آوازوں نے گہرے سناٹے کا جیسے گلا گھونٹ دیا۔ یہ آوازیں ہم سے کچھ فاصلے پر سنائی دی تھیں۔ سارے ماحول میں جیسے ہلچل سی مچ گئی تھی۔ میں تو پہلے ہی کھڑی تھی' اب لیلیٰ بھی اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ آوازیں کیسی ہیں اور کہاں سے آ رہی ہیں کہ اچانک ہی ہمارے قریب کی جھاڑیوں میں ہلچل مچی اور عبدالقادر کا لمبا چوڑا بدن سامنے آ گیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ آتے ہی اس نے جھپٹ کر میری کلائی پکڑ لی۔

"چل میرے ساتھ....."

"کک..... کہاں..... کیا..... کیا ہوا؟" میں بوکھلا گئی۔

"توں سب کو پاگل سمجھتی ہے؟" وہ غرایا تو دہشت سے میری گھگھی بندھ گئی۔

"کیا ہوا عبدالقادر؟" لیلیٰ نے پوچھا۔

"وہاں کوئی نہیں ہے۔"

"اوہ.....!" مجھے لگا جیسے میرا دم ہی نکل جائے گا۔ "وہ..... بھاجی میں جھوٹ

نہیں بولتی۔ وہ وہاں تھا۔ میں نے دیکھا تھا۔" میں نے پھر کھوکھلے لہجے میں اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"اور وہ لوگ..... وہ لوگ بھی نہیں آئے۔ آتے آتے پلٹ گئے کیا....."

"میں کیا جانوں جی۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

"سب جان جائے گی توں..... چل میرے ساتھ۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ لیلیٰ ہمارے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ وہ بھی بہت گھبرائی ہوئی تھی اور مسلسل عبدالقادر کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ مجھے چھوڑ دے مگر عبدالقادر تو جیسے بہرہ ہو گیا تھا۔ ہم بہت جلدی جھاڑیوں سے نکل آئے۔ اس کی مضبوط انگلیاں میری کلائی میں گڑی جا رہی تھیں۔ میں گھسٹتی ہوئی اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی جا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ وہاں موجود آدمی کہاں چلا گیا۔ میں نے خود اسے وہاں جاتے اور پھر اس دیوار کے پیچھے کھڑا دیکھا تھا۔

اس وقت ہمارے پیچھے سڑک پھر روشن ہو گئی۔ میں ہی نہیں عبدالقادر بھی چونک کر پلٹا پھر اس نے کندھے پر لٹکی رائفل اتار لی اور مجھے چھوڑ کر سڑک کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ میں اس کے پیچھے دوڑی۔ میں چیخ چیخ کر اسے منع کر رہی تھی۔ لیلیٰ بھی چیخ رہی تھی مگر وہ چھلانگیں لگاتا ہوا سڑک کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ وہاں اُگی جھاڑیوں میں بیٹھ کر اس نے غرا کر مجھے چپ ہو جانے کو کہا اور بولا۔ "ساری گولیاں تیرے بدن میں اتار دوں گا اگر تیرے حلق سے آواز بھی نکلی تو۔"

"عبدالقادر..... میں سچ کہتی ہوں..... تُو دیکھ لینا..... تُو پچھتائے گا عبدالقادر....." میں مسلسل بول رہی تھی اور گاڑی کی ہیڈ لائٹس قریب آتی جا رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ لاری ہے یا چوہدری نیاز کی گاڑی۔ پھر جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں بدک کر گاؤں کی طرف بھاگ اٹھی۔ عبدالقادر بالکل نہیں سمجھ سکا کہ کیا کرے۔ اس کا دھیان گاڑی کی طرف بھی تھا اور میری طرف بھی۔ گاڑی میں موجود بندوں کو مارنے کا حکم اسے چوہدری نیاز نے دیا تھا جسے ٹالنا اس کے بس کا کام نہ تھا۔ شاید یہی سوچ کر اس نے میرا پیچھا نہ کیا۔

میں پاگلوں کی طرح اچھلتی' پھاندتی بھاگی چلی جا رہی تھی۔ میں جلد از جلد ایسی جگہ پہنچ

جانا چاہتی تھی جہاں عبدالقادر کے ہاتھ سے محفوظ ہو سکوں۔ گاؤں گہرے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ گاؤں کے قریب پہنچتے ہی میں نے اپنی رفتار کم کرلی تاکہ لوگ میرے قدموں کی آہٹ سے بیدار نہ ہو جائیں۔ اب میں دبے پاؤں آگے بڑھ رہی تھی۔ میں کچھ دیر سوچتی رہی کہ مجھے کیا کرنا ہے' ایک مرتبہ تو جی چاہا کہ حویلی کے دروازے پر پہنچ کر چوہدری نیاز کو للکاروں اور کہوں کہ وہ اپنی بندوق کی ساری گولیاں میرے بدن میں اتار کر مجھے اس بے پناہ کرب اور تھکاوٹ سے نکال دے۔ مجھے یقین آچکا تھا کہ یہاں..... اس دنیا میں یا کم از کم اس گاؤں میں ظلم کرنے والے کو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ میں اکیلی عورت بھلا اس چوہدری نیاز کا کیا بگاڑ سکتی تھی جسے کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے خود اس کا بھائی کوشش کر رہا تھا۔ وہ چوہدری نیاز جو ہر رشتے ناتے سے بے بہرہ ہے جو اپنے بھتیجے کو..... اپنے خون کو الٹا لٹکا کر اذیتیں دے سکتا ہے' اس سے بھلا کسے پناہ مل سکتی ہے؟"

اس خیال نے میرے بدن کو پُرسکون کر دیا۔ میرے سارے وجود کی تھکاوٹ میرے پیروں میں بھر گئی۔ پیر من من بھر کے ہو گئے۔ میں نے بے خوف و خطر حویلی کے جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ میں یوں خالی الذہن سی آگے بڑھ رہی تھی جیسے پھانسی کے تختے پر جا رہی ہوں۔ میں جانتی تھی کہ اب میرے پاس وقت کم ہے۔ میں موت کی جانب پیش قدمی کر رہی ہوں۔ میں نے گہرے سانس لیے اور اس سیدھے راستے پر' سامنے نگاہ جمائے چلتی چلی گئی۔ میرے دونوں جانب کچے پکے مکان گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ یہاں سے پہلی بار حویلی کی دیوار پھاندتے ہوئے جب میں انہی راستوں پر سہمی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی تب بھی یہ مکان یوں ہی بے خبر گہری نیند میں بدمست تھے۔ ان میں رہنے والوں کو گمان بھی نہ تھا کہ ایک بے آسرا' بے سہارا لڑکی اپنے ہی گاؤں میں پناہ ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ آج بھی وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ اس بے سہارا لڑکی کے قدم اب اپنے ہی گاؤں میں موت کی گہری گھاٹی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے اسی مٹی سے جنم لیا تھا اور آج اسی گاؤں کی مٹی میں خاک ہونے جا رہی تھی۔ اچانک مجھے لگا جیسے کادا مجھے آوازیں دے رہا ہو۔ اس کی سرگوشیاں ہوا کی سرسراہٹ کے ساتھ گندھ گئی ہوں۔ وہ مجھے آوازیں دے رہا تھا۔ لوٹ آنے کو کہہ رہا تھا۔ میں ٹھٹک کر رک گئی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میری تلاش میں یہاں تک ضرور پہنچے گا' میں نے پلٹ کر اپنے پیچھے دور تک نگاہ دوڑائی' وہاں کچھ بھی نہ تھا' گویا وہ سرگوشیاں خود میرے

ہی اندر سرسرا رہی تھیں۔ اس کی آواز زندگی بن کر مجھے واپس بلا رہی تھی۔ مگر میں جانتی تھی کہ اس کی زندگی اور موت کے درمیان ایک باریک لکیر کے سوا اب نہ کوئی آہٹ ہے نہ سایہ' نہ سرگوشی اور نہ کوئی جذبہ۔ زندگی کے ہلکے ہلکے گلابی سے رنگ جو میں نے کبھی کادے کی آنکھوں میں بابا کے چہرے پر' ماما کے ہونٹوں پر اور بابا کے آنگن میں اترنے والی سوچ کی کرنوں میں گندھے دیکھے تھے اور محسوس کیے تھے' بے آواز قدموں سے مجھ سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ یوں جیسے میں ساحل پر بکھرے ان رنگوں سے دور' بیچ سمندر کی طرف بڑھتی جا رہی ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ میرے آنسو کب بہنا شروع ہوئے۔ میرے آنسوؤں میں کوئی جذبہ نہ تھا' نہ خوشی کا' نہ غم کا' بے رنگ' بے وقعت قطروں کی طرح بہنے والا پانی تھا جو مسلسل بہہ رہا تھا۔ میں ہوا میں جیسے تیرتی ہوئی سی آگے بڑھ رہی تھی۔ میرا وجود کسی ہلکے پھلکے سائے کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ شاید میں مر چکی تھی اور یہ میری روح تھی جو آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ راستے میں کئی سوتے ہوئے کتوں نے مجھے سر اٹھا کر دیکھا' بلا بھونکے وہ چوکنے ہو کر کھڑے بھی ہوئے مگر ان کی آواز نہ نکلی جیسے انہوں نے مجھے دیکھا نہ ہو بس میری آہٹ محسوس کی ہو۔ میں کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح ان کے سامنے سے گزر گئی۔ حویلی کی طرف جانے والی پتلی سی سڑک کسی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی۔ میں جیسے ہواؤں میں معلق تھی۔

ابھی میں حویلی سے کچھ فاصلے پر تھی کہ مجھے احساس ہوا' جھاڑیوں سے لے کر یہاں تک آنے کے دوران کوئی دھماکہ سنائی نہیں دیا۔ عبدالقادر نے کوئی گولی نہیں چلائی۔ میں چونک اٹھی جیسے ہواؤں سے اتر کر زمین پر آگئی ہوں۔ گولی نہیں چلی تھی اس کا مطلب تھا کہ چوہدری فیاض ابھی نہیں مرا' عبدالقادر بھی ابھی زندہ تھا' شاید وہ دور سے نظر آنے والی روشنیاں کسی لاری کی تھیں۔ ابھی میں اتنا ہی سوچ پائی تھی کہ کہیں دور سناٹے میں فضا کو چیرتی ہوئی گولیوں کی آواز نے میرے قدم اکھاڑ دیے۔ میں لڑکھڑا گئی پھر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ کوئی ختم ہو چکا تھا شاید سبھی ختم ہو چکے تھے۔ چوہدری فیاض بھی اور..... اور عبدالقادر بھی۔ گولیوں کی آوازوں نے میرے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا مگر گاؤں کے اندھیرے میں خراٹے لیتے ہوئے کچے مکان ویسے ہی بے خبر سوتے رہے۔ میں جانتی تھی کہ ان مکانوں میں ہر بستر پر ایک وجود کروٹیں بدل رہا ہو گا۔ سب کی نیند ٹوٹ گئی ہو گی۔

مگر..... مگر انہوں نے جلدی سے آنکھیں میچ لی ہوں گی کوئی باہر نہیں آئے گا۔ کوئی دروازہ' کوئی کھڑکی' کوئی روزن نہیں کھلے گا۔

میں وہاں بیٹھی اپنے لرزتے وجود کو اپنے ہاتھوں میں بھینچتی رہی۔ ہلچل حویلی کی طرف بھی نہیں تھی بلکہ چوہدری نیاز جو جانے کب سے ان آوازوں کا منتظر تھا اس نے تو اطمینان کی سانس لی ہو گی۔ گولیوں کی یہ دہشت خیز آوازیں تو اس کے لیے ایک نئی زندگی کا پیغام لائی ہوں گی جہاں وہ تمام املاک کا تنہا وارث ہو گا۔ اس کا ہنستا مسکراتا اور قہقہے لگاتا چہرہ میری نگاہوں میں گھوم گیا اور جیسے میرا پورا وجود شعلوں میں گھر گیا۔ میں نے ریوالور اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھاما اور پلٹ کر حویلی کی طرف بھاگ پڑی۔

چوہدری نیاز کا وجود اب میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔ وہ چھ فٹ کا آدمی ہزاروں زندگیوں کی تباہی کا ذمے دار تھا۔ اس نے صرف میری ہی نہیں' جانے کتنے لوگوں کی زندگیوں کو ویران کر دیا تھا۔ اب میں اپنے انجام سے بے پرواہ ہو چکی تھی۔ مجھے کوئی خوف نہیں تھا کہ چوہدری کا کوئی آدمی مجھے پہچان لے گا یا مجھے موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ میں تو اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دینے یا خود کو موت کے حوالے کر دینے کا عزم کیے ہوئے تھی۔ میں اس سے اس کے ایک ایک ظلم کا حساب لینا چاہتی تھی۔ جتنا تشدد اس نے بابا پر کرایا تھا' اتنے ہی زخم اس کے بدن پر سجانا چاہتی تھی۔ میں اماں کی طرح اسے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتی تھی۔ جتنی آہیں اماں نے بھریں اور آنسوؤں کے جتنے قطرے اس کی آنکھوں سے بہے' اتنی ہی گولیاں اس کے بدن میں اتار دینا چاہتی تھی۔ میں سرپٹ بھاگ رہی تھی۔ گلیاں ابھی سنسان تھیں۔ پوری گلی میں سوائے میرے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازوں کے کوئی دوسری آواز نہ تھی۔ بس میرے کانوں میں ان گولیوں کی بازگشت اب بھی گونج رہی تھی جو اب تک جانے کس کس کا خون سڑک پر بہا چکی ہوں گی۔ میری آنکھوں کے سامنے خون سا پھیل گیا تھا۔ یوں جیسے ساری دنیا خون میں نہا گئی ہو۔ جیسے ہر چیز لہو رنگ ہو گئی ہو۔ مجھے لگا جیسے میں چکرا کر گر پڑوں گی۔ میں ٹھہر گئی۔ سڑک کے کنارے زمین پر بیٹھ گئی۔ چند لمحے گہری سانسیں لینے کے بعد میرا دماغ قابو میں آیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ میں چوہدری نیاز کی حویلی کی دیوار کے ساتھ ہی لگی بیٹھی ہوں۔

حویلی کا بڑا دروازہ کھلا تھا مگر حیرت کی بات تھی کہ دروازے پر ہر وقت کتوں کی طرح

زبان نکالے' ہانپتے ہوئے پہریدار نہیں تھے۔ میں تیزی سے کھڑی ہو گئی۔ میں نے ہاتھ میں پکڑے ریوالور کو اپنی چادر میں چھپا لیا۔ اب میں دبے قدموں حویلی کے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مجھے پہریداروں کی غیر موجودگی نے واقعی حیران کر دیا تھا۔ چوہدری نیاز تو وہ آدمی تھا جو پہریداروں کے بنا سانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔ اس کی ہر سانس کے پیچھے ایک دشمن لگا ہوا تھا۔ پھر یہ خالی دروازہ حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اب میں دروازے کے ساتھ لگی اندر جھانک رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ گولیوں کی آواز سن لینے کے بعد اندر اپنے کتوں کے ساتھ جشن منا رہا ہو گا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا' آنگن ویران تھا۔ کوئی ہلچل' کوئی آثار نہ تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اندر کوئی بھی نہ ہو۔ میں تیزی سے اندر داخل ہو گئی۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اگر اندر کوئی نہیں ہے تو حویلی کا دروازہ کھلا ہوا کیوں ہے؟ ایسی تو کوئی بھی بات نہیں ہوئی تھی جس سے یہ خیال ہوتا کہ چوہدری اپنی حویلی چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ ابھی میں نے قدم بڑھائے ہی تھے کہ باہر جیپ کے رکنے کی آواز سن کر اچھل پڑی۔ ساتھ ہی کئی لوگوں کی آوازوں نے میرے اوسان ہی خطا کر دیے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میں کسی بے بس چوہے کی طرح ان لوگوں کے چنگل میں پھنس کر رہ جاؤں اور چوہدری نیاز میری بے بسی پر قہقہے لگائے۔ میں تو اس کے منہ سے خون ابلتا دیکھنا چاہتی تھی۔ اسی خواہش نے مجھ میں بجلی سی بھر دی اور میں لپک کر گودام کے اندر داخل ہو گئی۔ دروازے کے قریب چھپنے کی یہی ایک جگہ تھی۔ بائیں جانب ایک بغیر دروازے کی کوٹھڑی تھی جہاں گندم اور چاول کی بوریاں رکھی جاتی تھیں۔ یہی گودام تھا اور اوپر جاتی سیڑھیوں کے نیچے کافی دور تک چلا گیا تھا۔ یہاں گھپ اندھیرا ہوتا تھا۔ یہ بات میں تب سے جانتی تھی جب میں اماں کے ساتھ یہاں قید تھی۔ اکثر چوہدرانی مجھے یہاں سے چاول نکال کر صاف کرنے کو کہتی تھی اور مجھے یہاں اتنے اندھیرے میں آتے ڈر لگتا تھا۔ مجھے آج بھی یاد تھا کہ جب ایسے میں' میں اماں سے ساتھ چلنے کو کہتی تو سونیا مجھے گندی گندی گالیاں دے کر زبردستی اکیلا جانے پر مجبور کیا کرتی تھی۔ اس لمحے اماں کی آنکھوں میں بے بسی' آنسوؤں کے قطروں کی طرح بہتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مجھے اندھیرے سے کتنا ڈر لگتا ہے۔ وہ میرے ساتھ آنا چاہتی یا خود چاول نکال کر لانا چاہتی تو خود بال پکڑ کر کھینچی ہوئی کوٹھڑی تک لے آتی اور کہتی۔ ''حرامزادی' اماں کی اندھیری کوکھ میں ڈر نہیں لگتا تھا۔ تیرے گھر میں گھی

کے دیوے روشن تھے۔ کُتی! چل اندر..... لے کے آچول..... بڑی چوہدرائن لگی ہے ناکہ تیرے ساتھ ایک پہریدار جانا ہے۔ چل دفع ہو۔"

تب میں لرزتی کانپتی ٹانگوں کے ساتھ سہمی ہوئی اس اندھیری کوٹھڑی میں داخل ہوتی۔ کپڑے کا تھیلا میرے ہاتھ میں ہوتا تھا اور میں چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے بورے میں بھرے چاول نکالتی جاتی' روتی جاتی اور مجھے یوں لگتا جیسے کوئی اندھیرے سے نکل کر میری طرف بڑھ رہا ہو جو میرا گلا دبا دے گا۔ چاول لے کر باہر نکلتی تو خوف کے مارے آنکھیں پھٹی ہوئی ہوتیں اور آنسو رخساروں پر بہہ رہے ہوتے۔ دور بیٹھی اماں میرے باہر آتے ہی میری طرف بھاگ پڑتی اور سونیا کے گالیاں دینے کے باوجود مجھ سے لپٹ جاتی۔ مجھے چومتی جاتی اور روتی جاتی۔

آج اس گودام کا وہی اندھیرا میری پناہ گاہ تھا۔ میں اس اندھیرے میں دبکی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کئی تھے جو اندر داخل ہوئے تھے۔ ان کے انداز سے لگتا تھا جیسے خوشی سے بے حال ہوں۔ مجھے آنے والوں کے چہرے نظر نہیں آئے تھے اس لیے کہ گودام کا دروازہ اتنا اونچا نہیں تھا۔ جس جگہ میں بیٹھی تھی وہاں سے آنے والوں کے آدھے بدن نظر آ رہے تھے۔ اگر میں کچھ اور آگے جاتی تو ان کے چہرے بھی دیکھ سکتی تھی مگر میں یہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ میں نہیں جان سکی تھی کہ آنے والے کون تھے اور اس قدر خوش کیوں تھے۔ وہ سب آپس میں باتیں کر رہے تھے مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیوں خوش ہیں۔ اچانک میں نے کچھ عورتوں کو بھی اندر داخل ہوتے دیکھا۔ پھر باہر سے ڈھول پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ زور زور سے گانے لگے' اسی وقت مجھے چوہدرانی سونیا کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ کسی سے تیل اور دوسری چیزیں لانے کو کہہ رہی تھی۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ شاید وہ اپنے بھائی کو بیاہ کے بعد یہاں لے آئی ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس کا بھائی اپنی نوبیاہتا بیوی کو لے کر یہاں کیوں آیا ہے۔ بہرحال' مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ ہاں' اتنا میں جان چکی تھی کہ اب اتنے بہت سے لوگوں میں چوہدری نیاز یا سونیا کو ان کے مظالم کی سزا دینا ممکن نہ تھا۔ میں تو ان کی حویلی کو بھی آگ لگا دینا چاہتی تھی جو اب قطعی ممکن نہ تھا بلکہ اب تو میرا یہاں سے نکلنا بھی دشوار ہی لگ رہا تھا۔ سرِ شام کہ اب یہ دھوم دھڑکا صبح سے پہلے ختم ہونے والا نہیں۔ اب کم از کم یہ رات مجھے اسی تاریک گودام میں گزارنا تھی۔ میں پھر

ایک بار اپنے ارادوں کی ناکامی پر دل برداشتہ ہو گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے قدرت میرا ساتھ نہیں دینا چاہتی۔ اب میں نے اپنی پشت دیوار سے ٹکا دی اور سوچنے لگی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

بہرحال' میرے سوچنے سے کچھ نہیں ہونے والا تھا۔ مجھے ایسے حالات کا انتظار کرنا تھا جب وہ میری موافقت میں ہوتے۔ میں حسبِ سابق اب یہاں آنے پر بھی پچھتا رہی تھی۔ مجھے کھیتوں کی طرف جا کر دیکھنا چاہیے تھے کہ گولیاں کس نے کس پر چلائی تھیں یا لوگوں سے کاکے کے بارے میں پتا کرنا چاہیے تھا۔ چوہدری نیاز سے انتقام لینا تو الگ بات تھی مگر مجھے سب سے پہلے کاکے کو ڈھونڈنا چاہیے تھا کہ مامی کتنی پریشان ہو گی۔ مامی کی ماں نے مجھے ماما کی موت اور کاکے کی گمشدگی کا ذمے دار ٹھہرایا تھا۔ میں ماما کو تو واپس نہیں لا سکتی تھی مگر کاکے کو ہر نقصان سے بچا سکتی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے خدا سے رو رو کر دعا کی کہ وہ محفوظ ہو۔ ویسے چوہدری نیاز کی باتوں سے ابھی تک پتا نہیں چلا تھا کہ یہاں کاکا آیا بھی ہے یا نہیں۔ جس اجنبی سے میری اس حویلی میں داخل ہونے کے بعد ملاقات ہوئی تھی' اس کا بھی کچھ پتا نہ چلا۔ وہ ملتا تو میں اس سے اتنا تو معلوم کر سکتی تھی کہ اس نے میرے کاکے کو تو نہیں دیکھا۔

کاکے کا خیال آیا تو میں باقی سب کچھ بھول گئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ پہلے مجھے کاکے کو تلاش کر کے اسے مامی کے حوالے کرنا ہے' پھر میں کوئی دوسرا قدم اٹھاؤں گی۔ یہ خیال آتے ہی میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اب سارا مسئلہ یہاں سے نکلنے کا تھا۔ حویلی میں بہت لوگ تھے۔ اگر میں اس گودام سے باآسانی نکل جاتی تو پھر حویلی سے باہر جانا میرے لیے مشکل نہ تھا۔ یہی سوچ کر میں گودام کے دروازے کے قریب ہو گئی جہاں سے میں باہر جھانک کر حالات کا اندازہ لگا سکوں۔ ڈھول پیٹنے کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ باہر شاید لوگ بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ عجیب ہاہاکار مچی ہوئی تھی۔ میں گودام کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ میں مکمل اندھیرے میں تھی جبکہ باہر تیز روشنی کر دی گئی تھی۔ میں نے ذرا سا آگے بڑھ کر حویلی کے اندرونی حصے کی طرف نگاہ ڈالی۔ برآمدے میں کافی لوگ جمع تھے۔ حویلی کے بڑے دروازے کے قریب دیگیں رکھی تھیں جن سے چاولوں کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ کچھ ملازم آنگن میں دریاں بچھا رہے تھے۔ رات کے شاید گیارہ' بارہ بجے تھے۔ یقیناً یہ بارات شام کو اپنے گاؤں سے چلی ہو گی۔ لوگ بھوکے ہوں گے جبھی ان کے کھانے پینے کا بندوبست ہو رہا تھا۔ یہ میرے لیے حیرت کی بات تھی کہ اب سے پہلے میں حویلی کے اندر ہونے کے باوجود نہ جان

سکی کہ یہاں بارات آنے والی ہے۔ نہ چوہدری نیاز یا اس کے آدمیوں کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوا تھا۔ تبھی مجھے چوہدری نیاز کی چالاکی پر حیرت ہوئی۔ اس نے ایسے وقت میں چوہدری فیاض کو مروانے کا پروگرام بنایا تھا جبکہ اس کے گھر میں شادی کی تقریب تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ خود بھی اس شادی میں شریک ہو گا اور کل یہ بھی ثابت کر دے گا کہ اس کے تمام آدمی گھر آئی بارات کی خاطر مدارت میں لگے ہوئے تھے۔ چوہدری فیاض کی موت کا الزام صاف صاف عبدالقادر پر آجائے گا اور عبدالقادر حقیقت بتانے کو زندہ ہی نہ ہو گا۔

وہ اتنا چالاک ہے' اس کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ شاید اسی لیے وہ لیلیٰ کے اس حویلی میں ہونے پر ناراض تھا۔ فیاض کے بیٹے کو بھی اس نے حویلی کے اوپر والے حصے میں الٹا لٹکایا تھا۔ یہ دو تین کمرے وہ تھے جو استعمال میں نہ تھے اور جن میں ٹوٹا پھوٹا سامان یا ایسی چیزیں بھری ہوئی تھیں جن کی ضرورت کبھی کبھار ہی پڑتی تھی۔ اسے تو یہ خیال ہو گا کہ چوہدری فیاض کا بیٹا چند گھنٹوں میں مر جائے گا' پھر اسے کھیتوں میں پھینکوانا بھلا کتنی دیر کا کام ہوتا۔ میں اب تک یہ بھی نہیں جان سکی تھی کہ اس کے فرار کا راز کھلا یا نہیں۔ اب تو دو ڈھائی گھنٹے گزر چکے تھے۔ اب تک یہ راز فاش ہو جانا چاہیئے تھا۔ اچانک ایک خیال نے مجھے چونکا دیا۔ اتنے لوگوں میں اگر میں بھی شامل ہو جاتی تو مجھے کون پہچان لیتا! اس خیال کے آتے ہی میں دروازے کے قریب سرک آئی۔ اب دیگوں پر دو آدمی بیٹھ چکے تھے۔ دیگوں کا منہ کھول دیا گیا تھا۔ دیگوں پر بیٹھے دونوں آدمیوں کا رخ دیوار کی طرف تھا۔ شاید اس لیے کہ ان کی پشت پر برآمدے میں عورتوں کو کھانا کھلانے کا انتظام کیا جا چکا تھا۔ باہر سے آنے والے مرد بہت کم تھے اور یقیناً وہ لوگ تھے جو خاندان ہی کے تھے۔ باہر کا آدمی تو اندر آ ہی نہیں سکتا تھا۔ ذرا دیر بعد ہی میں نے تمام لڑکوں اور مردوں کو حویلی سے باہر جاتے دیکھا۔ کوئی پکار پکار کر انہیں کھانا لگ جانے کی اطلاع دے رہا تھا۔

ذرا ہی دیر میں تمام مرد باہر چلے گئے۔ اب دیگوں پر بیٹھے لوگوں سے عورتیں کھانا لے کر جا رہی تھیں۔ ان کے حلیے بتا رہے تھے کہ وہ تمام کی تمام عورتیں کام والیاں ہیں۔ گاؤں کی عورتوں کا اتنی رات گئے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے بہت سی باتیں ذرا سی دیر میں سوچ لیں اور پھر موقع ملتے ہی چھپاک سے باہر نکل آئی۔

باہر آتے ہی تیز قدموں سے دیگوں کے پاس گئی جہاں سینیوں میں چاول نکال نکال کر

دیے جا رہے تھے۔ میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر ایک سینی لی اور سر پر پڑی چادر کو چہرے پر ذرا سا جھکا کر برآمدے کی طرف بڑھ گئی۔ کسی نے میری طرف دھیان بھی نہ دیا ورنہ میرا دل تو حلق میں دھڑک رہا تھا۔ لگتا تھا ابھی سونیا آ کر میرے بال پکڑ لے گی اور پھر ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ چوہدری نیاز کو بلایا جائے گا اور وہ..... مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ میں بھاگ بھاگ کر عورتوں کو کھانا کھلاتی رہی' برتن اٹھاتی رہی اور کوشش کرتی رہی کہ سونیا سے مڈبھیڑ نہ ہو۔ سونیا وو ہٹی کے چونچلے اٹھانے میں لگی تھی۔ اس کے باپ کے گاؤں سے آنے والے مہمان کافی تھے۔ عورتوں' بچوں کے علاوہ لڑکے' لڑکیاں اور مرد بھی تھے۔ آج میں نے بہت دنوں کے بعد چوہدری نیاز کے بچوں کو دیکھا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا ایاز اور اس سے چھوٹی زینب' دونوں ہی بہت پیارے تھے اور کافی بڑے ہو چکے تھے۔ ایاز وہ بچہ تھا جو میرے ساتھ صرف مہینہ ڈیڑھ مہینہ ہی رہا' پھر اسے شہر میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ شروع شروع میں وہ میرے ساتھ کھیلا' مگر سونیا نے جلد ہی اس پر' میرے ساتھ کھیلنے پر پابندی لگا دی۔ وہ کبھی کبھی چھٹیوں پر آتا تو مجھ سے بات کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس وقت تک اسے اتنی سمجھ آ چکی تھی کہ وہ اپنی ماں کے سامنے بات نہیں کرتا تھا اور جان گیا تھا کہ اس کی ماں مجھے پسند نہیں کرتی۔ اس نے کئی بار اپنی ماں کو ٹوکا تھا کہ وہ مجھے نہ مارا کرے۔ تبھی سے سونیا نے میرا حویلی کے آنگن میں کھیلنا یا آنا بند کر دیا تھا۔ اس نے حکم دیا تھا کہ اب میں اپنی کوٹھڑی سے باورچی خانے تک ہی محدود رہوں۔ اس طرح میں ایاز سے بات بھی نہیں کر پاتی تھی۔ پھر اس کا آنا کم ہو گیا۔ چوہدری نیاز اور سونیا خود ہی جا کر اس سے مل آتے تھے۔ وہ کبھی کبھار ہی آتا تھا البتہ جب بھی آتا' میرے بارے میں اماں سے ضرور پوچھتا تھا مگر اماں اسے ٹال دیا کرتی تھی۔

اس وقت اچانک میرا اس سے سامنا ہو گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر لمحہ بھر کو چونکا' اس کی آنکھوں میں پہچان کی ہلکی سے کرنیں چمکیں اور معدوم ہو گئیں۔ میں نے اس کی جانب سے نگاہیں چرا لیں۔ اتنا میں جان چکی تھی کہ اس کا چونکنا بے سبب نہیں تھا۔ یا تو وہ مجھے پہچان گیا تھا یا پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں جلدی سے عورتوں کی بھیڑ میں گم ہو گئی۔ کھانا کھایا جا چکا تھا۔ میں برتن اٹھانے والیوں کے ساتھ برتن اٹھا کر بڑی ٹنکی کے نیچے رکھنے لگی۔ یوں آتے جاتے میں چور نگاہوں سے نہ صرف تمام لوگوں کا جائزہ لے رہی تھی بلکہ اوپر بھی دیکھتی جا

رہی تھی۔ اصل میں میرا مقصد اوپر جانا تھا۔ یہ خیال بھی مجھے اچانک ہی آیا تھا کہ رات میں صرف ایک کمرے میں گئی تھی جہاں چوہدری فیاض کا بیٹا مل گیا تھا۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں دوسرے دو کمرے بھی دیکھتی۔ ممکن ہے ان میں سے کسی کمرے میں ہی کاکا قید ہو۔ پھر بڑی زمیندارنی کا کمرا بھی بند رہتا تھا۔ ممکن تھا کہ چوہدری نے اسے بھی اپنے کالے کرتوتوں کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہو۔ بہرحال' میں جب تک حویلی میں تھی ایسا کوئی امکان نہیں چھوڑنا چاہتی تھی کہ پھر مجھے پچھتانا پڑے اور میں سوچوں کہ کاش وہاں دیکھ لیا ہوتا۔ قدرت نے اچانک میرا ساتھ دینا شروع کر دیا تھا اور مجھے اس موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔ میں چاہتی تھی کہ حجت تمام کرلوں ورنہ کاکے کا باقی گاؤں میں تو کوئی بھی نہ تھا کہ میں سوچتی' وہاں ہوگا۔ وہ چوہدری نیاز کو مارنے آیا تھا۔ اسے ہر حال میں یہیں کہیں ہونا چاہیے تھا۔

"اے! کڑیے..... چل تھاں دھو۔" ایک موٹی سی عورت نے مجھے مخاطب کیا تو میں چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ شاید سونیا کے باپ کے گھر کی کوئی ملازمہ تھی جو ایک طرف بیٹھی مٹھی بھر بھر کر چاول کھا رہی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک کالا کلوٹا اور سوکھا سا بچہ بیٹھا تھا جس کا پیٹ غیر معمولی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ ہر دو سیکنڈ بعد وہ ایک نوالہ اس کے منہ بھی ڈالتی جا رہی تھی جسے وہ بغیر چبائے نگل رہا تھا۔

"ماسی بڑی بھک لگی اے۔ مینوں وی چول دے دے۔ فیر میں تھاں دھونی آں۔" میں نے اس سے چاول مانگے۔ اب مجھے بڑی شدید بھوک لگ رہی تھی۔

"تو روٹی نہیں کھائی؟"

"نہ جی میں تے کوئی نئی کھائی۔" میں نے اپنی چادر کے پلو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"چل جا اُتھوں چاول لے لے۔ جلدی کر نئی تے سونیا جند کڈ لے گی۔"

یہ سنتے ہی میں نے دسترخوان سے اٹھائی ہوئی ڈش میں سے ایک پلیٹ میں چاول ڈالے اور اس موٹی عورت کے قریب ہی بیٹھ کر کھانے لگی۔

"توں اس پنڈی دی ایں؟" اس نے اچانک سوال کیا تو نوالہ میرے حلق میں اٹک گیا۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ کوئی بھی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔

"آہو جی!" میں نے مختصر سا جواب دیا اور جلدی جلدی نوالے حلق سے اتارنے لگی۔

اس عورت نے پلیٹ کو انگلیوں سے بالکل صاف کر کے پانی پیا اور اس کالے کلوٹے بچے کے منہ کو اپنی چادر سے صاف کرنے لگی۔ وہ ندیدہ بچہ اب میری پلیٹ کی طرف لپک رہا تھا۔

"او بس کر نکے!" اس نے اسے گود میں اٹھاتے ہوئے کہا اور پھر مجھے جلدی کھانا کھا کر برتن دھونے کی ہدایت کرتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔ میں نے جلدی جلدی پلیٹ خالی کی۔ دو تین عورتیں اب آنگن میں بستر لگا رہی تھیں۔ کچھ بیٹھی زور زور سے باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے چاروں طرف دیکھا مگر سونیا کہیں نظر نہ آئی۔ مجھے ان سب کے سونے کا انتظار تھا۔ میں جانتی تھی کہ یہ سرِ شام سونے والے لوگ ہیں۔ اتنی رات گئے جاگ کر سوئیں گے تو بہت گہری نیند میں ہوں گے۔ وہ وقت میرے لیے بہترین ہوگا۔ عورتوں کی موجودگی میں باہر سے کسی کے آنے کا بھی امکان نہ تھا۔ نہ چوہدری نیاز آتا' نہ اس کے آدمی اندر داخل ہو سکتے تھے۔ میں بڑے اطمینان سے اپنا کام کر سکتی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ یہاں کاکے کو تلاش کرنے کے بعد رکوں گی نہیں۔ اگر سونیا سے میری لاری میں ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو شاید میں رک جاتی مگر لاری میں ملاقات کے بعد مجھے خدشہ تھا کہ وہ مجھے زینو کی حیثیت سے نہ سہی' صغراں کی حیثیت سے ضرور پہچان لے گی۔ میں نے لاری میں ملاقات کے دوران اسے اپنا یہی نام بتایا تھا۔ یہ سب سوچتے ہوئے میں نے برتن اٹھائے' زمین پر پڑے چاول صاف کیے اور برتن دھونے بیٹھ گئی۔

برتن بہت زیادہ تھے مگر میں نے جلد ہی سارے برتن دھو کر وہاں رکھی منجھی پر الٹ کر رکھ دیے۔ ٹنکی کے نیچے کی جگہ کو اچھی طرح صاف کر کے دھویا اور اٹھ گئی۔ میں اس وقت تک خود کو کام میں لگائے رکھنا چاہتی تھی جب تک تمام لوگ سونے کے لیے نہ لیٹ جائیں۔ اس طرح میں ہر ممکنہ خطرے سے بچی ہوئی تھی۔ میری کمر برآمدے کی طرف اور منہ دیوار کی طرف تھا۔ میرے کان آوازوں پر لگے تھے۔ جتنی دیر میں' میں نے برتن دھوئے عورتیں اپنے بچوں کو لے کر وہاں بچھے بستروں پر لیٹ چکی تھیں۔ سونیا اور اس کے بچے غالباً اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ مہمان خواتین سے کافی فاصلے پر فرش بچھا تھا جس پر تمام کام کرنے والی عورتیں اپنے بچوں کے ساتھ لیٹ چکی تھیں۔ میں بھی اسی فرش پر ایک کونے میں لیٹ گئی۔ میں نے اپنے منہ پر اپنی چادر کا کونا ڈال کر بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ اس طرح ہر دیکھنے والا

مجھے سویا ہوا سمجھتا مگر میں چادر کے اندر سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ میرے کان ہلکی سے ہلکی سرگوشی کو بھی سن رہے تھے۔ میں ان آوازوں کے معدوم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ رفتہ رفتہ حویلی کی رونقوں میں کمی ہونے لگی۔ بچوں کی ریں ریں بند ہو گئی۔ پھر کچھ دیر بعد باتیں کرنے کی آوازیں بھی ختم ہو گئیں۔ اس تمام عرصے میں میرا دھیان چاروں طرف تھا۔ آنگن میں جلتا بڑا بلب کسی نے بجھا دیا تھا۔ صرف برآمدے میں ایک چھوٹا سا بلب روشن تھا۔ حویلی کے باہر بھی دھیرے دھیرے سناٹا پھیلتا جا رہا تھا۔

میں مزید گھنٹا بھر تک ایسے ہی پڑی رہی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ لوگ گہری نیند میں ڈوب جائیں۔ کافی دیر تک جب مجھے سوائے عورتوں کے خراٹوں کے کوئی دوسری آہٹ یا آواز نہ آئی تو میں نے سر گھما کر چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ میں نے رات فرش پر لیٹتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ میں اٹھوں تو مجھے کسی کو پھلانگنا نہ پڑے اور میں سیڑھیوں کے قریب ہوں۔ سیڑھیاں مجھ سے تقریباً پچاس قدم دور تھیں۔ یہ وہ سیڑھیاں تھیں جو حویلی کے برآمدے سے اوپر کی طرف جاتی تھیں۔ دوسری سیڑھیاں وہ تھیں جو گودام کے اوپر سے ہوتی ہوئی حویلی کے باہر اترتی تھیں جہاں سے چوہدری نیاز اپنے مہمانوں کو اوپر بنے کمروں میں ٹھہراتا تھا۔ اوپر بنے آٹھ کمرے' دو حصوں میں منقسم تھے۔ چار کمرے مردانے حصے میں تھے اور چار زنانے حصے میں تھے۔ زنانہ حصے کے انہی چار کمروں میں سے ایک کمرا سونیا کا تھا اور باقی تین بند تھے۔ ایک بڑی زمینداری کا' دوسرا وہ کمرا تھا جہاں رات چوہدری فیاض کا بیٹا قید تھا۔ ایک کمرا اور تھا جس میں گھر کا کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔

یہ وہ تین کمرے تھے جنہیں چوہدری نیاز قید خانوں میں تبدیل کر سکتا تھا کیونکہ بڑی زمینداری کی موجودگی میں کوئی اوپر نہیں جاتا تھا۔ کبھی کبھی ہی سونیا یا چوہدری نیاز اوپر جایا کرتے تھے اور کل رات میں نے اوپر کی جو حالت دیکھی تھی وہ اس بات کا ثبوت تھی کہ اب اس حصے کا حویلی سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ ویسے بھی اب یہاں چوہدرانی سونیا' یا چوہدری نیاز کے سوا رہا ہی کون تھا۔ بچے شہر میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور کبھی کبھار ہی آتے تھے۔

☆=========☆=========☆

میں ہر طرح سے اطمینان کرنے کے بعد چپکے سے اٹھ بیٹھی۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ اوپر جانے والی سیڑھیوں کے بالکل قریب غسل خانہ تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ اگر اس دوران میں

کوئی اٹھ گیا تو میں غسل خانے کی طرف بڑھ جاؤں گی۔ میں بہ ظاہر بے پروائی مگر اصل میں بڑی احتیاط سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر میں نے پلٹ کر دیکھا' پورے گھر میں سوئی ہوئی آڑھی ترچھی پڑی عورتوں اور بچوں کے بے سدھ جسم تھے جو گہری نیند میں تھے۔ برآمدے کے آخر میں سونیا کا کمرا تھا۔ جس کا دروازہ بند تھا۔ برابر والے کمرے کا دروازہ بھی بند تھا' یہ وہی کمرا تھا جہاں سونیا کا بھائی اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ مستقبل کے سنہرے سپنوں میں کھویا ہوا ہو گا۔ کوئی آہٹ' کوئی حرکت نہ دیکھ کر میں نے جلدی سے چپل ہاتھوں میں اٹھائے اور بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

پہلا' دوسرا' تیسرا' تینوں دروازے بند تھے۔ کنڈیاں باہر سے لگائی گئی تھیں۔ صرف ایک دروازہ میں بڑا سا' موٹا سا تالا پڑا تھا اور اسی کو دیکھ کر میرے دماغ میں کھٹکا ہوا۔ یہ کمرا بڑی زمینداری کے کمرے کے برابر والا تھا۔ یہ وہ کمرا نہیں تھا جہاں رات میں نے چوہدری فیاض کے بیٹے کو دیکھا تھا اس لیے یہاں پڑے تالے نے مجھے بے چین کر دیا۔ جب میں یہاں رہتی تھی تو میں نے اس گودام نما کمرے کے در پر کبھی تالا نہیں دیکھا تھا۔ اس میں سوائے کاٹھ کباڑ کے کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ ایسی کوئی چیز نہ تھی کہ اسے محفوظ رکھنے کے لیے تالا ڈالا جاتا۔

میں جانتی تھی کہ اسے کھولنا یا توڑنا میرے بس کا نہیں۔ اس جانب اس کمرے کی کھڑکی بھی نہ تھی کہ میں اندر کا حال جان سکتی' اسی لمحے مجھے یاد آیا کہ بڑی زمینداری کے کمرے میں ایک کھڑکی ہے جو دوسرے کمرے میں کھلتی ہے۔ میں دبے پاؤں بڑی زمینداری کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ صرف میرے دروازہ کھولنے سے جو باہر کی ہلکی روشنی اندر داخل ہوئی تھی اس میں' میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ کمرا جوں کا توں ہے۔ میں نے دروازے کو پوری طرح بند کیے بغیر چھوڑ دیا تاکہ اس سے آنے والی ہلکی روشنی میری مددگار ہو' میں اس کارنس کی طرف بڑھ گئی جس پر بڑی زمینداری موم بتی اور دیا سلائی رکھا کرتی تھی مجھے امید تو نہیں تھی کہ اب تک یہ دونوں چیزیں وہاں ہوں گی مگر میں نے وہاں ٹٹولا اور ہاتھ میں موم بتی آ جانے پر حیران رہ گئی۔ یا تو بڑی زمینداری کے مرنے سے لے کر آج تک کسی نے اس کمرے کو چھیڑا ہی نہیں تھا یا پھر یہاں کی صفائی ستھرائی کا بہت زیادہ خیال کیا گیا تھا اور ہر چیز کو ویسے ہی اس کی جگہ رکھا گیا تھا۔ ویسے دوسری بات کی امید کچھ کم ہی تھی اس

لیے کہ میں کبھی یہ یقین نہیں کر سکتی کہ بڑی زمیندارنی سے کسی کو بھی جذباتی لگاؤ ہو گا۔ جس کا زندگی میں کبھی خیال نہیں کیا گیا اس کے مرنے کے بعد بھلا کیا خیال رکھا جاتا۔ میں نے موم بتی جلانے سے پہلے دروازہ بند کر دیا تھا۔

موم بتی کے قریب ہی دیا سلائی بھی تھی' میں نے بڑی زمیندارنی کی بڑی سی منجھی کے ایک طرف بیٹھ کر موم بتی جلائی اور ذرا سا سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا' موم بتی کی لو کو میں ہاتھ سے ڈھانپے رہی کہ کہیں کسی کھڑکی یا کسی اور روزن کے کھلے ہونے سے روشنی باہر نہ چلی جائے مگر یہ دیکھ کر مجھے خاص اطمینان ہوا کہ وہاں کی تمام کھڑکیاں بند تھیں اور ان پر گہرے پردے پڑے ہوئے تھے۔ اب میں اطمینان سے کھڑی ہو گئی۔ کمرے میں سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہ منجھی بھی پڑی تھی جس پر میں نے آخری رات گزاری تھی۔ بہت سی باتیں' یادیں میرے ذہن میں سرسرانے لگیں مگر میں سر جھٹک کر اس کھڑکی کی طرف بڑھ گئی جو برابر والے کمرے میں کھلتی تھی۔ وہ کھڑکی اسی جانب سے بند تھی' زنگ آلود کنڈی میں لوہے کی ایک لمبی مگر چھوٹی سی سلاخ پھنسی ہوئی تھی۔ میں جانتی تھی کہ اس کھڑکی میں کوئی جالی یا سلاخیں نہیں ہیں' میں باآسانی یہاں سے دوسرے کمرے میں جا سکتی تھی۔ میں نے کنڈی میں پھنسی سلاخ نکال لی اور بہت آہستگی سے کوئی بھی آواز پیدا کیے بغیر کھڑکی کھول دی۔ اندر کاٹھ کباڑ ویسے ہی بھرا ہوا تھا۔ میں موم بتی لیے اندر داخل ہو گئی۔ اندر سامان بہت زیادہ تھا' میں نے ایک ایک جگہ اور کونا کونا دیکھنا شروع کر دیا۔ پورا کمرا چھان مارا مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

اب میں کاکے کی طرف سے پریشان ہو گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں گیا۔ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ میں جس طرح اس کمرے میں داخل ہوئی تھی اسی طرح واپس آ گئی۔ بڑی زمیندارنی کے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے میں نے ہر طرح کا اطمینان کر لیا تھا۔ میں بغیر کسی پریشانی کے واپس اسی جگہ پہنچ گئی جہاں کام والی عورتیں سو رہی تھیں۔ اب مجھے ہر حال میں اس حویلی سے باہر نکلنا تھا اور وہی دو راستے تھے' یعنی ایک دیوار کود کر جانے والا رستہ اور دوسرا حویلی کا بڑا دروازہ۔ میں جانتی تھی کہ حویلی کے باہر بھی کافی لوگ ہوں گے' وہاں بھی دونوں بیٹھکیں مہمانوں کے لیے کھول دی گئیں تھیں' کمی' مزارعے یا ملازم سب باہر منجھیاں ڈالے ہوئے ہوں گے۔ اس طرف سے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ کسی کی بھی آنکھ کھل سکتی تھی۔ ابھی صبح نہیں ہوئی تھی کہ وہ مجھے جاتا دیکھ کر خیال نہ کرتے اور میں صبح

ہونے سے پہلے ہی یہاں سے نکل کر کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچنا چاہتی تھی۔

میں نے باہر جانے سے پہلے چاروں طرف دیکھا۔ میرے چاروں طرف عورتیں اسی بے ترتیبی سے پڑی سو رہی تھیں۔ سونیا اپنے کمرے میں تھی۔ اس کے بچے بھی اسی کمرے میں تھے ورنہ میرا جی چاہا کہ چپکے سے اس کے کمرے میں داخل ہو کر بالکل اسی طرح اس کے منہ پر تکیہ رکھ دوں جس طرح اس نے بڑی زمیندارنی کے منہ پر رکھ دیا تھا مگر اس کے بچوں کی کمرے میں موجودگی کی بناء پر میں نے ایسا نہیں کیا اور کافی سوچ بچار کے بعد دیوار کے راستے باہر کودنے کا ارادہ کر کے دبے پاؤں سیڑھیوں کی دوسری طرف بڑھ گئی۔

چوہدری فیاض کے بیٹے نے یہاں سے نکلنے سے قبل کچھ اینٹیں رکھ دی تھیں جس سے مجھے کافی مدد ملی۔ دیوار کی منڈیر تک پہنچنے میں مجھے دانتوں پسینے آ گئے مگر میں کسی نہ کسی طرح دوسری طرف اتر ہی گئی۔ اس تمام کوشش میں میری کہنیاں چھل گئیں۔ گھٹنے میں بڑی زور کی چوٹ لگی مگر میں دوسری طرف کودتے ہی ایک دیوار کی آڑ میں ہو گئی۔ یہ وہی چھلا حصہ تھا جو جل چکا تھا اور اس کی مرمت جاری تھی۔

اسی لمحے میں نے چوکیدار کی آواز سنی' وہ شاید میری آہٹ سن چکا تھا اور اب پکارتا ہوا کہ کون ہے کون ہے اسی طرف آ رہا تھا۔ میرا تو دم لبوں پر آ گیا۔ میں ایک بہت بڑے مرحلے سے باآسانی نکل آئی تھی اور اگر یہاں پکڑی جاتی تو میری جان بچنا مشکل تھی۔ میں تیزی سے اس جلے ہوئے حصہ میں داخل ہو گئی۔ یہاں ایک طرف اینٹوں کا ڈھیر تھا۔ میں تیزی سے اس ڈھیر کے پیچھے ہو گئی۔ چوکیدار کے ڈنڈے کی ٹھک ٹھک میرا دل دہلائے دے رہی تھی۔ میں اس ڈھیر کے پیچھے اوندھی ہو کر لیٹ گئی اور خدا سے خیریت کی دعائیں مانگنے لگی۔ چوکیدار کے قدموں کی بھاری چاپ میرے بالکل قریب آ کر رک گئی۔ وہ ہاتھ میں پکڑی ٹارچ سے روشنی کیے یہاں وہاں مجھے تلاش کر رہا تھا۔

"کون اے!" ایک بار اس نے پھر اپنی پھنسی پھنسی آواز میں ہانک لگائی۔

روشنی کا دائرہ کئی بار میرے سر پر سے گزرا اور میں پسینے میں نہا نہا گئی۔ میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ پورا بدن جھٹکے سے کھا رہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اگر میں پکڑی گئی تو میرا انجام کیا ہو گا۔ میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لی تھیں اور مجھے لگا تھا کہ جیسے چوکیدار ان اینٹوں پر قدم رکھتا ہوا میرے سر پر پہنچنے والا ہے۔ پھر جانے کیا ہوا۔ چند لمحے کو گہرا سناٹا چھا

گیا۔ روشنی کا دائرہ خاموشی سے چکراتے رہنے کے بعد غائب ہو گیا۔ میں دم سادھے پڑی رہی۔ اچانک ہی چوکیدار کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنی قسمت اور اپنی نوکری دونوں کو کوس رہا تھا۔ پھر وہ ٹھک ٹھک کی آوازیں نکالتا ہوا شاید واپس چلا گیا کیونکہ کافی دیر تک نہ تو اس کی آواز آئی اور نہ ہی روشنی ہوئی۔ میں نے کچھ دیر کے بعد ہمت کی اور سر نکال کر دیکھا تو چاروں طرف تاریکی اور سناٹے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے ایک دم ہی وہاں سے نکلنا مناسب نہ سمجھا۔ میں جانتی تھی کہ چوکیدار ایک اور لمبا چکر کاٹ کر حویلی کے سامنے والے حصے کی طرف چلا جائے گا پھر اسے یہاں تک واپس آنے کے لیے کافی وقت لگے' مجھے اس دوران میں یہاں سے نکلنا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں وہیں دبکی رہی۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب چوکیدار کافی دور نکل گیا ہے تب میں دبے پاؤں باہر آ گئی۔ یہاں سے نکلنے کے بعد بے ساختہ پکی سڑک کی طرف بڑھ گئی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ پکی سڑک پر چلنے والی گولیاں کن لوگوں کی موت کا سبب بنیں۔ گو اب تک تو وہ سڑک صاف کر دی گئی ہو گی' چوہدری نیاز ویسے بھی اپنے پیچھے ثبوت چھوڑنے کا عادی نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہاں کچھ بھی نہ ہو گا۔ نہ چوہدری فیاض وغیرہ کی لاشیں ہوں گی اور نہ عبدالقادر یا لیلیٰ کی لاشیں مگر میرے قدم بے ارادہ اسی جانب بڑھتے جا رہے تھے۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ اِدھر اُدھر پھرنے والے آوارہ کتے بھی کونوں کھدروں میں پڑے سو رہے تھے۔ سردی بڑھ چکی تھی۔ میں اپنی چادر میں خود کو لپیٹے تیز قدم اٹھاتی ہوئی اسی سمت بڑھ رہی تھی جہاں میں نے عبدالقادر اور لیلیٰ کو چھوڑا تھا۔ اب سامنے کھیت نظر آ رہے تھے۔ میں جلد از جلد کھیتوں تک پہنچ جانا چاہتی تھی تاکہ کسی کی نظروں میں نہ آ سکوں۔ میں نے کئی بار پلٹ کر بھی دیکھا تھا مگر دور تک ویرانی اور سناٹے کا راج تھا جس نے مجھے مطمئن کر دیا تھا۔ حویلی میں تو کسی کو میری موجودگی کا احساس نہ ہوا ہو گا۔ وہاں مجھے جانتا ہی کون تھا جو میری ڈھونڈ مچتی۔

میرے جاننے والے تو جیسے دنیا میں صرف بابا اور کادا ہی تھے۔ وہ تو میری تلاش میں دیوانوں کی طرح گھوم رہے ہوں گے۔ میں جانتی تھی کہ کادا غصے سے پاگل ہو رہا ہو گا۔ خوشی ہر بار اس کے قدم چھو کر لوٹ جاتی تھی۔ وہ اور بابا جب شادو کو لینے گئے تھے تو کتنے خوش تھے۔ کادا مجھ سے بات تو نہیں کر سکا تھا مگر اس کی نگاہیں مجھے اس کا انتظار کرنے کی تلقین کر

گئی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ جب وہ شادو کو لے کر پہنچا ہو گا اور اسے پتا لگا ہو گا کہ زینو ایک بار پھر گھر چھوڑ کر چلی گئی تو اس کا کیا حشر ہوا ہو گا۔ مجھے یہ بھی پتا تھا کہ مامی یا اس کی ماں کبھی بھی اسے یہ بات نہیں بتائیں گی کہ انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا البتہ فیکا یا خالہ فاطمہ اسے بتا سکتے تھے۔ ہاں انہوں نے اسے بتا دیا ہو گا۔ اس خیال نے مجھے چونکا دیا۔ تب تو اسے یہاں پہنچ جانا چاہیے۔ وہ تو یہ سن کر پل بھر کے لیے بھی نہ رکا ہو گا۔ وہ جان گیا ہو گا کہ میں یہاں ضرور آئی ہوں گی مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میرے یہاں آنے کا اسے بالکل خیال نہ آیا ہو۔ وہ پھر گاؤں گاؤں' مجھے تلاش کرتا پھر رہا ہو۔

جانے خوشی اور سکھ مجھے راس نہ تھا یا کادے کو' مگر اتنا میں جان چکی تھی کہ میرے ہی منحوس قدموں نے اس کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے' میں اپنا منحوس سایہ اب اس پر نہیں پڑنے دوں گی۔ میں یہی باتیں سوچتی ہوئی کھیتوں میں داخل ہو گئی۔ میں اپنے خیالوں میں اتنی گم تھی کہ کوئی احتیاط بھی نہ کی' میرے بدن اور کپڑوں سے ٹکرانے والی جھاڑیاں' گندم کی بالیاں عجیب سی سرسراہٹ پیدا کر رہی تھیں مگر میں بے خوف و خطر آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ عجیب سی آواز تھی جس نے مجھے چونکا دیا۔ شاید کہیں سے کوئی پتھر لڑھکا تھا یا..... یا..... اور اس سے آگے میں کچھ بھی نہ سوچ سکی۔ ایک سنسنی سی میرے بدن میں دوڑ گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں بے پروائی سے چل رہی تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ دشمن یہاں میری نہ سہی کسی اور کی گھات میں بھی ہو سکتا ہے۔ میں جلدی سے اسی جگہ بیٹھ گئی۔ ڈر کے مارے میں نے سانس تک روک لیا۔ کسی کی آہٹ سننے کی کوشش کرنے لگی۔ نہ معلوم کیوں مجھے لگا کہ جیسے میرے چاروں طرف سے آہٹیں آ رہی ہوں۔ جیسے کچھ لوگ چاروں طرف سے میری جانب بڑھ رہے ہوں۔ میں دم سادھے بیٹھی رہی۔ آہٹیں کبھی تیز اور کبھی دھیمی ہو جاتی تھیں۔ خوف کی وجہ سے میرا بدن لرزنے لگا۔ سردی اور خوف کی لہریں بدن میں کپکپی بن کر دوڑنے لگیں۔ میں نے چادر کا کونا دہرا تہرا کر کے دانتوں تلے دبا لیا تاکہ میرے دانت نہ بجنے لگیں۔ میں اپنا سر گھٹنوں میں دے کر گٹھڑی بن کر بیٹھ گئی۔ آہٹیں اب قدموں کی چاپ میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ گندم کی بالیوں کی سرسراہٹ مجھے دہشت زدہ کر رہی تھی۔ اب مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میں بری طرح پھنس چکی ہوں۔ اس خیال نے جیسے مجھ میں بجلی سی بھر

دی۔ میں نے آخری کوشش کے طور پر اچانک اٹھ کر ایک طرف دوڑ لگا دی۔

"اے..... رک جاؤ" گہرے سناٹے میں ایک آواز خوف کی زنجیر بن کر میرے لڑکھڑاتے قدموں سے لپٹ گئی۔ قدم پل بھر کو زمین میں گڑ کر رہ گئے مگر دوسرے ہی لمحے میں پھر بھاگ پڑی۔ اس بار میری چادر ایک درخت سے نکلی ہوئی شاخ میں پھنس گئی۔ میرے پیچھے آنے والا میرے قریب آ چکا تھا۔ میں چادر کا کونا نکالنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ میرے سر پر پہنچ گیا۔ میں نے پھر بھاگنے کی کوشش کی تو دوسری جانب سے اچانک سامنے آ جانے والے لمبے تڑنگے آدمی سے ٹکرا گئی۔ اسی دوران میں دائیں اور بائیں جانب سے بھی دو سائے نکل کر میرے قریب آ گئے۔ گویا میرا خیال صحیح تھا۔ ان لوگوں نے مجھے چاروں جانب سے گھیر لیا تھا۔ اتنے لوگوں کو اپنے گرد دیکھ کر میں بے اختیار رونے لگی۔ مجھے اپنی موت کا کوئی خوف نہ تھا' میرے آنسو بہنے کا سبب صرف یہ تھا کہ میں چوہدری نیاز سے انتقام لیے بغیر پھر اس خبیث کے چنگل میں پھنس چکی تھی۔ وہ چوہدری فیاض کو قتل کرا چکا تھا' یقیناً اس کے بیٹے کو بھی مروا چکا ہو گا' اب صرف اور صرف میں رہ گئی تھی جو اسے تباہی کے گہرے غار میں گرا سکتی تھی' وہ بھلا مجھے کیسے چھوڑ دیتا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ گھر میں تقریب کر کے باہر کیسا جال پھیلائے ہوئے تھا تاکہ کوئی بھی یقین نہ کر سکے کہ وہ گھر کی تقریب میں مصروف ہونے کی بجائے انسانوں کا شکار کرنے میں مصروف ہے۔

"کون ہو تم؟"

میں اس لہجے پر چونک اٹھی۔ بولنے والا پڑھا لکھا اور مہذب لگ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں وہ خرانٹ پن نہیں تھا جو چوہدری نیاز کے آدمیوں میں پایا جاتا تھا۔ "جی..... میں..... میں جی....."

"شش....." اچانک اس نے مجھے خاموش کرا دیا اور چوکنا ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا پھر اس نے اپنے تینوں ساتھیوں کو کچھ اشارہ کیا۔ ان ساتھیوں میں سے ایک نے مجھے خاموش رہ کر آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور میرے پاس ان کی بات مان لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اس لیے میں اس کے اشارے پر چل پڑی۔ وہ تینوں ہی لمبے تڑنگے تھے۔ انہوں نے شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی' اوپر چمڑے کی جیکٹیں تھیں۔ پیروں میں بھاری سول کے پشاوری جوتے تھے۔ بدن گٹھے ہوئے تھے۔ باقی رنگ یا ناک نقشہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سب سے

آگے جانے والے کے ہاتھ میں ایک بڑی ٹارچ تھی جسے وہ کبھی کبھی روشن کر کے آگے کا رستہ دیکھتا اور چل پڑتا۔ ہم سب اس کے پیچھے تھے۔

اندھیرا بہت زیادہ نہیں تھا' شاید صبح ہونے والی تھی۔ آسمان گہرے سرمئی رنگ کا تھا اور کہیں کہیں ستارے چمک رہے تھے۔ یہاں سردی نسبتاً زیادہ تھی اور اس وقت تو ویسے بھی میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو چکے تھے' اور بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ جانے ان لوگوں نے چپ کیوں سادھ لی تھی اور مجھے کہاں لے جا رہے تھے۔ میرا دل گھبرانے لگا تھا مگر میں جانتی تھی کہ میرا کچھ بولنا' کچھ پوچھنا بیکار ہے' وہ یقیناً مجھے چوہدری نیاز کے بتائے ہوئے کسی ٹھکانے پر لے جا رہے تھے۔ میں جانتی تھی کہ اگلی صبح شاید میری زندگی میں اب نہیں آئے گی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے ایک فیصلہ تو کر ہی لیا کہ چوہدری نیاز کے سامنے آتے ہی میں اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر گولی چلا دوں گی۔ کم از کم اس کے جسم پر ایک زخم تو لگا ہی دوں گی' وہ بچ بھی گیا تو میرا لگایا ہوا زخم اسے تمام عمر میری یاد دلاتا رہا گا۔ اس کے لیے یہ کتنی ذلت کی بات ہو گی کہ اس کے جسم پر زخم لگانے والی ایک مجبور اور بے بس لڑکی تھی۔ میں جانتی تھی کہ یہ احساس اس کی مردانگی پر دھبہ ہو گا اور تمام عمر اسے کچوکے لگاتا رہے گا۔

اب ہم کھیت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ پکی سڑک سامنے تھی۔ اس سڑک کو پار کر کے ہم پھر آگے بڑھنے لگے۔ یہاں دور دور تک کوئی نہ تھا۔ ہم اونچے نیچے راستوں پر چل رہے تھے۔ تھکن سے میری بری حالت ہو چکی تھی۔ میں جانے کب سے مسلسل سفر میں تھی۔ جب تک ان لوگوں کے چنگل میں نہیں پھنسی تھی خود میں کافی ہمت اور حوصلہ محسوس کر رہی تھی مگر اب لگتا تھا جیسے بدن میں جان رہی ہو نہ عقل کام کر رہی ہو۔ مایوسی کے علاوہ بے پناہ کرب اور دکھ میں کاکے کی وجہ سے محسوس کر رہی تھی۔ میں اگر چوہدری نیاز سے بدلہ نہ بھی لے پاتی صرف کاکے کو تلاش کر کے اسے گاؤں پہنچا دیتی تب بھی کچھ پا لیتی مگر یہ احساس کہ کاکا بھی میری نحوست کا شکار ہو گیا ہے' مجھے توڑے ڈالتا تھا۔ میری زندگی میں تو خیر کبھی سکھ تھا ہی نہیں مگر مامی کی زندگی میں جو دکھ ماما کے مرنے کے بعد پیدا ہوا تھا وہ کاکے کے یوں غائب ہو جانے پر مزید گہرا ہو گیا تھا۔ کاکا تو مامی کے زخموں پر مرہم کا پھایا تھا۔ اس کا سہارا تھا۔ میں مامی کے آخری سہارے کو اس تک پہنچانا چاہتی تھی مگر اب یہ بھی ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ ان چاروں نے اب تک آپس میں کوئی بات نہیں کی تھی کہ میں ان کی باتوں ہی سے اندازہ لگاتی

کہ اب وہ کہاں جا رہے ہیں یا اب میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

اب دور نظر آنے والے گاؤں کے آثار شروع ہو گئے تھے۔ یہاں صرف چند ہی گھر تھے جو زیادہ تر ان مزارعوں کے تھے جو ان کھیتوں میں کام کرتے تھے لیکن یہ مزارعے چوہدری نیاز کے نہیں تھے۔ اس کے گاؤں کی حد ختم ہو چکی تھی مجھے حیرت ہوئی کہ آخر یہ کون لوگ ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ آخر میں نے بے چین ہو کر پوچھ لیا۔ ”سنو!“ میری آواز سنتے ہی سب سے آگے جانے والا پلٹ پڑا۔

”ہوں..... سنائیے۔“ وہ میرے قریب آ کر بولا۔

”تم..... تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

”کسی محفوظ مقام پر۔“ اس نے جواب دیا۔

”تت..... تم لوگ کون ہو..... مجھے..... مجھے کہیں نہیں جانا۔“

”یہیں مرنا ہے؟“ وہ بہت صاف لہجے میں اردو بول رہا تھا۔

”نن..... نہیں..... میں نے کچھ نہیں کیا جی..... میں تو..... اپنے کاکے کو ڈھونڈ رہی تھی۔“

”کس کو ڈھونڈ رہی تھی؟“

”اپنے کاکے کو جی..... وہ گھر سے ناراض ہو کر یہاں آیا تھا۔“

”کیا عمر ہے تمہارے کاکے کی؟“

”نہ جی..... وہ میرا کاکا نئیں ہے جی..... وہ..... میرا مامے کا بیٹا ہے۔“

”ٹھیک ہے..... عمر کیا ہے اس کی؟“

”بس اتنا بڑا ہے۔“ میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا پھر خود ہی جھینپ گئی اور بولی۔ ”جی بارہ تیرہ برس کا ہو گا“۔

”ہوں! مل جائے گا..... اب چلو۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”نن..... نئیں جی..... میں نے کہیں نہیں جانا۔ میں اپنے گھر جاؤں گی“۔

”تم گھر نہیں پہنچ سکو گی۔ سیدھی طرح چلتی رہو۔“ اس کا انداز بڑا ہی اکھڑ قسم کا تھا پھر بھی اس کا لہجہ نرم تھا۔ مجھے لگا جیسے میری بک بک کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ بہرحال اس کی باتوں سے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ یہ ان آدمیوں میں سے نہیں ہے جنہیں اب تک میں چوہدری نیاز

کے ساتھ دیکھتی رہی یا چوہدری نیاز جس قسم کے لوگوں کو اپنے ارد گرد رکھا کرتا تھا۔ وہ جو بھی تھا میرا دوست بالکل نہیں ہو سکتا تھا ورنہ مجھے کم از کم یہ ضرور بتاتا کہ اس نے مجھے کیوں پکڑا ہے اور کہاں لے جا رہا ہے۔ اس کے انداز میں دشمنی بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ مجھ سے بات کرنے والا پھر پلٹ کر آگے بڑھ گیا۔ میں اپنی جگہ کھڑی تھی اور باقی تینوں میرے پیچھے کھڑے غالباً میرے آگے بڑھنے کے منتظر تھے۔

”چلو.....“ چند لمحوں بعد ایک بول اٹھا۔

مجھے لاچار ان کی بات ماننا پڑی۔ ہم بہت جلد ایک ایسے مکان کے دروازے پر پہنچ گئے جو باقی گھروں سے ہٹ کر بنا ہوا تھا۔ اس مکان کو چاروں طرف سے اونچے اونچے اور گھنے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ باہر چاروں جانب لکڑی کی باڑھ بنی ہوئی تھی۔ یہاں پہنچ کر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے شدت سے اپنی بے بسی کا احساس ہوا۔ میں تنہا لڑکی تھی' ان چاروں کے درمیان میرا خوف زدہ ہونا اچنبھے کی بات نہ تھی۔ میں اندر جانے کی بجائے باڑھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ میرے پیچھے آنے والے تینوں آدمی بھی رک گئے جبکہ آگے جانے والا شخص مکان کے دروازے پر پڑا ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو چکا تھا۔

”یہ کس قسم کی عورت ہے یار!“ ان میں سے ایک جھنجلا کر بولا۔

”عورتیں اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ تم نے غور نہیں کیا ہو گا.....“ دوسرا شخص بولا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”بی بی! ہمارا وقت ضائع مت کرو۔ اندر چلو۔“

”نہیں جانا میں نے اندر“۔ میں نے پھر جواب دیا۔

”تو پھر یہاں کھڑی رہو۔“ وہ تینوں وہیں پڑے پتھروں پر بیٹھ گئے۔

میں اپنی بے بسی پر رو دی تھی۔ اتنی دیر میں ایک شخص پردہ اٹھا کر باہر آ گیا۔ آسمان کا مشرقی کنارہ روشن ہو چکا تھا۔ صبح ہونے والی۔ وہ قریب آیا تو میں اس کی صورت دیکھ کر خوف سے ایک جانب بھاگ اٹھی۔ وہ یقیناً ملک کاما تھا۔ وہی ملک کاما جس کے آدمیوں نے چوہدری نیاز کے کہنے میں آ کر مجھے اپنے گھر سے اٹھوا لیا تھا اور مجھے پانچ لاکھ روپے کے عوض چوہدری نیاز کے حوالے کرنے والے تھے۔ میں بے تحاشا دوڑ پڑی تھی مگر زیادہ دور نہ جا سکی کیونکہ ان تینوں آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا جو پتھروں پر بیٹھے تھے۔ آنے والے ملک کاما کو دیکھ کر مودب کھڑے ہو گئے تھے۔ ملک کاما کو یہاں دیکھ کر میرے چودہ طبق روشن ہو چکے تھے۔ مجھے یاد آ

گیا تھا کہ میں اس کے آدمی کو بری طرح زخمی کر کے اس کی قید سے بھاگی تھی۔ نہ معلوم وہ آدمی زندہ رہا یا مر گیا۔ پہلے تو وہ صرف مجھے چوہدری نیاز کے حوالے کرنے والا تھا' اب تو وہ مجھے اس کے حوالے کرنے سے پہلے میری چمڑی بھی ادھیڑ دے گا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مجھے قتل کے الزام میں پولیس کے حوالے کر دے۔ یہ ساری باتیں مجھے ہولائے دے رہی تھیں۔ میں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہاں سے فرار ممکن نہیں خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی' چلّائی اور حلق پھاڑ پھاڑ کر چلائی کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ میری مدد کو آ جائے' دور بنے مکانوں تک میری آواز پہنچ جائے' تڑپی مچلی' آخر ملک کاما کے پیروں میں گر گئی کہ میں بے قصور ہوں۔ مجھے چھوڑ دے۔ مگر وہ میری بات سننے سے پہلے ہی اندر جا چکا تھا۔

اس کے آدمی مجھے پکڑے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ اندر تین کمرے تھے۔ سامنے کے کمرے کے کھلے دروازے سے منجھی پر بیٹھا ملک کاما صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ لوگ مجھے لیے ہوئے اسی کمرے میں داخل ہو گئے۔

"جاؤ اس کے لیے کچھ کھانے پینے کو لے آؤ"۔ ملک کاما نے کہا تو میں چونک اٹھی۔ مجھے اس کی آواز نہ معلوم کیوں بدلی بدلی سی لگی۔ یہ وہ آواز ہرگز نہیں تھی جو میں اب سے پہلے اس کی قید میں رہ کر سن چکی تھی۔ اس بار اس کی آنکھوں میں وحشت کی بجائے گہرا سکون تھا۔ "بیٹھ جاؤ"۔ اس نے مجھ سے کہا۔ اس کے آدمی مجھے چھوڑ کر باہر جا چکے تھے۔ میں نے پلٹ کر کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔

"باہر گدھ تمہاری تلاش میں ہیں۔ چوہدری نیاز کو پتا چل چکا ہے کہ کس عورت نے چوہدری فیاض کے بیٹے کو آزاد کیا ہے۔ عبدالقادر کی بہن ریشم چوہدری نیاز کی قید میں ہے اور اسے سب کچھ بتا چکی ہے"۔ اس نے پُرسکون لہجے میں بتایا۔

"کک..... کیا؟" میں یہ سب سن کر اچھل پڑی۔ "اوہ..... ریشم..... ریشم کی جان خطرے میں ہے۔ اسے بچا لو۔ اسے بچا ملک کاما..... وہ معصوم بے قصور ہے"..... میں بے اختیار چیخ اٹھی۔

"ہم جانتے ہیں"۔ اس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا اور بڑی دیر تک غور سے دیکھتا رہا۔ "بڑی زمیندارنی کو قتل ہوتے تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟" اس نے بڑے گہرے لہجے میں پوچھا۔ اس کے پوچھنے کا انداز بالکل پولیس والوں جیسا تھا۔ میں چونک اٹھی۔

"ہاں..... میں اس رات اسی کمرے میں تھی۔" پھر میں نے اسے ساری تفصیل بتا دی۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے سنتا رہا۔ کبھی کبھی وہ سر اٹھا کر میری طرف دیکھتا تو مجھے اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی بھری محسوس ہوتیں۔ میں نے بات ختم کی تو اس نے گہرا سانس لے کر دوسرا سوال کر دیا۔

"اور بڑے زمیندار کا قاتل کون ہے؟"

"اسے میں نہیں جانتی۔ لیکن میری اماں اسے جانتی تھی۔ اس نے مجھے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ سونیا ساری جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ اسی نے بڑے زمیندار کو بھی قتل کرایا ہے اور اس کے قتل کا الزام میرے بابا پر ڈال دیا..... میں..... میں بے قصور ہوں ملک کاما..... وہ بڑی زمیندارنی کا قتل مجھ پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ تو میرا بڑا خیال رکھتی تھی۔ محبت کرتی تھی مجھ سے۔ اس نے خود ہی مجھے اپنا زیور دیا تھا اور مجھ سے کہا تھا کہ میں یہاں سے چلی جاؤں ورنہ یہ لوگ مجھے جیتا نہیں چھوڑیں گے۔ وہ زیور اب تک کادے کے بابا کے پاس امانت رکھا ہے۔ میں اسے چوہدری فیاض کو دینا چاہتی تھی' پر اب تک مجھے سکون ہی نہیں ملا"۔ میں غیر ارادی طور پر روئے جا رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ میرا انجام قریب تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے کھانا لانے کے بہانے اپنے آدمیوں کو چوہدری نیاز کو لانے بھیجا ہو گا۔

"ہوں..... تم یہاں کیوں آئی تھیں۔ کیا کرنا چاہتی تھیں؟" وہ اب بھی ویسا ہی پُرسکون تھا۔ اس کے انداز سے پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ میری باتوں پر یقین بھی کر رہا ہے یا نہیں۔

"میں..... میں..... اپنے کاکے کو ڈھونڈنے آئی تھی۔" میں نے تھوک نگل کر جواب دیا۔

"بس.....؟" اس نے نگاہ اٹھائی۔

"نہیں..... میں چوہدری نیاز سے اس دھرتی کو پاک کرنا چاہتی تھی اور ایسا کرنا چاہتی ہوں۔ یاد رکھو ملک کاما! اگر تم نے مجھے چوہدری کے حوالے کیا تو میں مرتے مرتے اسے مار دوں گی۔ اس نے... اپنے بھائی کو بھی مروا دیا۔ اپنے بھتیجے کو بھی مروا دیا۔ ارے وہ تو ایسا کتا ہے جو اپنے وفاداروں کو بھی کاٹ کھاتا ہے۔ عبدالقادر جس نے اس کا ساتھ دینے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اس کے جرائم میں اس کا شریک اور رازدار رہا' اس نے اسے بھی مروا

دیا۔" میں نے ہتھیلی سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ "اور تم..... تم کیا سمجھتے ہو کہ تم اس کے زہر سے بچ جاؤ گے؟ نہیں ملک کاما..... جب تم مجھے اس کے حوالے کر دو گے تو وہ تمہیں بھی اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں مروا دے گا اس لیے کہ ..... کہ وہ کوئی ثبوت نہیں چھوڑتا۔ کوئی ثبوت نہیں چھوڑتا۔"

وہ دھیرے سے مسکرا دیا اور میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ ڈالوں اس کے یہ مسکراتے ہوئے ہونٹ لہولہان کر دوں۔ اس پر میری کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"وہ کھانا لا رہے ہیں۔ اب کسی کو زخمی کرنے کی غلطی نہ کرنا۔" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "وہ..... بچ گیا تھا۔ ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ آپریشن ہوا تھا..... اگر نہ بچا ہوتا تو....."

اور میں سناٹے میں رہ گئی۔ مجھے اسی کیفیت میں چھوڑ کر وہ باہر چلا گیا۔ اس نے باہر جا کر دروازے کی کنڈی لگا دی تھی۔ میں نے اپنی پوری قوت سے دروازہ بجایا مگر کوئی سننے والا نہ تھا۔ میں زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔ جانے کتنی دیر تک روتی رہی، پھر خود بہ خود میرے آنسو خشک ہو گئے۔ میں نے مزید رونا چاہا تو نہ رو سکی۔ یوں لگا جیسے میرے اندر کے سارے طوفان ان آنسوؤں میں بہہ گئے ہوں۔ ایک عجیب سا سکوت پورے وجود میں چھا گیا۔

پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی۔ لگتا تھا جیسے کئی برس گزر گئے ہوں۔ دور تک گہرا سناٹا تھا۔ کوئی آواز، کوئی آہٹ، کچھ بھی نہ تھا۔ مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ اچانک احساس ہوا کہ یہ ساکت لمحے میرے اور چوہدری نیاز کے درمیان فاصلے گھٹا رہے ہیں۔ جیسے وہ انہی خاموش لمحوں کی آڑ میں دبکا ہوا میری طرف بڑھ رہا ہو۔ وہ اب اچانک میرے سامنے آ جائے گا تب لمحوں کا یہ سکوت اس کے وحشیانہ قہقہوں سے ٹوٹ جائے گا پھر وہ مجھے رسیوں سے باندھ کر حویلی تک لے کر جائے گا۔ ساری دنیا کو دکھائے گا کہ دیکھو اس کے خلاف ہو جانے والے لوگوں کا کیا حشر ہوتا ہے؟ یہ سب سوچتے ہوئے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ خود کو زندہ اس کے حوالے نہیں کروں گی۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے نیفے میں اُڑسا ہوا پستول نکال لیا۔ عین اسی لمحے دروازے کی کنڈی کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے پستول والا ہاتھ چادر کے نیچے کر لیا۔

کھانا لے کر آنے والا ملک کاما تھا۔ "چلو ہاتھ دھو لو۔ وہاں پانی ہے۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

"مجھے نہیں کھانا کھانا۔" میں بہت نروس تھی۔ میرے ہاتھ میں پستول تھا۔ جسے میں چادر کے پیچھے چھپائے ہوئے تھی۔ وہ ایک منٹ تک کھڑا مجھے دیکھتا رہا پھر پلٹ کر دروازے کی طرف چل پڑا۔ کھانا اس نے منجھی پر رکھ دیا تھا۔ میں منجھی سے زیادہ دور نہیں تھی۔ وہیں زمین پر بیٹھی تھی۔ دروازے کی طرف میری پشت تھی۔ اچانک وہ پلٹا اور اس نے جھپٹ کر مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا۔ میں اس بے ساختہ حملے پر چیخ اٹھی۔ میں نے پستول والا ہاتھ نکالنا چاہا مگر وہ ہاتھ اس نے سختی سے پکڑ لیا تھا۔

"لاؤ..... یہ مجھے دے دو۔"

"کک..... کیا..... چھوڑو مجھے۔"

"مجھے دے دو....." اس بار اس کا لہجہ سخت تھا پھر اس نے خود ہی میرے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ پتا نہیں چادر کے نیچے چھپا ہوا پستول اس نے کیسے دیکھ لیا تھا۔

میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ یہ پستول میرے لیے بڑا سہارا تھا حالانکہ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں کبھی اسے چلا بھی سکوں گی مگر میں کسی کے اوپر نہ چلا پاتی تو اپنی زندگی کا خاتمہ تو کر ہی سکتی تھی۔ پستول چھین کر اس نے مجھے بالکل بے بس کر دیا تھا۔ مارے غصے کے میں پاگل ہو گئی اور چیخ پڑی۔

"تم کون ہوتے ہو مجھے یوں قید کر کے اس حرامزادے کے حوالے کرنے والے۔ مار دو مجھے۔ گولی سے اُڑا دو..... بے غیرت انسان۔ یاد رکھنا کہ میں کوئی مٹی کی مورت نہیں ہوں جو تم مجھے اس کتے کے حوالے کر دو گے، اور میں خاموش رہوں گی بے ضمیر شخص، میں خود کو مار ڈالوں گی مگر اپنے آپ کو بیچنے نہیں دوں گی۔ جا اپنی ماں بہنوں کو بیچ..... اپنی بیٹیوں کو بیچ....."

اور اسی لمحے میرے رخسار پر اس کا بھاری ہاتھ پڑا تو میں لڑکھڑاتی ہوئی دور جا گری۔ میرا سر دیوار سے ٹکرایا۔ آنکھوں میں تارے ناچ اٹھے مگر میں غصے سے دیوانی ہو رہی تھی۔ مجھے اس چوٹ کا لمحہ بھر کو ہی احساس ہوا تھا دوسرے ہی لمحے میں پھر اٹھ کر اس کی طرف لپکی اور میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ اس کے چہرے کے عضلات تنے ہوئے تھے۔ آنکھیں سرخ

ہو کر سلگ رہی تھیں۔ اس نے پستول کی گولیاں نکال کر جیب میں ڈال لیں اور خالی پستول دور منجھی پر اچھال دیا۔

"مار مجھے..... مار..... اور مار..... جان سے مار دے....." میں اسے جھنجوڑ رہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو میرے ہاتھوں پر رکھا اور بہت آہستگی سے اپنا گریبان چھڑانے لگا۔ میں بری طرح رو رہی تھی۔ اب میرے رخسار پہ جلن ہو رہی تھی اور میرا سر بری طرح چکرانے لگا تھا۔

مجھے لگا جیسے میں گرنے والی ہوں۔ میں اس کے گریبان پر اپنی گرفت برقرار نہیں رکھ سکی۔ اس نے دھیرے سے میرے ہاتھ پکڑے اور مجھے سہارا دے کر منجھی تک لے آیا پھر اس نے مجھے منجھی پر لٹا دیا۔ مجھے اس سے اس رویے کی توقع نہیں تھی۔ وہ اچانک ہی موم کی طرح پگھل چکا تھا۔ اب اس کی آنکھوں میں تاسف تھا۔ "بہت بیوقوف ہو تم۔" وہ دھیرے سے بولا۔ "تم نے مجھے بے ضمیر اور بے غیرت کہا! میں..... سوری' میں برداشت نہیں کر پایا۔"

میں بری طرح رو رہی تھی۔ میں نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا اور اوندھی ہو کر زور زور سے رونے لگی۔ "خدا کے واسطے مجھے مار دو۔ میں اپنی زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔ نہیں جینا چاہتی میں اس طرح..... نہیں جینا مجھے....."

"کیوں..... ایک شخص سے ڈر کر مر جانا چاہتی ہو؟ اس پوری دنیا میں وہی ایک شخص تو نہیں' کچھ لوگ تو ایسے بھی ہوں گے جن کی وجہ سے جینے کو دل چاہتا ہو گا"۔

"دل چاہتا تھا۔" میں نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ "مگر اب..... اب تو ان کی زندگی بھی داؤ پر لگی ہے۔ میری وجہ سے صرف اس لیے کہ انہوں نے مجھے سہارا دیا۔ مجھے ان درندوں سے بچایا' وہ لوگ دربدر ہو گئے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے ان پر آنچ آئے وہ..... وہ میرا کاکا..... اس نے کیا بگاڑا ہے اس چوہدری کا۔ پتا نہیں کہاں گیا وہ۔ مجھے یقین ہے کہ اسے بھی اسی چوہدری نے قید کر رکھا ہو گا۔ یا..... یا شاید....." اور میں کانپ اٹھی۔

"اگر میرے کاکے کو کچھ ہو گیا تو میری مامی بے سہارا ہو جائے گی' برباد ہو جائے گی۔ اس کا تو ایک ہی ایک بچہ ہے وہ۔ ملک کاما! کیا تمہارے بچے نہیں ہیں؟ کیا تمہاری کوئی بہن' بیٹی یا ماں نہیں ہے؟ کیا تمہیں رحم نہیں آتا مجھ پر' تم صرف چند روپوں کی خاطر مجھے اس کتے کے

حوالے کرنا چاہتے ہو!"

وہ خاموشی سے سن رہا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذرا دیر پہلے بھر جانے والا تاسف دھواں بن کر اڑ چکا تھا۔ "کھانا کھاؤ۔" اتنا کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میرا جی چاہا کہ منجھی پر پڑا خالی پستول کھینچ کر اس کے سر پر دے ماروں مگر میں ایسا نہ کر سکی۔ گو میں بہت بھوکی تھی۔ تمام رات جاگتے رہنے اور اتنا پیدل چلنے کی وجہ سے رات جو کچھ کھایا تھا' ہضم ہو چکا تھا مگر پھر بھی میرا دل کچھ کھانے کو نہ چاہا۔ مجھے یقین تھا کہ اب میں یہاں سے فرار نہیں ہو سکوں گی۔ ملک کاما اب میری طرف سے بے پروائی نہیں برتے گا۔ جو کچھ پہلے ہو چکا تھا اس کی بناء پر وہ زیادہ محتاط ہو گیا ہو گا۔ اسی لیے میں چاپ چاپ ایک طرف بیٹھ گئی۔ کمرے میں لالٹین روشن تھی۔ دروازے اور کھڑکیوں کی روزن سے باہر پھیلنے والے سویرے کا اجلا پن ابھی کمرے میں روشنی نہیں پھیلا سکا تھا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ صبح ہونے والی تھی۔ چوہدری نیاز یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میرے خیال میں تو ملک کاما کے آدمی اب تک اسے میرے پکڑے جانے کی اطلاع بھی دے چکے ہوں گے۔ اسے یہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی' گویا اب زیادہ وقت نہیں تھا۔

مجھے افسوس تو اس بات کا تھا کہ میں رات چوہدری نیاز کی حویلی میں گزار کر آ رہی تھی۔ نہ معلوم کیوں میں نے وہاں آگ نہیں لگائی۔ مجھے تو پوری حویلی کو آگ لگا دینا چاہیے تھی یا سوتی ہوئی سونیا کا گلا دبا دینا چاہیے تھا۔ کیا ہوا اگر وہاں اس کے بچے تھے۔ کیا ہوا جو وہاں خوشیوں کے شادیانے بج رہے تھے۔ وہ سب جس طرح بے خبر سوئے ہوئے تھے میں چاہتی تو کم از کم سونیا سے اماں کی موت کا بدلہ تو لے ہی سکتی تھی مگر جانے کیوں میں نے انہیں چھوڑ دیا۔ میں دو مرتبہ اس کی حویلی میں داخل ہو کر یونہی واپس آ چکی تھی۔ پتا نہیں میرا دل کیوں ڈرتا تھا۔ اب میں چوہدری نیاز کے حوالے کر دی جاؤں گی اور اس قابل بھی نہ رہوں گی کہ خود ہی کو بچا سکوں۔ میرا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لوں۔ وہ اس قابل نہیں تھا کہ اسے بخشا جاتا۔ وہ تو اس قابل تھا کہ اسے رسیوں سے باندھ کر گلیوں میں گھسیٹا جاتا۔

لیکن اب یہ سب سوچنا بیکار تھا۔ وقت میرے ہاتھوں میں آ کر نکل چکا تھا۔ اب میں لکیر پیٹنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ملک کاما پر میرے رونے' بین کرنے یا منتیں کرنے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ چکنا گھڑا تھا۔ اس کے نزدیک صرف روپے پیسے کی اہمیت تھی۔ کسی

انسان کی تو اس کی نظر میں جیسے کوئی وقعت ہی نہ تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر سر دیوار سے ٹیک دیا۔ آنکھیں بند ہوتے ہی کادا میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"تو کہاں چلی گئی تھی زینو!"

ایک سرگوشی میرے وجود میں تیز تیز چکر کھانے لگی۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں آنکھیں بند کر لوں۔ یوں لگتا تھا جیسے بند آنکھیں کادے کا گھر ہوں۔ میں جونہی آنکھیں بند کروں گی وہ میرے سامنے آ جائے گا۔ وہ اور بابا..... اور کاکا یہ تینوں آنکھوں میں جم کر رہ گئے تھے۔ میں آنکھیں پھاڑے بیٹھی رہی حالانکہ نیند سے میری آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ باہر روشنی بڑھ چکی تھی۔ شاید سورج نکل آیا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اب چوہدری آنے ہی والا ہو گا' اس احساس نے مجھے بہت زیادہ بے چین کر دیا۔ میں کھڑی ہو گئی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایسا میں نے بے اختیار کیا تھا۔ کافی دیر تک وہاں کوئی نہ آیا۔ نہ باہر کسی قسم کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑا دیا۔ کسی کی آہٹ محسوس کر کے چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔

اندر آنے والا شخص ملک کاما تھا۔ اس کے ہاتھ میں گرم گرم چائے کے دو پیالے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر دھیرے سے مسکرا دیا۔ یوں جیسے میں اس کی قیدی نہ ہوں بلکہ اس کے گھر مہمان آئی ہوئی ہوں۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی نگاہ کھانے کے برتنوں پر پڑی۔ اس کے چہرے کے عضلات کھنچ گئے۔ "تم نے کھانا نہیں کھایا؟" اس نے چائے کے پیالے ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں چاہا"۔ میں نے منہ دوسری طرف کر کے جواب دیا۔

"کسی معقول بات کو تمہارا جی نہیں چاہتا؟" اس کا لہجہ بہت شستہ اور نرم تھا۔ "چائے کے ساتھ روٹی کھا لو۔ ہر بات میں ضد اچھی نہیں ہوتی۔ تم خود ہی اپنے لیے مشکلات پیدا کرتی ہو۔"

"ہاں..... میں نے دنیا میں آ کر اپنے لیے خود ہی مشکلات پیدا کی ہیں نا؟ میں نے ہی تو چوہدری نیاز کو کہا تھا کہ میرے باپ کو جھوٹے الزام میں پکڑ کر مار ڈالے اور اماں کو بھی خود اس کے پاس لے گئی تھی کہ اسے اذیتیں دے دے کر مار دو اور اب..... اب خود تم تک چلی آئی ہوں کہ مجھے بیچ دو۔" میں نے بھرپور طنز کیا۔

وہ میری بات سن کر ہنس پڑا۔ میری تو جان ہی جل گئی۔ اس کا یہ دھیما دھیما رویہ مجھے مضطرب کر رہا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ چیخے چلائے۔ مجھے رسیوں سے باندھ کر ڈال دے اور چوہدری کو بلوا کر مجھے جلد از جلد اس کے حوالے کر دے یا پھر..... یا پھر مجھے چھوڑ دے۔ اگر اتنی ہی ہمدردی سے باتیں کر رہا ہے تو میری مدد کرے۔ میں اپنے انجام کو پہنچنا چاہتی تھی یا خود کو بچانے کے لئے جدوجہد کرنا چاہتی تھی۔ یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اپنی موت یا زندگی کے فیصلے کا انتظار میرے لیے بہت اذیت ناک تھا۔

"ملک کاما! ایک کرم اگر تم مجھ پر کر سکتے ہو تو کر دو۔ ٹھیک ہے' مجھے چوہدری نیاز کے حوالے کر کے اپنے پیسے کھرے کر لینا مگر مجھے کوئی ایسا زہر دے دو کہ میں گھنٹے دو گھنٹے میں ہی مر جاؤں۔ میں اس کتے کے ہاتھوں اذیتیں اٹھا کر نہیں مرنا چاہتی۔ اس طرح تمہیں تمہارے پیسے بھی مل جائیں گے اور میری عزت بھی رہ جائے گی۔ اب مجھے ہر حال میں موت کو گلے لگانا ہے۔ میں ایک ہی صورت میں زندہ رہ سکتی ہوں کہ چوہدری نیاز مر جائے"۔

میں کہہ رہی تھی اور وہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی مسکراہٹ تھی جیسے اندر ہی اندر وہ میری باتوں پر ہنس رہا ہو۔ "تم سن رہے ہو ناں؟ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔" میں نے لجاجت سے کہا۔ وہ اب بھی خاموشی سے چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ "بولتے کیوں نہیں۔ اس طرح تو تم بھی فائدے میں رہو گے اور..... اور میں بھی"۔

"میں چاہتا ہوں کہ زندہ رہتے ہوئے بھی تمہیں کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور پہنچے۔" اس نے چائے کا گھونٹ لے کر پیالہ زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر پھر پُراسرار سی مسکراہٹ پھیل چکی تھی۔

"نہیں۔ ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"اگر ہو گیا تو؟"

اس کا انداز پُراسرار اور باتیں سمجھ میں نہ آنے والی تھیں۔ میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔ تمہیں زہر چاہیے' ہے نا؟"

"ہاں۔ تم چاہو تو مجھ پر یہ کرم کر سکتے ہو۔"

"کیا کوئی ایسا نہیں ہے جس کی وجہ سے تم زہر کھانے سے باز رہو!"

"نہیں۔" ایسا کہتے ہوئے کئی چہرے نگاہوں میں گھومے تھے اور پھر جیسے کادا بند آنکھوں سے نکل کر کھلی آنکھوں میں ٹھہر گیا۔ میں بے اختیار رو دی۔

"وہ کون ہے جس کی وجہ سے تم رو رہی ہو؟" وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

میں نے جلدی سے آنسو صاف کر لیے۔ "کوئی نہیں"۔ میں نے اپنے لہجے کو مضبوط بناتے ہوئے کہا۔ "مجھے پتا ہے کہ میرے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا لیکن ایک بات سن لو ملک کامے! چوہدری نیاز صرف میری ہی موت کا ذمے دار نہیں ہو گا بلکہ اس نے کئی گھر تباہ کیے ہیں' بالی جو ابھی پورے سپنے بھی نہیں دیکھ پائی تھی' ریشماں جس کا سہارا اس کا اکلوتا بھائی دینو تھا۔ جانو جس کے سپنے کسی نہ کسی نے ضرور دیکھے ہوں گے' مامی جس کا واحد آسرا کاکا ہے اور..... اور کادا جس کی..... جس کی جان....." میں کہتے کہتے جھجک گئی۔

"ہاں بولو۔" وہ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔ بس ان سب کی زندگی تباہ کرنے کا ذمے دار چوہدری نیاز ہے اور اب تم بھی اس جرم میں برابر کے شریک ہو اس لیے کہ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم چاہو تو ان سب کو بچا سکتے ہو۔ لیکن تم ایسا نہیں کرو گے اور اس کے ساتھ جرم میں شریک ہو گے۔ اس نے میرے باپ کو جس طرح مارا۔ میری ماں کی زندگی چھینی' چوہدری فیاض کو قتل کرنے کی کوشش کی' اس کے بیٹے پر تشدد کر کے جائیداد پر قبضہ کیا' یہ تمام جرائم چھوٹے موٹے نہیں ہیں اور پھر یہ تو اس کے وہ کرتوت ہیں جن سے میں واقف ہوں' جانے ایسے ہی کتنے لوگ ہوں گے' جو تباہ کیے گئے۔ برباد کر دیے گئے' چوہدری نیاز کے ایک اشارے پر جن کے گھر بار چھین کر انہیں دربدر کر دیا گیا۔ ایسے جانے کتنے ہوں گے۔"

"جانو' راجا اور دینو' یہ تینوں اپنے گھروں کو لوٹ چکے ہیں۔" اس کے ہونٹوں سے نکلنے والی سرگوشی مجھے لمحہ بھر کو منجمد کر گئی۔

"کک..... کیا..... تمہیں کیسے پتا؟"

"کادا اور اس کا باپ شادو کے گھر موجود ہیں اور..... اور کاکا....."

وہ میری بات پر دھیان دیے بغیر بول رہا تھا اور میں پتھر کی مورت بنی آنکھیں پھاڑے اسے تک رہی تھی۔ وہ لمحہ بھر کو رکا تو جیسے مجھے بجلی کا کرنٹ چھو گیا۔ میں نے بھاگ کر اس کا

گریبان پکڑ لیا۔ "ہاں..... کہاں ہے کاکا۔ کہاں ہے' بولو جواب دو' میرا کاکا کہاں ہے؟"

میں ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی پھر اچانک میں ساکت ہو گئی۔ مجھے خیال آیا کہ یہ ساری معلومات اسے کیسے حاصل ہوئیں۔ یہ کس طرح جان گیا کہ کادا اور بابا شادو کے گھر ہیں۔ راجا' دینو اور جانو اپنے اپنے گھروں کو جا چکے ہیں۔ میں نے حیرت سے اس کے سپاٹ چہرے کو دیکھا۔ اس کے سپاٹ اور پتھریلے چہرے پر صرف دو متحرک آنکھیں ہی جاندار محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ میں اب بھی اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی کہ اچانک باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے بے اختیار اس کا گریبان چھوڑ دیا۔

"سر! آپ کو بلایا ہے۔" باہر کھڑے آدمی نے کہا تو میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ آنے والے نے جس انداز میں مؤدب ہو کر اسے سر کہا تھا اس نے مجھے چونکا دیا تھا۔ اس سے پہلے میں جب اس کی قید میں تھی تو اس کے ساتھی اجڈ اور جاہل قسم کے ہونے کے ساتھ ساتھ پینڈو قسم کے تھے اور اسے ملک کہا کرتے تھے جب کہ اب اس کے چاروں ساتھی بڑے مہذب اور پڑھے لکھے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ پلٹ کر باہر جا چکا تھا۔ اس نے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا کر بند کر دیا تھا۔ میں نے بھاگ کر دروازے کی جھری سے آنکھ لگا دی' مجھے باہر لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی مگر وہ کیا کہہ رہے ہیں' یہ سمجھائی نہیں دے رہا تھا۔ نہ ہی وہ لوگ نظر آ رہے تھے۔ سامنے البتہ ایک جیپ کھڑی تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ جیپ چوہدری نیاز کی ہو۔ میرا تو دم سوکھ گیا۔ میں چکرا کر رہ گئی۔ وہ لمحہ آ چکا تھا جس نے مجھے خوفزدہ کیا ہوا تھا۔ میں بھاگ کر کمرے کے ایک کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ میں نے پورے کمرے میں نگاہ ڈال کر کوئی ایسی چیز تلاش کرنے کی کوشش کی جس سے میں آنے والے پر حملہ کر سکوں مگر وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی۔ منجھی پر خالی پستول بھی شاید ملک کاما اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ بے بسی نے میری آنکھوں میں آنسو بھر دیے اور کچھ اختیار میں نہ رہا تو وہیں زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔

اچانک کنڈی کھلنے کی آواز نے جیسے مجھے اچھال کر کھڑا کر دیا۔ میں آنے والے پر جھپٹنے ہی والی تھی کہ دروازے پر ملک کاما کو دیکھ کر ٹھہر گئی۔ اس کے ہونٹوں پر وہی دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب آ گیا۔ "چوہدری نیاز آ گیا ہے۔" اس

نے کہا تو مجھے لگا جیسے کسی نے میرے گلے میں پھندا ڈال کر کس دیا ہو۔

"تم..... تم کمینے..... ذلیل ہو....." میں اچانک بپھر کر اس کی طرف لپکی مگر اس سے پہلے کہ میں اسے مارتی اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے چوڑے اور مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لیے۔

"میری پوری بات سنو۔" اس نے سخت لہجے میں کہا اور ایک جھٹکے سے میرے دونوں ہاتھ چھوڑ دیے۔ "تمہیں زہر چاہئے تھا ناں! اور مجھے اپنے پیسوں سے مطلب ہے۔ میں بے غیرت ہوں' بے ضمیر ہوں اور تمہیں بیچ کر پانچ لاکھ روپے حاصل کرنا میرا مشن ہے"۔

اس کی چبھتی ہوئی نگاہیں میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ یہ اطلاع دے رہا ہے یا طنز کر رہا ہے۔ میں سر اٹھائے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"یہ زہر ہے"۔ اتنا کہہ کر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کیپسول نکال لیا۔ "اسے پانی کے گھونٹ کے ساتھ نگل لو۔ تمہارے پاس صرف آدھا گھنٹا ہے۔ اس کے بعد چوہدری نیاز تمہیں لے جائے گا۔ یہ کیپسول کھانے کے دس پندرہ منٹ بعد تمہیں غنودگی محسوس ہو گی۔ تم سو جاؤ گی اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ تم کب.....؟"

"بس..... بس کرو۔" میں بے اختیار چیخ پڑی۔ "تم اتنے بڑے درندے ہو۔ اتنے بے حس ہو' کسی کو موت کی نیند سلا دینا تمہارے لیے کتنا معمولی سا کام ہے۔ تم..... تم انسان نہیں ہو۔ تم انسان ہو ہی نہیں سکتے۔ انسان ایسے نہیں ہوتے۔ ایسے نہیں ہوتے۔" نہ معلوم یہ موت کا خوف تھا یا واقعی ملک کاما کا بھیانک روپ دیکھ لینے کی اذیت کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"تم کس قسم کی عورت ہو۔ زندہ رہنے کے لیے کہتا ہوں تو موت کی تمنا کرتی ہو۔ تمہیں دنیا میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس کی خاطر تم زندہ رہو اور تمہاری خواہش پر تمہیں زہر لا کر دیا ہے تو کہتی ہو کہ بے حس ہوں' درندہ ہوں۔ تم تو ابھی یہ فیصلہ ہی نہیں کر سکیں کہ تم خود کیا چاہتی ہو۔ تمہارے اندر کیا ہے؟ پھر تم یہ فیصلہ کیسے کر سکتی ہو کہ میں کون ہوں' غیرت مند یا بے غیرت' حساس ہوں یا بے حس' انسان ہوں یا درندہ؟" وہ بپھر کر بولا۔ "موت سے ڈرتی بھی ہو اور مرنا بھی چاہتی ہو۔ زندگی سے نالاں بھی ہو اور جینا بھی چاہتی ہو"۔

اس کی ان باتوں نے مجھے شدت کے ساتھ یہ احساس دلا دیا کہ ملک کاما اب ویسا نہیں

ہے جیسا پہلے تھا۔ جس طرح کی باتیں وہ کر رہا تھا ایسی باتیں تو کبھی کسی نے نہیں کیں۔ "میں موت سے نہیں ڈرتی"۔ میں نے کہا اور جھپٹ کر کیپسول نگل لیا۔ یہ احساس کہ میں موت کو نگل چکی ہوں۔ اب موت میرے تعاقب میں نہیں' میرے اپنے وجود میں اتر چکی ہے' بڑا اذیت ناک تھا۔ میں کھڑے کھڑے پسینے میں نہا گئی۔ میں نے نگاہ اٹھا کر اس چوڑے چکلے شانوں والے' خوب صورت مگر سپاٹ چہرے کے مالک کو دیکھا۔ اس کے بے جان چہرے پر متحرک دونوں آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ان میں مسکراہٹ بھری تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ چوہدری نیاز سے زیادہ سنگ دل' اس سے زیادہ اذیت پسند اور اس سے کہیں زیادہ ظالم شخص ہے۔

"یہ غالباً تمہاری آخری خواہش تھی جسے میں نے پورا کر دیا ہے۔ اب نہ میں خسارے میں رہا اور نہ تم۔ کوئی اور خواہش ہو تو بتاؤ۔ میں اسے بھی پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔" اس کے الفاظ میری سماعت میں سیسہ انڈیل رہے تھے۔

"کاکے کو..... کاکے کو ڈھونڈ کر اسے مامی تک پہنچا سکو تو یہ بھی تمہارا مجھ پر احسانِ عظیم ہو گا۔" میں نے خشک حلق کو تھوک نگل کر تر کرتے ہوئے کہا۔ "کاکے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی حفاظت کرنا اور..... اور مامی کو بتانا کہ میں اسے ڈھونڈنے کے لیے یہاں آئی تھی۔" میں جلدی جلدی بول رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے موت بڑی تیزی سے میری رگوں میں سرایت کر رہی ہے۔ بدن سن ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور میں اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ میں پھر جلدی سے بولی۔ "سنو ملک کاما! کاکے سے کہنا کہ میں..... میں اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی مگر موت میں اس کی شراکت بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی اس لیے..... اس لیے میں اسے ایک بار پھر تنہا چھوڑ آئی تھی۔ اسے یہ بھی بتانا کہ میں نے اگر کسی سے محبت کی ہے' کسی کے بارے میں سوچا ہے' کسی کو اپنے تصور میں بسایا ہے تو وہ ہے۔ صرف اور صرف وہ' اور بابا سے کہنا زینو مرتے ہوئے بہت افسردہ تھی' صرف اس لیے کہ وہ آپ لوگوں سے ملے بغیر مر رہی تھی۔" میرے بولنے کی رفتار مزید تیز ہو گئی۔ اب پسینا میری کنپٹیوں سے بہہ رہا تھا۔ مجھ سے بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ میرے دونوں پیر سن ہو چکے تھے۔ ایک عجیب سی سنسناہٹ میرے باقی بدن میں تیرتی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

"سنو! یہ پانی پیو۔" اس نے پانی سے بھرا کٹورہ مجھے دے دیا۔

میں نے جھپٹ کر کٹورہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور ایک ہی گھونٹ میں سارا پانی پی گئی۔

"کاکا خیریت سے ہے۔ کیا تم اس ملنا چاہتی ہو؟" مجھے لگا جیسے وہ نہ بولا ہو بلکہ میرے کان بجے ہوں۔ میں مرنے والی تھی ناں اس لئے ایسی باتیں سوچ رہی ہوں۔

"کک..... کیا تم نے کچھ کہا ہے کیا؟" میں نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ وہ حسبِ معمول مسکرا دیا۔

"ہاں اور میری بات سنو! ابھی تم نہیں مرو گی۔ ابھی تو بہت دیر ہے۔ اتنا وقت ہے کہ میں تمہاری بہت سی خواہشات پوری کر سکتا ہوں۔"

آں..... ہاں..... کیا؟"

"تم ابھی نہیں مرو گی۔ تم صرف ایسا محسوس کر رہی ہو۔ تم اس وقت تک نہیں مرو گی جب تک کاکے سے نہیں مل لو گی اور جب تک کادا تم سے جینے کا وعدہ نہیں لے لے گا۔"

وہ پتا نہیں کیا کہہ رہا تھا۔ شاید وہ کچھ اور کہہ رہا تھا اور میں کچھ اور سن رہی تھی۔ اب مجھ سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میری زبان موٹی ہو کر خشک ہو گئی تھی۔ اسی لمحے وہ مسکراتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں اپنے اندر اور اپنے باہر بے پناہ سکون اور گہرا سناٹا محسوس کر رہی تھی۔ ایک ایسا سکون جس کے لیے میں زندگی بھر ترستی رہی تھی۔ میرے اندر کے تمام طوفانوں میں اٹھنے والے بھنور تھم چکے تھے۔ کوئی آواز' کوئی آہٹ کوئی حرکت نہیں تھی' کوئی ایسی سوچ بھی نہ تھی جو اس سکون میں کسی قسم کا تلاطم پیدا کر سکے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں ٹھنڈے' فرحت بخش ہواؤں سے گھرے کسی خوب صورت خطے میں ہوں پھر اچانک میرا سامنے کاکا آ گیا۔ معصوم سے چہرے والا کاکا۔ جس کی ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں مگر انتقام کے شعلوں کی تپش نے اسے تمتما کر رکھ دیا تھا۔ میں بستر پر لیٹ گئی۔ میں جانتی تھی کہ جب موت انسان کے قریب آتی ہے' تو اسے سب کچھ بڑی تیزی سے یاد آتا ہے۔ بہت سے چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ لوگ مجسم ہو کر سامنے آ جاتے ہیں جن کا پیار مرنے والے کی نسوں میں لہر کی طرح بہہ رہا ہوتا ہے۔ شاید اس لیے کاکا مجسم ہو کر میرے سامنے آ گیا تھا۔

"زینو آپاں! میں ٹھیک ہوں زینوں آپاں۔" اس نے قریب آ کر میرا ہاتھ تھام لیا مگر میرا

ہاتھ اس کا لمس محسوس کرنے سے قاصر تھا۔ البتہ میں دیکھ سکتی تھی کہ میرا ہاتھ اس کے نرم نرم ہاتھوں کے درمیان دھرا ہے۔ "اماں وغیرہ سب آنے والے ہیں آپاں۔ تم بالکل فکر نہ کرو' خدا چوہدری نیاز سے انتقام لے کر رہے گا۔ اسے تو جانے کتنوں کی آہیں لگی ہوں گی آپاں۔ تم اسے نہیں مار سکیں۔ میں بھی کچھ نہیں کر سکا مگر رب تو سب کچھ کر سکتا ہے ناں!" وہ بڑے پیار سے کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی جیسے اس کی بہت بڑی خواہش پوری ہونے والی ہو۔

میں نے اسے کہنا چاہا کہ میں مر رہی ہو۔ اپنے گھر میں دیا جلانے کی خواہش بھی اپنے ساتھ لیے جا رہی ہوں مگر وہ میری اس قسم کو ضرور پورا کرے جو میں نے اماں کا سرد اور بے جان ہاتھ تھام کر کھائی تھی۔ میں اس سے اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر مجھ سے بولا نہ گیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ کاکا کب ہے۔ یہ تو میرا احساس ہے جو اسے یوں میرے سامنے لے آیا ہے۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ گرم گرم پانی کے قطروں کو میں نے اپنی آنکھوں کے کونوں سے نکل کر کنپٹیوں کی طرف بہتے محسوس کیا۔ میرا جی چاہا کہ کاش یہ سب حقیقت ہوتا' کاکا میرا پاس آتا' میرا ہاتھ تھام کر یوں ہی کہتا کہ آپاں زینو میں ٹھیک ہوں مگر اب تو وہی حقیقت تھا جو میں جانتی تھی۔ میرا جی نہ چاہا کہ میں آنکھیں کھول کر اپنے اس حسین سپنے کو توڑ دوں۔ کاکا میرے پاس بیٹھا ہوا کچھ کہہ رہا تھا۔ مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ یہ نہیں پتا چل رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے لیکن یہ معلوم تھا کہ میرا تصور بڑا طاقت ور ہے۔ کاکا اب بھی میرے پاس بیٹھا ہے اور مجھ سے باتیں کر رہا ہے۔ پھر میں نے کئی دوسری آوازیں سنیں۔ مجھے لگا جیسے بابا مجھے آوازیں دے رہا ہے۔ میرے بالوں پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔ مامی میری پیشانی کو چوم رہی ہے۔ خالہ فاطمہ میرے پاس بیٹھی تلوؤں کو سہلا رہی ہے۔ کادا مجھ سے آنکھیں کھولنے کو کہہ رہا ہے۔ اس کی آواز دور کہیں بجتی پائل کی چھنکار کی طرح میرے پورے وجود میں گونج رہی ہے' میں رونے لگی۔ ہاں میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی مگر میں آنکھیں کھول کر محبتوں کی اس پھوار کو روکنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ آنکھیں کھولوں تو چوہدری نیاز سے بھی ظالم اور سنگ دل شخص کے بے جان چہرے پر متحرک آنکھوں میں ناچتی خبیث مسکراہٹ مجھ سے ساری محبتیں چھین لے۔ مجھے موت کے گہرے کنویں میں لٹکا کر دھیرے دھیرے زندگی کی ڈور کو کھینچ کر مجھے فنا کر دے۔ مجھے ایک ایسی اندھی وادی میں اتار دے

جہاں نہ کادا ہو' نہ فاطمہ' نہ مامی' تو نہ کاکے کی معصوم محبت ہو نہ میرا ہواؤں میں ڈولتا وجود۔ بس خاموش' بے جان اور غیر متحرک خلا ہو' جہاں میں بھی میں' میں بھی نہ رہوں خلا کا حصہ بن جاؤں۔

"زینو! کل سورج کی کرنیں ہمارے لیے زندگی کا پیغام لے کر آئیں گی۔ کل کا سویرا تیری آنکھوں سے طلوع ہو گا زینو۔ پھر روز ہونے والی صبح تیری آنکھوں سے جنم لے گی اور سورج میری آنکھوں میں غروب ہو گا۔ پھر سب کچھ ہمارا ہو گا زینو۔ زرد پتوں کا یہ بھنور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گا۔ یہاں گندم کی وہ سنہری بالیاں لہلہائیں گی زینو جو زندگی کا ثبوت ہوتی ہیں۔ آنکھیں کھول دے زینو۔ میری طرف دیکھ۔ میرے چہرے کو دیکھ جو دھوپ میں تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تپ گیا ہے۔ جھلس گیا ہے..... دیکھ یہ میرے پاؤں دیکھ' یہ سارے آبلے میں نے خود پھوڑے ہیں تاکہ اب تیرے ساتھ سفر کر سکوں۔ میں نے اپنے گھر میں رنگین جھنڈیاں سجا دی ہیں زینو۔ بالی مہندی گھولے تیرا انتظار کر رہی ہے۔ شادو نے تیرے لیے آنچل میں ہزاروں تارے جوڑ دیے ہیں۔ دیکھ زینو! دیکھ ..... دیکھ زینو....."

یہ کادے کی سرگوشیاں تھیں جو مجھے بہت قریب سے آتی محسوس ہو رہی تھیں اور جیسے گہرے سمندروں میں ڈوبتی جا رہی تھیں مگر کادے کی یہ سرگوشیاں مجھے بار بار تھام لیتی تھیں۔ وہ مجھے زندگی کی طرف بلا رہا تھا اور ملک کاما کی دی ہوئی موت مجھے اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔

"انہیں چھوڑ دیں پلیز! یہ جب تک گہری نیند نہیں لیں گی' نارمل نہیں ہوں گی۔"

ڈوبتی ابھرتی سی ایک آواز نے دوسری آوازوں کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

"مگر..... مگر..... یہ..... اسے کیا ہو رہا ہے؟" بابا کی گھبرائی سی آواز نے جیسے مجھے گہرے سمندر سے ایک دم نکال لیا۔ اس کی آواز کی بے چینی میرے اندر بل سے ڈالنے لگی۔ میرا جی چاہا کہ میں اٹھ کر بیٹھ جاؤں مگر میرا جسم بے جان ہو چکا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے ساری آوازیں معدوم ہو گئیں۔ سارے تصورات ساکت ہو گئے۔ میرا آخری احساس یہ تھا کہ میں گہرے اندھیرے غار میں داخل ہو رہی ہوں۔

☆==========☆==========☆

پھر جانے کیا ہوا۔ یوں لگا تھا جیسے میں کھلے سمندروں پر تیر رہی ہوں۔ میرے چاروں جانب پھیلا سکوت ایک نہ سمجھ میں آنے والے شور سے ٹوٹ گیا۔ میں نے آنکھیں کھول دی تھیں مگر مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ چاروں طرف گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مجھے خود میں زندگی محسوس ہوئی تو میں حیران رہ گئی۔ میں نے اپنے آپ کو حرکت دینا چاہی تو کامیاب ہو گئی اور دوسرے ہی لمحے مجھے یوں لگا جیسے میں کسی چارپائی پر لیٹی ہوں۔ حواس ٹھکانے آئے تو دور سے آتی آوازوں نے مجھے اپنے زندہ ہونے کا شدت سے احساس دلایا۔ میں نے بے اختیار منہ کھولا اور چیخ اٹھی۔ "کادے....." اور میری آواز میری اپنی سماعتوں میں زندگی کی بازگشت بن کر گونج اٹھی۔

بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازوں نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ باہر روشنی تھی۔ دروازے سے باہر تیز روشنی تھی اور پھر میں نے دیکھ لیا کہ میں جس کمرے میں ہوں وہاں اندھیرا ہے اور باہر روشنی۔ دوسرے ہی لمحے کوئی لالٹین لیے کمرے میں داخل ہوا اور اس کے پیچھے بہت سے لوگ اندر آ گئے۔

"زینو..... زینو..... کیا ہوا؟ ٹھیک تو ہے تُو!" یہ کادا تھا۔ ہاں یہ واقعی کادا تھا۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا پھر اس کی اوٹ میں مجھے بابا کا مسکراتا چہرہ نظر آیا۔ آج اس کے چہرے کی جھریوں پر پژمردگی کی بجائے رونق تھی۔ پھر مجھے چاروں طرف سے میرے سارے اپنوں نے گھیر لیا۔ کاکا' مامی' خالہ فاطمہ مامی کی ماں اور فاطمہ' شادو۔ ان سب کو اپنے قریب دیکھ کر مجھے یقین نہیں آیا۔ میں نے سب کو چھو کر دیکھا۔ ان کی ہنسی کو محسوس کیا۔ لمحہ بھر کو خیال آیا کہ شاید یہ بھی میرے احساس کا دھوکا ہے۔ میں تو مر چکی ہوں۔

"کادے..... مامی..... میں..... میں۔"

"ہاں زینو! سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔" یہ بابا تھا جس نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے شفیق سینے سے لگا لیا۔ "آ..... آ تجھے دکھاؤں کہ تُو کہاں ہے؟ اٹھ پتر! اٹھ باہر خوشی تیرا انتظار کر رہی ہے۔ چل آ ناں..... اٹھ جا پتر۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ رہا تھا۔ میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے چارپائی سے اٹھ گئی تو پہلی بار یقین آیا کہ میں زندہ ہوں۔ یہ احساس ہوتے ہی میں بے اختیار رو دی۔

"نہ نہ پتر..... اب نہیں رونا ہے۔ اب نہیں رونا زینو..... اب ان آنکھوں میں

آنسو نہیں دیوے جلیں گے۔ ارے چل ناں' اب اگر روئی تو اتا ماروں گا کہ یاد کرے گی۔ چل باہر۔" پیار سے بات کرتے کرتے بابا نے سینہ پھلا کر مصنوعی غصے سے کہا۔ سارے لوگ ہنس پڑے۔ میں نے سنا ہنسی کی ان آوازوں میں سب سے اونچی آواز میری اور کادے کی تھی۔

باہر زندگی بدلی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر تو میں پاگلوں کی طرح چاروں طرف بھاگنے لگی کہ یہ در و دیوار میرے اپنے تھے۔ میرے بابا کے کھردرے ہاتھوں سے اٹھائی ہوئی اور اماں کی نرم ہتھیلیوں سے لیپی ہوئی چکنی مٹی کی دیواریں۔ وہ چولہا جو بابا کی میت کے روز ٹھنڈا ہو گیا تھا' اس میں بھلبھلا کر آگ جل رہی تھی۔ وہ منجھی جس پر بابا کی میت رکھی گئی تھی۔ پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ گھر کے ہر کونے میں دیے روشن تھے۔ ہر کھونٹی پر لالٹین ٹنگی ہوئی تھی۔ اس دیوار سے اس دیوار تک بندھی ڈوریوں میں رنگین جھنڈیاں لٹک رہی تھیں۔ مامی' خالہ فاطمہ' کاکا' بالی' راجا' شادو اور محلے کی عورتیں جمع تھیں اور مجھے حیرت و خوشی سے دیکھ رہی تھیں۔

"زینو! تُو نے کسم کھائی تھی ناں کہ ایک روز اس گھر میں دیے روشن کرے گی؟ دیکھ..... دیکھ زینو اس گھر کے اجالے نے تیرا استقبال کیا ہے۔" کادے کی آنکھوں میں بلا کی جھلملاہٹ تھی جیسے یہ سارے دیوے اسی کی کالی کالی' بڑی بڑی آنکھوں میں روشن ہوں۔

میں بیچ آنگن میں' کھلے آسمان تلے کھڑی ہو کر چیخ چیخ کر رونے لگی۔ سارے گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ لوگ گھبرا کر میری طرف بھاگ پڑے۔

"کک..... کیا ہوا زینو..... کیا ہوا؟" کئی آوازیں آئیں۔

"ہٹ جاؤ..... ہٹ جاؤ۔" میں پوری قوت سے چیخ اٹھی۔ "رونے دو مجھے۔ اس گھر میں' میں رونا چاہتی تھی تو اس چوہدری نے مجھے رونے نہیں دیا تھا۔ بلا کر لاؤ اس چوہدری کو..... بلا کر لاؤ"۔ میں چیخ کر کادے کی طرف دوڑی۔ "بلاؤ اسے' کادے' میں اس کے سامنے بابا کی موت پر یہاں چیخ چیخ رونا چاہتی ہوں۔ اسے دکھاؤ کہ جس گھر کو تُو نے برباد کر دیا تھا۔ جہاں اندھیرے بکھیر دیے تھے وہاں آج چراغ روشن ہیں۔ ارے کوئی اسے بلا لاؤ۔" میں روتے روتے بیچ آنگن میں بیٹھ گئی۔ پورے گھر میں میرے رونے کی آواز گونج رہی تھی۔ سب پر سناٹا سا طاری تھا۔ میں رو رو کر بابا کو پکار رہی تھی۔ اماں کو بتا رہی تھی کہ اماں دیکھ آج

تیری زینو اپنے گھر میں بیٹھی تم لوگوں کا ماتم کر رہی ہے اور کوئی چوہدری اسے روکنے والا نہیں ہے۔ کہاں ہے وہ سونیا جس نے میری آوازوں کو میرے حلق میں گھونٹ دیا تھا۔ آج مجھے ان لوگوں کا کوئی خوف نہیں تھا۔ میں تو خوف کی اس کیفیت سے بھی گزر آئی تھی جہاں کے بعد موت کا سناٹا شروع ہوتا ہے۔ میں چاہتی تھی کہ چوہدری نیاز میری آواز سن لے۔ سونیا میرے سامنے آ جائے تو میں اس کا گلا دبا دوں۔ چوہدری نیاز کے چہرے سے اس کی بڑی بڑی مونچھیں نوچ لوں مگر میرے گرد کھڑے سبھی لوگ میرے تھے اور دروازہ بند تھا۔ گلی میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ گھر کے اندر بھی سکوت طاری تھا۔ یوں جیسے سب کو سکتہ ہو گیا ہو۔

اچانک باہر گاڑی کے انجن کا شور ہوا۔ میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ "چوہدری آ گیا۔ آ گیا وہ حرامزادہ۔ آج اسے دکھاؤں گی کہ بربادی کیا ہوتی ہے' جسم پر لگنے والے گھاؤ سے بہتا لہو کتنی تکلیف دیتا ہے"۔ میں یہ کہتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔

"زینو..... پاگل ہو گئی ہے توں!" کادے نے لپک کر مجھے پکڑ لیا۔

"ہاں..... میں پاگل ہو گئی ہوں۔ ہٹ جا کادے! ہٹ جا۔" میں نے اسے جھٹکے سے پیچھے دھکیل دیا۔ اسی وقت دروازے پر جیپ رکنے کی آواز کے ساتھ ہی بھاری قدموں کی آواز آئی۔ میں نے دروازے کی کنڈی گرا دی۔ میرے سامنے ملک کاما کھڑا تھا۔ بے جان چہرے پر دو متحرک' جاندار آنکھوں والا ملک کاما' جس کی آنکھوں میں اور ہونٹوں پر وہی پُراسرار سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھٹ کر رہ گئیں۔ وہ فوجی وردی میں تھا۔ اس کے پیچھے وہ چاروں بھی تھے جنہوں نے مجھے پکڑا تھا وہ سب فوجی وردیوں میں تھے۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری یہ والی آخری خواہش پوری نہیں کر سکوں گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا پھر دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے کے عضلات کھنچ گئے۔ جبڑے بھنچ گئے۔ وہ بولا تو اس کی آواز بہت بھاری ہو رہی تھی..... "چوہدری نیاز..... مارا گیا۔"

"کک..... کیا؟" میں بے اختیار بول اٹھی۔ "مارا گیا..... مگر کیسے..... کس نے مارا اسے؟ کس نے مارا؟ نہیں..... اسے میں ماروں گی۔ میں اپنے ہاتھوں سے اس کے جسم پر زخم لگاؤں گی ملک..... اسے کس نے مارا..... کس نے؟" میں چیخ رہی تھی۔ بے قابو ہو گئی تھی باہر کی طرف بھاگ پڑی تھی مگر کادے نے مجھے پکڑ لیا اس کے پیچھے

ہی بابا بھی دوڑ پڑا تھا۔

"نہ پتر! انتقام کا جذبہ آگ ہوتا ہے۔ یہ انتقام لینے والے کو بھی جھلسا دیتا ہے۔ اللہ پر چھوڑ دینے والا سکھی رہتا ہے اور پھر..... ظالم کے جسم پر..... اور روح پر جیسا زخم رب لگاتا ہے وہ بھلا بندے کے بس میں کہاں؟" بابا نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھر کر کہا۔

میں کتنا روئی یہ بھی مجھے یاد نہیں۔ صرف اتنا یاد ہے کہ سارے آنسو خشک ہو گئے تھے۔

اسی شام بابا نے بتایا کہ ملک کاما اصل میں ملک کاما نہیں بلکہ میجر سکندر ہے۔ جس روز ملک کاما کے آدمیوں نے چوہدری نیاز سے میرا سودا پکا کیا تھا اسی روز ملک کاما اور اس کا بھائی بالا پکڑا گیا ملک کاما کی جسامت بالکل میجر سکندر جتنی تھی۔ چوہدری نیاز نے ملک کاما کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ میری جان خطرے میں تھی اس لیے میجر سکندر ملک کاما کا روپ بھر کر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ یہاں آ گیا پھر اس نے مجھے اغوا کر لیا۔ ارادہ تھا کہ مجھے اس کے حوالے کرنے کے بعد اسے رنگے ہاتھوں گرفتار کر لے مگر میں وہاں سے فرار ہو گئی۔ اس سے قبل ہی اس گاؤں کے نئے تھانیدار نے چوہدری نیاز کے مظالم کی ساری رپورٹ بنا کر کراچی ہیڈ کوارٹر بھیج دی تھی۔ وہاں سے ہی میجر سکندر کو اس کے پیچھے لگایا گیا تھا۔ جو ظلم اس نے مجھ پر کیے وہ تو کچھ بھی نہ تھے۔ میں تو اپنے دکھ کو بڑا دکھی سمجھتی تھی پر اس کی حویلی کے نیچے تہہ خانے سے جانے کتنی عورتیں، کتنے بچے اور کتنے جوان برآمد کیے گئے تھے جن سے وہ بیگار لیتا تھا اور جنہیں اس نے نافرمانی کی سزا کے طور پر اپنی نجی جیل میں قید کر رکھا تھا۔ وہ انہیں سزا دینے پر بھی قادر تھا۔ اس نے تین نوجوانوں اور پانچ عورتوں کو سزائے موت دی تھی۔ وہ منشیات کے علاوہ بچے اور عورتیں بھی سمگل کرتا تھا۔ چوہدری فیاض کو سب سے پہلے اس کی نجی جیل کے بارے میں پتا چلا تھا جس کی وجہ سے وہ اسے مروانا چاہتا تھا ورنہ روپے پیسے کی اس کے پاس بھلا کیا کمی تھی کہ وہ جائیداد کے لیے اسے قتل کراتا، یہ باتیں تو وہ اپنے ان ساتھیوں کے سامنے کیا کرتا تھا جو اس کی اصلیت سے ناواقف تھے اور اسے صرف اور صرف چوہدری نیاز کی حیثیت سے جانتے تھے۔ میجر سکندر ملک کاما نامی ایک غنڈے کی حیثیت سے متعارف ہوا تھا اور چوہدری نیاز نے اسی سے میرا سودا کیا تھا۔ جس وقت میں ملک کاما کی قید سے ٹرک میں بیٹھ کر فرار ہوئی تھی، ملک کاما مجھے ٹرک میں سوار ہوتے دیکھ چکا تھا مگر چوہدری نیاز کے ایک آدمی کی موجودگی کی وجہ سے اس نے ظاہر نہ کیا کہ وہ دیکھ چکا ہے۔ چوہدری نیاز آنے والا تھا۔

اگر میں وہاں سے فرار نہ ہوئی ہوتی تو وہ کوئی اور بہانہ بنا کر مجھے اس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیتا یا مجھے اس کے حوالے کرنے کے بعد رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیتا۔ کاکا گاؤں پہنچا اور اس نے حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کی تو ملک کاما یعنی میجر سکندر کے ان آدمیوں نے جو حویلی کی نگرانی کر رہے تھے اسے پکڑ کر میجر سکندر کے حوالے کر دیا تھا اور جب میں حویلی میں داخل ہوئی تو اس وقت بھی میجر سکندر میری وہاں موجودگی سے واقف تھا۔ اسی وجہ سے اس نے مجھے قید کر دیا تاکہ میں بنا بنایا کام بگاڑ نہ دوں۔ اس رات چلنے والی گولیوں سے چوہدری فیاض نہیں مرا تھا۔ نہ عبدالقادر مارا گیا تھا بلکہ یہ گولیاں فوج نے چلائی تھیں اور گولیاں چلانے سے پہلے ہی وہ، عبدالقادر اور دوسرے آدمی کو جو عبدالقادر کو مارنے کے لیے بٹھایا گیا تھا، گرفتار کر چکے تھے۔ ان گولیوں کی آوازوں کا مقصد صرف اتنا تھا کہ چوہدری نیاز یقین کر لے کہ اس کا کام ہو گیا۔ اس رات فوجیوں نے میجر سکندر کی قیادت میں اس حویلی کو گھیرے میں لے کر چھاپہ مارنا تھا۔ میری جذباتیت اور بیوقوفی کے پیشِ نظر میجر سکندر نے مجھے نیند کی دوا کھلا دی تاکہ وہ اپنے فرائض سکون سے انجام دے سکے۔ کاکے کو مامی کے گھر چھوڑنے آنے والے ایک فوجی نے بابا کو ساری تفصیل بتا دی تھی اور میجر سکندر کا پیغام پہنچایا تھا کہ وہ سب لوگ گاؤں پہنچ جائیں کہ آج گاؤں چوہدری نیاز کے مہیب آسیب سے پاک ہو رہا ہے۔ اسی لیے وہ سب وہاں پہنچ چکے تھے اور جب وہ لوگ میجر سکندر کے پاس پہنچے تو میں گہری غنودگی میں جا چکی تھی۔ پھر وہ سارا دن ہم سب وہیں رہے۔ اگلی رات کا اندھیرا چوہدری نیاز کی زندگی کا اندھیرا ثابت ہوا۔ وہ مقابلے میں مارا گیا۔ سونیا بڑی زمینداری کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لی گئی اور بچوں کو چوہدری فیاض اپنے ساتھ لے گئے۔

یہ ساری کہانی سن کر میں سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھی رہ گئی تھی۔ چوہدری نیاز کا یہ گھناؤنا روپ میرے لیے انکشاف تھا اور میری اسے زخم لگانے اور اپنے گھر میں روشنی کر کے دکھانے کی حسرت میرے دل میں کانٹے کی طرح چبھی رہ گئی۔

"بھاجی..... اب تو اسے کھونٹے سے باندھ دو۔" اچانک شادو کی کھنکھناتی ہوئی آواز نے میرے ساکت وجود میں ہلچل سی مچا دی۔

"دیکھا..... دیکھا بابا..... اس نے پھر مجھے کھونٹا کہا۔" کاکا انتھنے پھلاتے ہوئے غرایا۔

"ارے تو کیا کہے؟" بابا شریر لہجے میں بولا۔ "پتر! کھونٹے کو کھونٹا ہی تو کہتے ہیں اور ہر کھونٹے سے کسی نہ کسی کو تو باندھنا ہی پڑتا ہے ناں!"

میں نے پل بھر کو نگاہ اٹھا کر کادے کی طرف دیکھا۔ سویرا اس کی آنکھوں سے طلوع ہو رہا تھا۔

==========

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام